اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اپریل ۲۰۱۶ء تا جون ۲۰۱۶ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

اپریل ۲۰۱۶ء تا جون ۲۰۱۶ء

مدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

قافیہ بندی

حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کی کنیت ''ابوعمیر'' تھی، ابوعمیر نے ایک چھوٹا سا پرندہ پالا ہوا تھا، بالکل چڑیا جیسا، عربی میں اسے نُغَیر کہتے ہیں، وہ مرگیا، ابوعمیر اس کے مرنے پر غمگین بیٹھے تھے، آپ ﷺ نے اُن کو چھیڑنے کے لیے فرمایا:

''اے ابوعمیر! کہاں ہے نُغَیر''

(۸۷۷۵: صحیح البخاری، الأدب، الانبساط الی الناس، الرقم)
(۵۰۰۰: ابوداود، الأدب، ماجاء فی المزاح، الرقم)

حلقہ ارباب مزاح

مزاح نگار ڈائریکٹری

مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہے حلقہ ارباب مزاح کی خواہش ہے پوری دنیا میں بسنے والے ہر اس مزاح نگار کا تعارف اس میں شامل ہو جس کے قلم نے کسی بھی ذی روح کے ہونٹوں پر مسکان دی ہو

زیادہ سے زیادہ آٹھ سو الفاظ پر مشتمل اپنا تفصیلی تعارف ان پیج فارمیٹ میں اپنی خوبصورت ترین تصویر (شادی والے دن کے علاوہ) حلقہ ارباب مزاح کو ای میل ایڈریس halqa.mezah@gmail.com پر ای میل کر دیں۔ آپ کا تعارف درج ذیل نکات کا احاطہ کرتا ہو۔

☆ پیدائش کا علاقہ (شہر اور ملک)، گردش دوراں نے کون کون سے علاقے دکھائے اور موجودہ سکونت کس شہر (ملک) میں ہے۔
☆ اسکول، کالج یونیورسٹی کے نام اور تعلیمی دور کا کوئی یادگار واقعہ
☆ لکھنے کا آغاز کتنی عمر اور کہاں اور کس ادیب سے متاثر ہو کر کیا، پہلی تحریر کہاں چھپی۔
☆ جرائد، اخبارات اور ویب سائٹس کے نام۔
☆ کسی ادبی شخصیت سے دوستی یا ملاقات کا کوئی واقعہ
☆ شائع شدہ کتابوں کے نام پبلشرز کی تفصیل کے ساتھ (اگر شائع ہوئی ہوں)۔
☆ مستقبل میں آنے والی کتابوں کے نام۔
☆ کسی ریڈیو یا ٹی وی کے پروگرام میں شرکت کی ہو تو چینل اور پروگرام کا نام۔
☆ حکومت یا کسی ادارے سے کوئی ایوارڈ حاصل کیا ہو تو اس کی تفصیل۔
☆ رہائش کا پتہ (آپشنل) ای میل ایڈریس (ضروری)، موبائل فون (آپشنل)
☆ فیس بک آئی ڈی (ضروری)، ٹویٹر آئی ڈی (اگر ہے تو)، سکائپ (اگر ہے تو)
☆ چند تحریروں کے ویب سائٹ لنک یا اپنی تحریر کے چند سیکن نمونے ضرور ای میل کریں۔

اگر فیس بک کے دوست اپنے قرب وجوار میں رہنے والے کسی مزاح گو شاعر، مزاح نگار یا کارٹونسٹ سے واقف ہوں تو ان کا تعارف حلقہ ارباب مزاح تک پہنچائیں تا کہ ان کا تعارف "مزاح نگار ڈائریکٹری" کی زینت بن سکے۔

مزاح نگاروں کا ایک با اعتماد، نمائندہ حلقہ

کیا کیا کہاں

تازہ گنڈیریاں

مزاحیے

ہزلیات

کتابی چہرے

سہ ماہی کی کتاب

لمرکے

نظمالوجی

شر گوشیاں

مغربی تہذیب کے لنڈا بازار میں جو بھی مال دستیاب ہوتا ہے اُسے ہمارے معاشرے کا مچھندر طبقہ یوں لپک لیتا ہے جیسے تبرک ہو اور پھر زندگی بھر کے لئے کس کر پلو سے باندھ لیتا ہے۔ اسی مال میں ایک آئٹم ''اپریل فول'' بھی ہے۔ یار لوگ اس احمقانہ رسم کو اس قدر خضوع و خشوع سے مناتے ہیں کہ جیسے یہ بھی کوئی اُن کے مذہب کا حصہ ہو۔

''اپریل فول'' دراصل ہے کیا، اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے۔ زیادہ تر لوگ بھیڑ چال کے قائل ہیں۔ شنید ہے کہ سولہویں صدی کے آخر تک یعنی ۱۵۶۴ء تک نیا سال مارچ کے آخر میں شروع ہوتا تھا۔ حسبِ روایت نئے سال کی آمد کا استقبال لوگ تحائف کا تبادلہ کر کے کرتے تھے اور یوں پھولے نہیں سماتے تھے۔ فرانس کے بادشاہ نے جب کیلنڈر کی تبدیلی کا حکم دیا کہ نیا سال مارچ کی بجائے جنوری سے شروع ہوا کرے تو موزوں ذرائع ابلاغ کی عدم دستیابی کے باعث بہت سے لوگ اس تبدیلی سے لاعلم رہے اور بدستور یکم اپریل کو ہی نئے سال کی تقاریب مناتے رہے اور باہم تحائف کا تبادلہ بھی جاری رہا۔ جن لوگوں کو نئے سال کی تبدیلی کے بارے میں پتہ تھا اُنہوں نے اس بنیاد پر اُن لاعلموں کا مذاق اڑایا اور اُنہیں ''اپریل فول'' کے طنزیہ نام سے پکارنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہ روایت بن گیا اور اب دنیا بھر میں یہ دن باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔

اپریل فول کے حوالے سے تاریخِ عالم میں مسلمانوں کی بابت ایک نہایت دردناک واقعہ بھی موجود ہے۔ روایت ہے کہ جب عیسائی افواج نے اسپین کو فتح کیا تو مسلمانوں کا اس قدر خون بہایا گیا کہ بظاہر اسپین میں کوئی مسلمان نظر نہیں آ رہا تھا مگر اب بھی عیسائیوں کو یقین تھا کہ سارے مسلمان قتل نہیں ہوئے کچھ چھپ کر اور اپنی شناخت چھپا کر زندہ ہیں۔ مسلمانوں کو منظرِ عام پر لانے کا منصوبہ بنایا گیا اور پورے ملک میں اعلان کیا گیا کہ یکم اپریل کو تمام مسلمان غرناطہ میں اکٹھے ہو جائیں تاکہ انہیں اُن کے مطلوبہ ممالک بھیج دیا جائے۔ چونکہ ملک میں امن قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کو خود ظاہر ہونے میں کوئی خوف محسوس نہ ہوا۔ مارچ کے پورے مہینے اعلانات ہوتے رہے، الحمراء کے نزدیک بڑے بڑے میدانوں میں خیمے نصب کر دیے گئے جہاز آ کر بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے رہے، مسلمانوں کو ہر طریقے سے یقین دلایا گیا کہ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ جب مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ اب ہمارے ساتھ کچھ نہیں ہوگا تو وہ سب غرناطہ میں اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ اسی طرح حکومت نے تمام مسلمانوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیا اور اُن کی بڑی خاطر مدارت کی۔ یہ کوئی پانچ سو برس پہلے یکم اپریل کا دن تھا جب تمام مسلمانوں کو بحری جہاز میں بٹھایا گیا اور پھر جہاز روانہ ہوا۔ جب جہاز سمندر کے عین وسط میں پہنچا تو منصوبہ بندی کے تحت عیسائی جہاز رانوں نے جہاز میں بارود سے سوراخ کیا اور اُسے گہرے پانی میں ڈبو دیا گیا۔ تمام مسلمان سمندر میں ڈوب گئے۔ اس کے بعد اسپین میں خوب جشن منایا گیا کہ ہم نے کس طرح اپنے دشمنوں کو بیوقوف بنایا۔ پھر یہ دن اسپین کی سرحدوں سے نکل کر پورے یورپ میں فتح کا عظیم دن بن گیا اور اسے انگریزی میں First April Fool کا نام دیدیا گیا یعنی یکم اپریل کے بیوقوف۔ آج بھی عیسائی دنیا میں اس دن کی یاد بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے اور لوگوں کو جھوٹ بول کر بیوقوف بنایا جاتا ہے۔

اگر مندرجہ بالا واقعہ دُرست نہ بھی ہو تب بھی ''اپریل فول'' منانے کا کوئی جواز نہیں۔ اپریل فول کی بنیاد تکلیف دہ عملی مذاق، دھوکہ دہی اور جھوٹ پر رکھی گئی ہے اور کوئی بھی مذہب خصوصاً اسلام ایسی قبیح افعال کی حمایت نہیں کرتا چہ جائیکہ اسے باقاعدہ فیسٹیول کا درجہ دیا جائے اور ہر برس منایا جائے۔

کاش ہمارے اہلِ قلم اور دانشور حضرات اپنے علم و دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے اس باب میں لوگوں میں آگاہی پیدا کریں اور اُنہیں اعلیٰ اخلاقیات کی جانب راغب کریں تاکہ ہمارے معاشرے سے اس قسم کی بیہودہ اور فضول رسم ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔

مخلص

نوید ظفر کیانی

پرانے چاول

شوکت تھانوی

رہئے اب ایسی جگہ چل کر ---

(خالد باہر سے آواز دیتا ہے)

خالد: "ارے بھئی میں آجاؤں؟؟ کوئی ہے تو نہیں۔"

ناہید: " ایک منٹ ٹھہر نا ذرا ۔۔۔۔ آجاؤ وہ نکل گئیں اُدھر۔۔۔"

خالد: "(آتے ہوئے) کون تھا؟"

ناہید: "طاہرہ بہن تھیں۔"

خالد: " ناہید مجھے تم سے آج ایک خاص مشورہ لینا ہے، کاش تم ہی کچھ سمجھا دو۔ میری تو عقل کام نہیں کر رہی۔"

ناہید: "بات کیا ہے آخر۔"

خالد: "پوچھنا یہ تھا کہ موت تو بہر حال برحق ہے مگر خودکشی کرنا اچھا رہے گا یا خون کر کے پھانسی پانا۔"

ناہید: اوئی! یہ آخر کیا کہہ رہے ہو تم۔ آئے وہاں سے ایک نیا چونچلا لے کر۔"

خالد: "چونچلے کی بات نہیں ہے میں اب یہ طے کر چکا ہوں کہ اگر تم نے خودکشی سے روکا تو ایک آدھ کی جان لے کر پھانسی چڑھ جاؤں گا مگر اب ان پڑوسیوں کے یہ مظالم مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے۔ میں لکھنے پڑھنے والا آدمی۔ مجھ کو ضرورت ہے تنہائی اور یکسوئی کی اور یہاں یہ عالم ہے کہ باہر نکلو تو کم بخت عزیز مرزا جان کا گاہک بنا تاک لگائے بیٹھا رہتا ہے۔ گویا میں اس کے والدِ محترم کا خانہ زاد ہی ہوں کہ ان سے بے سروپا سیاسی بحثوں میں الجھتا پھروں۔ خیر سے آپ جس قدر جاہل ہیں اس قدر جھکی بھی ہیں۔ قابلیت کا عالم یہ ہے کہ اخبار میں ہزا یکسیلینسی کو ہزا ایکسیلینسی پڑھتے ہیں اور شوق ہے عالمگیر سیاست پر بحث فرمانے کا۔ ان حضرت سے چھپ کر گھر میں کام کروں تو کیسے کروں۔ یہاں آپ کی شاہین بہن اور بلائے بے درماں کیا نام ہے ان کا طاہرہ بہن ہر وقت دھری رہتی ہیں۔"

ناہید: " طاہرہ بہن کو تو آج میں نے خود بلایا تھا کہ ذرا اس سوئیٹر کے خانے مجھ کو سمجھا دیں جو انہوں نے اپنے بھائی کے لئے بنا ہے۔"

خالد: " بس آپ سوئیٹر کے خانے سمجھے اور میرے دماغ کے ہر خانے میں خودکشی یا خون کرنے کے ارادے پرورش پاتے رہیں۔ دیکھ لینا کسی دن کچھ کر گزروں گا۔"

ناہید: " کیا ہو گیا ہے۔ محلہ پڑوس کے لوگوں سے کوئی

کیونکر نہ ملے، آدمی ایسا ہی آدم بیزار بن کر بیٹھ رہے تو دکھ درد میں بھی کوئی شریک نہ ہو۔ اس پردیس میں ہمارا اور ہے ہی کون؟؟؟"

خالد " آج چوتھا دن ہے اس نامراد افسانے کو لئے بیٹھا ہوں جہاں دو سطریں لکھیں، کوئی نہ کوئی آ مرا۔ اب میں پبلشر کو کیا سمجھاؤں کہ مجھ کو مارے ڈالے ہیں میرے پڑوسی۔ باہر بیٹھ کر کچھ لکھنا تو خیر ممکن ہی نہیں نہ عزیز مرزا کو سانپ سونگھے گا نہ ہم باہر بیٹھ سکیں گے، گھر کے اندر جناب اس قدر مرنجاں مرنج واقع ہوئی ہے کہ جب دیکھئے مجلس گرم ہے وہی جو کسی نے کہا ہے۔"

گزرگاہِ حوادث ہے ہمارا آشیاں کیا ہے

ناہید "اچھا اب تم اطمینان سے بیٹھ کے لکھو اس وقت کوئی نہیں آئے گا۔"

خالد " اور اگر اس وقت کوئی آیا تو دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔۔۔"

(کھڑکی پر دستک)

ناہید " آ رہی ہوں طاہرہ بہن آ رہی ہوں **(خالد سے مخاطب ہو کر)** میں ان ہی کی طرف جاتی ہوں تم اطمینان سے لکھو۔"

خالد "پوچھو تو سہی آخر بات کیا ہے۔ کیوں کھڑکی بجائی جا رہی ہے۔"

ناہید ''ہوگی کوئی بات، تم سے کیا مطلب تم لکھو میں جا تو رہی ہوں۔''

خالد " پہلے تم پوچھ کر مجھے بتاؤ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تماشہ کیا بنا رکھا ہے آخر۔ جاؤ پوچھو نا۔"

ناہید " اچھا خدا کے لئے چیخو تو نہیں۔ وہ بھی کہیں گی کہ کیوں چیخ رہے ہیں۔"

(جاتی ہے)

خالد "**(زیرِ لب)** کیوں چیخ رہے ہیں۔ مذاق ہی بنا رکھا ہے گھر نہ ہوا سرائے ہوگئی۔ بازار ہو گیا **(بلند آواز سے)** کیا بات ہے۔"

ناہید **(آتے ہوئے)** ''توبہ ہے کچھ بھی نہیں پوچھ رہی تھیں کہ یہ مہینہ تیس کا ہے کہ اکتیس کا۔''

خالد " تو یہ صندوقچے میں سے کیا جنتری لے کر آپ جا رہی ہیں۔"

ناہید " ابھی بتاتی ہوں آ کر بس تم چپ رہو۔"

خالد "**(زیرِ لب)** چپ رہو۔ یہ چپ رہنے کا ہی نتیجہ ہے کہ گھر کو بھٹیار خانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ **(بلند آواز سے)** ارے صاحب، اب اُدھر کہاں جا رہی ہیں بات سنئے میری۔"

ناہید " **(آتے ہوئے)** آج تو سچ مچ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔"

خالد " کیوں آئی تھیں آپ کی ہمسائی اور کیا دے کر آئی ہیں آپ صندوقچے میں سے۔"

ناہید " بیس روپے کی ضرورت تھی ان کو پہلی تاریخ کو دے دیں گی۔ اتنا چیخے کہ وہ بھی پوچھ رہی تھیں بھائی جان کو آج کیوں غصہ آ رہا ہے۔"

خالد " آج بیس روپے کی ضرورت ہے کل سلائی مشین چاہئے۔ پرسوں آم کا اچار پوچھا ہے، کبھی جوتے کی پالش مانگی جا رہی ہے تو کبھی بجلی کی استری درکار ہے، ناس مار کر رکھ دیا کمبخت استری کا جلا کر رکھ دیا۔"

ناہید " خالہ کی جان ہی بچ گئی ایسا شاک لگا تھا کہ میں تو سمجھی کہ چلیں۔ اچھا خیر اب تم لکھو۔"

خالد " یہ قرض کے جو لین دین آپ نے شروع کر رکھے ہیں ان کا کسی دن بہت تلخ تجربہ بھگتنا پڑے گا۔"

ناہید " محلّہ پڑوس میں ہر جگہ یہی ہوتا ہے خیر تم اپنا کام کرو۔"

(دروازے پر دستک)

چودھری "خالد صاحب۔۔۔ جناب خالد صاحب۔"

خالد "اناللہِ وانا الیہِ راجعونَ۔"

ناہید "چودھری" کی آواز ہے۔ بلالو! اندر ان سے پردہ تھوڑی ہوتا ہے۔ ممکن ہے ممتاز بہن بھی ساتھ آئی ہوں۔"

خالد "(مری ہوئی آواز میں) تشریف لے آیئے"

چودھری "(آتے ہوئے) اخاہ۔۔۔ آج پکڑے ہی گئے ناں۔ یہ کہہ رہی تھیں تمھاری بھابھی کہ وہ تو آنے سے رہے چلو ہم ہی چلیں۔"

ممتاز "اس قدر بے مروت ہیں آپ خالد بھائی کہ ایک محلّہ۔ گھر سے ملا ہوا گھر اور مہینوں نہ خود آتے ہیں نہ یہی توفیق ہوتی ہے کہ ہم کو ہی بلالیں۔"

چودھری "بھئی خوب کہا، خوب کہا۔ وہ جو شعر ہے کسی شاعر کا کہ۔"

وہ خود آتے بھی نہیں ہم کو بلاتے بھی نہیں
باعث ترکِ ملاقات بتاتے بھی نہیں

ممتاز "اور یہ ناہید بہن تو جیسے ایک محلّہ میں کیا اس شہر میں ہی نہیں رہتیں۔"

ناہید "کیا بتاؤں ممتاز بہن گھر کے جھگڑے فرصت ہی نہیں دیتے۔"

ممتاز "چلو ہٹو سخت بے مروت ہو۔"

چودھری "یہ کیا لکھا جا رہا ہے اور یہ بھی کوئی لکھنے کا وقت ہے۔ سہ پہر کو تمام دنیا تفریح کو نکلتی ہے اور آپ ہیں کہ اس وقت یہ بکھیڑا پھیلائے بیٹھے ہیں۔"

ممتاز "جب ہی تو دکھائی نہیں دیتے عید کا چاند ہو کر رہ گئے ہیں۔"

خالد "جی نہیں بلکہ چاند ماری۔"

چودھری "چاند ماری ارے وہ کیونکر ارے بھئی وہ کیونکر۔"

خالد "آج چوتھا روز ہے اس افسانے کو شروع کئے ہوئے نہ جانے کس ساعت میں شروع کیا تھا کہ جب لکھنے کا ارادہ کرتا ہوں کوئی نہ کوئی بات ایسی پیدا ہو جاتی ہے کہ افسانہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔"

چودھری "یہ کمال ہے بھئی، مجھ کو خیر افسانے وغیرہ کا تو تجربہ نہیں مگر والد صاحب کو کچھ لکھنے کا شوق تھا اور وہ تو ایک ایک دن میں ایک ایک ناول لکھ لیا کرتے تھے۔ وہ جو اُن کا ناول ہے تیرِ نظر یا خونخوار حسینہ یہ بس ایک ایک دو دو دن کے لکھے ہوئے ہیں۔ میری تو سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ ان کے دماغ میں پورے پورے ناول کیسے آجایا کرتے تھے؟"

ممتاز "شاعری بھی تو کرتے تھے ابا جان شائد؟"

چودھری "ان کا بھی یہ حال تھا کہ ہارمونیم لے کر بیٹھ گئے اور ایک سے ایک حقانی غزل کہہ ڈالی۔ یہ اُن کا ہی شعر ہے۔۔۔ وہ کیا تھا جو میں کل گنگنا رہا تھا۔۔۔ ہاں کہتے تھے:

منہ پھیر لیا ناز سے شرما کے کسی نے
دل تھام لیا تیرِ نظر کھا کے کسی نے

ممتاز "تو کیا خالد بھائی آپ جو یہ لکھتے ہیں اس کو چھپوا کر بیچتے بھی ہیں؟"

خالد "چھوڑیئے بھابی اس قصے کو۔۔۔ اور کچھ فرمایئے! کہیئے آپ کی بھینس کا کیا حال ہے۔"

چودھری "بھئی وہ تو اب بالکل ٹھیک ہو گئی۔ ماشا اللہ خوب دودھ دہی دے رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو آدمی ہم نے پہلے رکھا ہوا تھا، یہ سب اُس کا قصور ہے۔"

ممتاز "چور تھا کمبخت اس کے جاتے ہی اچھا خاصا دودھ دینے لگی۔"

چودھری ''بھئی اس وقت یوں تو ہم دونوں خیر ملنے ہی آئے تھے، بہت دن سے دیکھا نہیں تھا تم کو مگر ایک بات اور بھی کہنا تھی۔۔۔ بات یہ ہے کہ میرا ارادہ ہو رہا ہے ایک باقاعدہ ڈیری فارم کھولنے کا۔''

خالد "ڈیری فارم؟ یعنی اب دودھ کا کاروبار کریں گے آپ؟"

چودھری "وجہ یہ ہے کہ بڑا فائدہ ہے اس کام میں۔۔۔۔ میں نے سوچا ہے کہ اگر تین چار دوست مل کر دو دو ہزار روپیہ لگا کر فی الحال ابتدا کریں تو انشا اللہ بعد میں یہی چھوٹا سا کام اعلیٰ پیانے پر پہنچ سکتا ہے۔ ایک حصہ دار تو ہوا میں، ایک میں نے مرزا صاحب کو تیار کرلیا ہے۔۔۔ پھر خیال آیا کہ ایک حصہ تم بھی لے لو۔"

خالد "میں؟۔۔۔ مگر ذرا خیال تو کیجئے۔۔۔ میں قلم کا مزدور، لکھنے پڑھنے والا آدمی۔"

چودھری "میاں تو کون تم سے کہتا ہے کہ بھینسوں کا چارہ سانی کردیا کرو، بیٹھ کر دودھ دھو۔۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا ایک کاروبار یہ بھی چلتا رہے، دوسرے بھائی جان جہاں تک آپ کی اس قلم کی مزدوری کا تعلق ہے، اس کا حال جو کچھ ہے وہ میں دیکھ ہی رہا ہوں کہ آپ کہتے ہیں کہ چار دن سے یہ افسانہ لئے بیٹھے ہیں اور پورا نہیں ہو رہا ہے، برعکس اس کے ایک معمولی سی معمولی بھینس یومیہ دس بارہ سیر یومیہ دودھ دیا کرتی ہے۔ خواہ دودھ بیچیے، خواہ مکھن، گھی۔۔۔۔ مطلب یہ کہ سونا بناتی ہے بھینس، میاں بھول جاؤ گے اس قلم کی مزدوری کو کچھ دن میں۔"

خالد "خیر چھوڑیئے اس قلم کی بات کو آپ تو بھینسوں کا ذکر ہی کئے جایئے۔"

ممتاز "اب ایسا بھینسوں کا شوق ہوا ہے کہ کوئی اور ذکر سننا ہی نہیں چاہتے۔"

چودھری "شوق کی بات نہیں بلکہ سمجھ میں آ گئی ہوگی، یہ بات کہ کتنی معقول تجویز ہے تمھاری طرح تھوڑی کہ اس کو خواہ مخواہ کا روگ سمجھتی ہو۔"

ممتاز "روگ میں یوں سمجھتی ہوں ناہید بہن کہ دن رات کم بختوں کی خدمت کرو۔ بال بچوں والے گھر میں بھینسوں کی ناز برداری تو ہو نہیں سکتی، اب دیکھ لو وہ بھوری بھینس اور سلمیٰ ساتھ ساتھ بیمار ہوئیں بھینس کو دیکھوں تو سلمیٰ کی تاک کون لے اور سلمیٰ کو دیکھوں تو بھینس جاتی ہے ہاتھ سے، عجیب مصیبت میں جان ہو کر رہ گئی تھی۔"

چودھری "خیر چھوڑو اس ذکر کو، میں تو عرض کر رہا تھا عزیز من کہ اس قلم دوات میں کچھ نہیں رکھا ہے قلم کے ساتھ خود بھی گھس کر رہ جاؤ گے اور یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ قلم کی مزدوری میں کچھ فائدہ ہوتا تو یہ جو عرائض نویس ہوتے ہیں اور جو ڈاکخانوں کے سامنے منشی بیٹھتے ہیں کان میں قلم لگا کے اور ناک پر عینک رکھ کر ان سب کے پاس موٹر ہوتی۔"

ممتاز "میں نے تو ہمیشہ لکھنے پڑھنے والوں کی آنکھوں پر ہمیشہ عینک ہی دیکھی ہے۔"

چودھری "اب مجھ کو دیکھئے کہ چاند کی روشنی میں پھانس نکال لیتا ہوں انگلی سے انتیس کا چاند سب سے پہلے میں دیکھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ میں نے لکھنے پڑھنے کا جھمیلا کبھی نہیں رکھا ہے۔"

خالد "صاحب چھوڑیئے اس لکھنے پڑھنے کے ذکر کو آپ تو ڈیری فارم ہی کا ذکر کیجئے مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا ہوگا۔"

چودھری "میاں کرنا کیا ہوگا بس دو ہزار کی رقم کا انتظام کرو اس کے بعد بس۔ ذرا دیکھ بھال کرتے رہنا۔"

خالد "میرا ارادہ ہو رہا تھا بندروں کی تجارت کا۔"

ممتاز "اوئی بندروں کی تجارت کیسی۔"

خالد "بڑے فائدے کا ہے یہ کام بھی ایک آدھ بندر سدھا کر رکھ لیا، نچانے کیلئے، باقی جہاز پر بھرے اور باہر بھیج دئے۔"

ناہید "اونہہ وہ چلے بندر کا ذکر لے کر۔ بات یہ ہے ممتاز

بہن کہ بھینسوں اور دودھ کے کام کے لئے یہ تو کیا میں خود غور کروں گی اور ایک آدھ دن میں آپ کو جواب دونگی۔"

چودھری "ہاں ہاں غور کرلو۔اس کام کے بڑے فائدے ہیں جوغور کرنے کے بعد ہی سمجھ میں آئیں گے۔"

ممتاز "اچھا تو اب چلو۔دن چھپ رہا ہے۔سلمیٰ کو ابھی جا کر دوا دینی ہے۔"

ناہید "اب طبیعت کیسی ہے؟"

ممتاز "کیا بتاؤں بہن دو دن ٹھیک اور پھر ماندی۔پل میں تولہ پل میں ماشہ۔جامن والی گلی کے حکیم کا علاج کیا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔گنڈے تعویذ سب ہی کچھ ہوئے۔اب آج کل ایک قلعی گر کا علاج ہے اس کے پاس کوئی فقیری نسخہ ہے اس سے البتہ بہت فائدہ ہے۔بھوک بھی لگی ہے اور چہرے پر رنگت بھی آ گئی ہے۔"

چودھری "اچھا تو بھائی صاحب اب اجازت دیجئے۔"

ممتاز "ناہید بہن آجایا کرو کبھی تو بھول کر۔اچھا بھائی صاحب تسلیم۔"

خالد تسلیم تسلیم۔"

(دونوں جاتے ہیں)

ناہید "اب مجھ کو قہر آلود نظروں سے کیوں گھور رہے ہو۔کیا میں جا کر بلا لائی تھی۔"

خالد "تم سے صرف انصاف چاہتا ہوں اب تم ہی بتاؤ کہ اِن حالات میں اچھے خاصے آدمی کا دماغ خراب نہ ہو تو کیا ہو۔اس عرصے میں کئی مرتبہ اقدام قتل کا ارادہ کیا۔جی چاہتا تھا کہ چودھری کو مار کر اپنے دل کی لگی بجھاؤں مگر نجانے کیسے ضبط کرتا رہا۔آیا ہے وہاں سے بھینسوں کا دھندا لے کر دودھ کی تجارت کرانے چلا ہے۔"

ناہید "وہ بیچارے کیا جانیں جاہل آدمی اور تم لے کر بیٹھ گئے بندروں کا قصہ۔"

خالد "کیا کرتا جو شخص انشا پردازی اور عرائض نویسی میں امتیاز نہ کر سکے وہ بھینس اور بندر کا فرق تو سمجھ ہی سکتا ہے۔اب دیکھ لو کہ دماغ کا تمام شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے، خدا جانے کیا لکھنا چاہتا تھا قلم اٹھاتا ہوں تو بھینس کی تصویر سامنے آجاتی ہے اور جب اس کو غور سے دیکھتا ہوں تو وہی بھینس چودھری بن جاتی ہے۔"

ناہید "خیر یہ بلا بھی آنی ہی تھی ،سو آ کر ٹل گئی اب تم اطمینان سے بیٹھ کر لکھو۔"

خالد "خاک لکھوں اب اس وقت سوائے بھینسوں کے اور ان کے دودھ کے کسی اور موضوع پر کچھ لکھ ہی نہیں سکتا، دماغ ماٹی بنا ہوا ہے اور بھینس اس کو تناول فرما رہی ہیں۔"

ناہید "لو میں تم کو پان دیتی ہوں طبیعت کو ادھر سے ہٹاؤ اور اب بھینسوں کو بھولنے کی کوشش کرو۔"

(دروازے پہ دستک)

عزیز مرزا "(آواز دیتا ہے) ارے بھئی خالد صاحب۔میں نے کہا خالد میاں۔"

خالد "ناہید ذرا میری بندوق تو اٹھا دو۔"

عزیز مرزا "(پھر آواز دیتا ہے) خالد صاحب ارے بھئی خالد صاحب۔"

ناہید "سچ مچ بعض اوقات تو واقعی تانتا بندھ جاتا ہے۔"

خالد "میں کہہ رہا ہوں بندوق لاؤ۔مجھ کو پہلے ہی معلوم تھا کہ میری موت اسی طرح لکھی ہوئی ہے۔"

عزیز مرزا (زور سے) "جناب خالد صاحب۔ارے میاں سو گئے کیا؟؟؟"

خالد "تم ہٹ جاؤ ناہید میں ان حضرت کو اندر ہی بلائے لیتا ہوں (بلند آواز سے) تشریف لے آیئے۔"

عزیز مرزا "(آتے ہوئے) کمال کر دیا یار چیختے چیختے گلا بیٹھ

گیا۔ یہ آج گھر سے نکلے کیوں نہیں۔"

خالد "یوں ہی ذرا طبیعت ست تھی۔"

عزیز مرزا "میاں جم کر علاج کراؤ، روز کی طبیعت کی سستی ٹھیک نہیں ہے اور میں نے کہا پڑھا آج کا اخبار؟"

خالد "نہیں میں تو نہیں دیکھ سکا اخبار۔"

عزیز مرزا "یار کمال ہو گیا آج تو۔ وہ جو میرے منہ سے بات نکلی تھی ایسی پوری ہوئی ہے کہ میں تو شش جہت ہو کر رہ گیا ہوں۔"

خالد "یہ ششدر کو آپ کہہ رہے ہیں غالباً شش جہت۔"

عزیز مرزا "وہی مطلب، مگر کیا کہنے ہیں۔ میں جو کہہ رہا تھا افغانستان کے خود ہاتھ پیر اس کو جواب دے دیں گے۔ اب آجکل بڑی بدشگونی پھیلی ہوئی ہے۔"

خالد "بدشگونی آپ سنسنی کو کہا کرتے ہیں ناں۔"

عزیز مرزا "ہاں ہاں وہ ایک ہی بات ہے۔ اب دیکھ لیجئے کہ یہ جو افغانستان کے بعض لوگ اپنے ہی لوگوں سے غثاری کر رہے ہیں۔"

خالد "غثاری، یعنی غداری؟؟؟"

عزیز مرزا "اوہو بھئی وہی تو کہہ رہا ہوں کہ یہ تو اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی مارنا ہے۔"

خالد "ایک بات بتایئے مرزا صاحب کہ آپ کو یہ سیاسی شوق بھلا کب سے ہو گا۔"

عزیز مرزا "بس یوں سمجھ لیجئے کہ والد میرے ایک اخبار کے دفتر میں دفتری خانہ کے چارج میں تھے اور میں ان کے ساتھ بس دفتر گیا اور پڑھ رہا ہوں اخبار، یہ سانحہ میرے سامنے ہی گو بیک ہوا تھا۔"

خالد "اس وقت سے اب تک کوئی افاقہ نہیں ہوا۔"

عزیز مرزا "جی بس یوں سمجھو کہ پھر بس اسی کا شوق رہ گیا۔ اب اگر میں کسی دن اخبار نہ پڑھوں تو حالت غیر ہو جاتی ہے دو پیسہ روز کا یہ ضمیمہ بس بندھا ہوا ہے۔"

خالد " مگر آپ کو شاید یہ نہیں معلوم کہ یہ بیماری اب چھوت کی بیماری کے درجہ تک پہنچ چکی ہے۔"

عزیز مرزا " ایں؟؟ اماں کون سی۔ یہ آپ نے ایک ہی سنائی۔" بھائی میں دورانِ گفتگو کر رہا ہوں اخبار کے متعلق۔"

خالد "میں آپ کے دورانِ گفتگو کے متعلق ذکر کر رہا ہوں جو مستقل دورانِ سر ہے اگر اجازت ہو تو اب میں ذرا سر پر پٹی باندھ کر لیٹ رہوں۔"

عزیز مرزا " ہاں ہاں۔ بڑے شوق اور ذوق سے آپ ابدی آرام فرمایئے۔"

خالد " کاش ابدی آرام ہی نصیب ہو سکے۔"

عزیز مرزا "اچھا تو پھر خدا حافظ۔"

خالد "خدا حافظ۔"

(عزیز مرزا جاتا ہے)

ناہید "(آتے ہوئے) کمبخت کہیں کا۔ مواکلموہا۔ ابدی آرام فرمایئے۔ وہ خود نہ کرے ابدی آرام۔"

خالد " مقصد اس کا صرف آرام سے تھا۔ ابدی تو محض قابلیت کے لئے لگا دیا ہو گا۔"

ناہید "بڑا اپنے کو قابل سمجھتا ہے۔"

خالد "اچھا ناہید اب ذرا مجھ کو تنہا چھوڑ دو۔ موضوع سوجھ گیا ہے اور مضامین امنڈ رہے ہیں ذہن میں۔ یہ سب طفیل ہے چودھری صاحب، ممتاز بہن، عزیز مرزا تمہاری طاہرہ بہن اور شاہین بہن کا موضوع ہے مرزا غالب کے اشعار کہ

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

محمد ایوب صابر

کالی بھیڑ

بھیڑ اور بھیڑیا جانوروں کے ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بھیڑ انتہائی شریف النفس اور بھیڑیا انتہائی شریر النفس ہوتا ہے۔ بھیڑ سے ہم دودھ، گوشت اور کھال حاصل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی اون سے تیار کردہ کپڑا سردیوں میں کپکپاہٹ دور کرنے میں مدد کرتا ہے جبکہ بھیڑیے کے خوف سے انسان گرمیوں میں بھی کانپنے لگتے ہیں۔ جس طرح چینی باشندے اکثر ہم شکل ہوتے ہیں اسی طرح ہر بھیڑ کی شکل دوسری بھیڑ سے قدرے مشترک ہوتی ہے۔ بھیڑ کا دودھ گوالے کو بہت پسند ہوتا کیونکہ گاڑھا ہونے کی وجہ سے اس کے اندر زیادہ مقدار میں پانی ''جذب'' کرنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ آج کل ہم لوگ بھیڑ چال ہو گئے ہیں، جہاں ذرا سا ہنگامہ دیکھا جوق در جوق منہ اٹھائے اس میں شامل ہو گئے اور توڑ پھوڑ شروع کر دی۔ بھیڑوں کے گلے کی طرح جمع اس جمِ غفیر سے اگر پوچھو کہ تم لوگ کس مقصد کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے تو سب ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنا شروع کر دیں گے گویا ہم لوگ بھی بھیڑ چال چلنے لگے ہیں اور بلا مقصد کسی طرف بھی منہ اٹھا کر چلے جاتے ہیں۔

بھیڑ میں بظاہر کوئی برائی نظر نہیں آتی بشرطیکہ وہ سفید رنگ کی ہو۔ ہاں البتہ کالی بھیڑوں سے خود کو دور رکھنا خاصا مشکل کام ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں کالی بھیڑوں کی تعداد اِس قدر زیادہ ہو چکی ہے کہ سفید بھیڑ تلاش کرنا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اب ٹیکس چوروں کو ہی لیجیے، اِن سے بڑی کالی بھیڑیں اور کون ہو سکتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اربوں روپے عیاشی میں لٹانے والے حضرات سے جب ٹیکس کے بابت دریافت کیا جائے تو ادا کردہ سالانہ انکم ٹیکس کی رقم ان کے گھر میں ملازم خانساماں کی ماہانہ تنخواہ سے بھی کم ہوتی ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی نظر میں ملکی معیشت کا استحکام اور قدر و قیمت ایک خانساماں سے بھی سو گنا کم ہے۔

ہم اپنے وطنِ عزیز کو کب تک ان کالی بھیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑیں کے جن کے دل میں ذرا سا بھی احساسِ ندامت نہیں ہے۔ یاد آیا جرمن ٹینس اسٹار اسٹیفی گراف کے والد کو صرف ٹیکس کی مد میں تھوڑی سی ہیرا پھیری کرنے کی وجہ سے جیل کی ہوا کھانا پڑی تھی جبکہ ہمارے ٹیکس نادھندگان سے بھی بڑی کالی بھیڑیں محکمہ انکم ٹیکس میں موجود ہیں۔ جس طرح واپڈا کا میٹر ریڈر ''چائے پانی'' لے کر گھریا فیکٹری کا میٹر بند رکھنے کا طریقہ خود بتاتا ہے اسی طرح ٹیکس ریٹرن میں ہیرا پھیری کے سارے گُر خود انکم ٹیکس انسپکٹر بتاتا ہے جو اس نے برسوں کی ریاضت سے سیکھے ہیں۔ اِن کے ہاتھوں

کا کمال دیکھ کر تو نٹورلال بھی کانوں کو ہاتھ لگا لے ۔ بھیڑ اور کرکٹ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آپ نہیں سمجھے! کوئی بات نہیں میں وضاحت کر دیتا ہوں ۔ پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام ہے اور غیر سرکاری مذہب کرکٹ ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بھیڑیں آسٹریلیا میں پیدا ہوتی ہیں اور دنیا کی مضبوط ترین کرکٹ ٹیم بھی آسٹریلیا کو تصور کیا جاتا ہے۔ چند برس پہلے دہشت گردوں نے لاہور میں سری لنکا کے کرکٹ کھلاڑیوں کی سری اڑانے کے لئے بہت نشانے لگائے تھے لیکن خوش قسمتی ہے تمام کھلاڑی اپنی سری بچا کر سری لنکا پہنچ گئے ۔

اس سانحے کے بعد تمام بین الاقوامی کرکٹ ٹیموں نے پاکستان آ کر کرکٹ کھیلنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آسٹریلیا نے عندیہ دیا ہے کہ وہ پاکستان آ کر کرکٹ کھیلنے کے لیے تیار ہیں۔ اس غرض سے انہوں نے ایک حکمتِ عملی طے کی ہے۔ سب سے پہلے اپنی بیمار بھیڑوں کو پاکستان روانہ کریں گے۔ تمام پاکستانی بشمول کرکٹ کھلاڑی ان بیمار بھیڑوں کا گوشت کھائیں اور اگر اس گوشت کو کھانے کے بعد وہ کھیلنے کے قابل رہیں تو آسٹریلیا کی کرکٹ ٹیم پاکستان آنے کا فیصلہ کرے گی۔

اس معاہدے کے تحت آسٹریلوی بیمار بھیڑیں پاکستان کی بندر گاہ پورٹ قاسم پر اتار دی گئی ہیں۔ اس ساری ''حکمتِ عملی'' کا پردہ ایک ٹی وی چینل نے چاک کر دیا ہے۔ اب آسٹریلیا سے درآمد شدہ بھیڑوں کا دن رات معائنہ کیا جا رہا ہے۔ وہ بھیڑیں بیماری سے زیادہ دن رات کے ڈاکٹری معائنے اور اور خون کے نمونے لینے سے لاغر ہو کر مر رہی ہیں۔ آسٹریلوی حکام کا کہنا ہے کہ یہ بھیڑیں پاکستان پہنچنے سے پہلے فٹ بال کھیلنے بحرین بھی گئی تھیں۔ بحرینی عوام میں کالی بھیڑیں تلاش کرنا مشکل مرحلہ ثابت ہوا۔ آسٹریلوی حکام نے پاکستان کی کالی بھیڑوں سے رابطہ کر کے انہیں اپنی سفید بھیڑوں کے استقبال کے لئے تیار کر لیا تھا۔ آسٹریلوی بھیڑوں کو تندرستی کی جعلی ڈگری جاری کر دی جائے گی لیکن ان کا منصوبہ بھی ''بھیڑ کی لات ٹخنوں تک'' ثابت ہوا ہے۔ آج کل ہر کوئی اِن آسٹریلوی بیمار بھیڑوں کی فکر میں لاغر نظر آ رہا ہے۔

پاکستانی حکومت نے ان بیمار سفید بھیڑوں کی تلف کرنے کا کچا پکا ارادہ کر لیا ہے۔ آسٹریلوی حکام نے پاکستانی حکومت کو باور کرایا ہے کہ اِن بھیڑوں کو تلف کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ کچھ دنوں بعد بھولے عوام سارے قصّے کو بھول جائیں گے۔ آسٹریلیا کا استدلال ہے کہ پاکستان میں پہلے کون سا تندرست جانوروں کا گوشت فروخت ہوتا ہے۔ آسٹریلوی سفید بھیڑیں بلاناغہ معائنے سے اس قدر تنگ آ چکی ہیں کہ خودکشی پر آمادہ نظر آ رہی ہیں۔ اِن بھیڑوں میں کچھ سرکردہ بھیڑوں نے طنزیہ انداز میں حکومت پاکستان سے مطالبہ کر دیا ہے کہ ہماری فکر چھوڑیں کیونکہ ہم سے زیادہ خطرناک اور زہریلی تو وہ کالی بھیڑیں ہیں جو سارے معاشرے کا حق کھا رہی ہیں۔ پہلے اُن کی ٹھکانے لگانے کی فکر ہونی چاہئے جن کی وجہ سے آپ کا شمار دنیا کے پہلے 10 کرپٹ ترین ممالک میں ہو چکا ہے۔ یہی وہ کالی بھیڑیں ہیں جو آپ کے منہ پر بدنامی کی کالک مَل رہی ہیں۔ اب آسٹریلیا نے آخری وارننگ دی ہے کہ اگر آپ نے ہماری سفید بھیڑوں کو تلف کیا تو ہم پاکستان سے کرکٹ روابط بحال نہیں کریں گے۔ آسٹریلیا کا کیا ہے اُن کی بھیڑ جہاں جائے گی وہیں منڈے گی۔ اس کے برعکس ہمارے لئے یہ ایک سنگین مسئلہ ہے اگر کرکٹ کی بحالی چاہتے ہیں تو بیمار آسٹریلوی بھیڑوں کا گوشت کھانا پڑے گا۔ میرے خیال میں کرکٹ کو بھول کر قومی صحت کی فکر کریں جو کسی کھیل سے زیادہ اہم ہے کیونکہ آسٹریلوی بھیڑوں کو قبول کرنا قومی صحت کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس کے ساتھ عہد کریں کہ آئندہ انتخابات کے موقع پر تمام کالی بھیڑوں کو ووٹ کے ذریعے تلف کریں گے تا کہ ایک صحت مند اور روشن پاکستان کی تکمیل کا خواب شرمندہ ءتعبیر ہو جائے ، وہ خواب جو ہمارے بزرگوں نے جاگتی آنکھوں دیکھا تھا۔

> کبھی کبھی تو مصروف آدمی ایک مینڈک دکھائی دینے لگتا ہے جو اپنے کنویں سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتا اور وہیں ٹرانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ (شامتِ اعمال از اظہر سلیم مجوکہ)

کائنات بشیر، جرمنی

شلوار اور لنگی

شلوار اور لنگی، جن کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں کوئی تال میل نہیں پھر بھی ایک دوسرے کے حریف ہیں۔

دونوں ایشیائی لباس کا حصہ ہیں۔ شلوار تو قومی لباس کے آدھے حصے میں بھی شامل ہے۔ یہ دونوں خود مشہور ہوئے کہ نہیں پر ان کی بدولت ان کے جوڑی دار خوب مشہور ہوئے۔ شلوار کے ساتھ کئی طرح کے کُرتے فروغ پا گئے۔ کئی طرح کی اونچی، نیچی، لمبی، چھوٹی قمیصیں فیشن میں آ گئیں۔ اِدھر لنگی دراصل ایک مسکین سا لباس ہی رہی، جس کے ساتھ چاہے کرتا پہن لو یا قمیض اور بنیان کے ساتھ بھی باکمال، جبکہ بڑے بڑے لوگ سیاستدان، افسروں، تھانیداروں کا گھروں میں تخلیے میں یہ بے تکلف سا حلیہ ہے۔ اور ان سے بھی بڑھ کر شاعر حضرات کا پسندیدہ لباس ہے بنیان اور لنگی۔ حالانکہ یہ مشہور لوگ اسے چھپ کر پہنتے ہیں، سرِ عام پہننے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے گھروں پر کوئی اچانک چھاپہ مار لے تو یہ چھپنے لگتے ہیں یا اسے بدلنے کے لیے دو چار منٹ کے لیے اِدھر اُدھر ہونے لگتے ہیں۔ دراصل لنگی کے ساتھ ان کی پُر رعب شخصیت کا گراف کچھ نیچے آ جاتا ہے۔ حالانکہ لنگی میں بھی کافی ورائٹی آئی۔ ڈبیوں والی، چارخانوں والی، لائنوں والی، جاپانی لیڈی نے بھی اسے اپنے حسیں گداز بدن کا پہناوا بنایا۔ اور گھبراہٹ میں آدھے کی بجائے پورے جسم کی زینت بنا لیا۔ مگر کپڑا چونکہ محدود تھا اس لیے یہ لباس کافی چست بنا کہ اسے چلنا مشکل ہو گیا کیونکہ اسے پہن کر وہ جاپانی حسینہ، انجمن کی طرح چھلانگیں نہیں مار سکتی تھی۔ تبھی تو اسے پھولوں کو بھی اپنے پہناوے میں شامل کرنا پڑا اور چہرے پر اک ملکوتی مسکراہٹ سائیونارا سائیونارا کر کے لانی پڑی۔ سو اِدھر اُدھر کے مانگے لوازمات سے اس لنگی نما لباس کی عزت رکھنی پڑی۔

ویسے سری لنکا کے لوگوں کی لنگی بڑا متاثر کرتی ہے جسے وہ مچھیروں کی طرح اتنا اونچا باندھ لیتے ہیں جیسے ہر وقت شڑپ شڑپ پانی میں سے گزر رہے ہوں اور بنگالی بھائیوں کا تو یہ پسندیدہ لباس ہے جسے وہ مچھلی اور چاول کی مرغوب غذا کے ساتھ خوب پسند کرتے ہیں۔ وہاں بنگالی خواتین جتنا خوش ہو کر ساڑھی پہنتی ہیں، مرد سرِعام اتنی ہی بے تکلفی سے لنگی پہنتے ہیں۔ ساڑھی اور لنگی کافی ملتے جلتے لباس ہیں، اگر ایک ساڑھی کو درمیان سے کاٹ دیا جائے تو اس سے دو لنگیاں بآسانی تیار ہو سکتی ہیں۔ پھر مردوں کے لیے اس کے ساتھ زمین پر کھانا کھانے کے لیے بیٹھنا بھی کتنا آسان ہے۔ جبکہ پتلون والا زمین پر بیٹھنے میں کتنی تردد کرتا ہے۔ سو طرح کے بہانے بناتا ہے۔ کہ مجھے بھوک نہیں، پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اور بھوکا ہو کر بھی بھوک کے نہ ہونے کا ناٹک کرتا ہے۔

لنگی پہن کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ ورزش کی جا سکتی ہے۔ یوگا کے آسن لگائے جا سکتے ہیں۔ پھسکڑی ماری جا سکتی ہے۔بس کراٹے کرنے والوں کے لیے یہ لباس محفوظ نہیں۔

ویسے کہنے میں کیا حرج ہے۔اپنی جگہ دونوں ہی نیم عریاں لباس ہیں۔اگر شلوار کو عزت دار بنانے کے لیے قمیض نہ ملتی اور لنگی کو بنیان جیسی ساتھی نہ ملتی تو دونوں ہی فحش کیٹگری میں آجاتے۔

کہتے ہیں جب سکندر اعظم کی فوجیں برصغیر میں آئیں تو اپنے ساتھ مختلف طرح کے کھانے اور لباس کے انداز لائیں جن میں بھیڑ کا نمکین گوشت اور قمیض کے ساتھ شلوار چلی آئی۔جب وہ واپس گیا تو اس کے اکثر فوجی اسی علاقے میں رہ گئے،یہیں مقامی لوگوں سے انھوں نے شادیاں کر لیں تو یوں ان کے کھانے اور لباس بھی مقامی لوگوں میں رچ بس گئے۔تو سکندر بھیا شلوار کو دوام بخشنے کا سہرا تمہارے سر ٹھہرا۔۔شلوار پاکستان کے علاوہ عرب ممالک میں بھی کافی مشہور ہے۔خاص طور پر بیلی ڈانس کرنے والی پر تو خوب جچتی ہے۔ایک دوست خوب فیشن کی دلدادہ تھی۔ایک بار اس نے ٹیلر سے سوٹ سلوایا تو اسے بتا بتا کر اپنی شلوار نئے طریقے سے ڈیزائن کروائی۔ جب تیار شدہ شلوار ٹرائل کے لیے پہن کر آئی تو سب کا ہنستے ہوئے برا حال ہو گیا وہ کوئی عربی رقاصہ لگ رہی تھی۔شلوار میں ڈھیر سارا کپڑا علیحدہ کھپ گیا تھا اور چنٹیں ہی چنٹیں نظر آ رہی تھیں۔اسی طرح کی ایک اور دلچسپ شلوار فلم پریم روگ میں پدمنی کولہاپوری نے پہنی تھی۔گانا چل رہا تھا۔۔۔

محبت ہے کیا چیز ہم کو بتاؤ
یہ کتنے سروں کی ہمیں بھی سناؤ

اس میں وہ جو شلوار کا پہناوا پہنے نظر آئی تو اس کی ٹانگیں مرغی جیسی لگ رہی تھیں جسے دیکھ کر یقیناً فلم بین بھی سوچتا ہوگا،

یہ پہنی ہے کیا چیز ہم کو بتاؤ
یہ کتنے گزوں کی ہمیں بھی بتاؤ

خیر اس کے بعد تو خوب شلوار فیشن آئے، پٹیالہ شلوار، بیلٹ شلوار، پنجابی شلوار، دھوتی شلوار وغیرہ وغیرہ،شلوار کے بالمقابل چوڑی دار پاجامہ آیا۔ٹراؤزر، غرارہ، شرارا، کی صورت نئے نئے مقابل سامنے آئے مگر شلوار جتنے مشہور نہیں ہو سکے۔پاکستان کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک پنجابی سے پٹھان، سندھی سے بلوچی تک سب ہی شلوار کے دلدادہ ہیں۔بس اپنی علاقائی ثقافت دکھانے کے لیے اوپری لباس پر زور لگا دیتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کہیں شلوار کھلی ہے اور کہیں تنگ۔۔۔! جیسے پٹھان کی شلوار اسکے مزاج کے الٹ کھلی کھلی ملے گی۔ یوں شلوار چاروں صوبوں میں نظر آتی ہے جبکہ لنگی صرف پنجاب میں۔لیکن اس سے یہ مت سمجھئے گا کہ لنگی پہننے والوں کا تناسب کم ہو گیا ہے۔ ہرگز نہیں اب دیکھیں نا اگر سیاستدان شلوار سے شغف فرماتے ہیں تو اُدھر فردوس، نغمہ، رانی، عالیہ، آسیہ سے لے کر انجمن، ریما، صائمہ پنجابی فلموں کی ہیروئن لنگی نما لاچا پہنتی رہی ہے۔

لنگی وہ کپڑا ہے جسے کمر سے لے کر گھٹنوں یا پنڈلیوں تک باندھتے ہیں۔یہ ریشم یا سوتی کپڑے سے بنائی جاتی ہے اور اسے کمر کے گرد باندھا جاتا ہے۔ بھارت، پاکستان اور بعض دوسرے جنوب ایشیائی ممالک میں مرد حضرات اور بعض علاقوں میں خواتین بھی لنگی پہنتی ہیں۔لاچا، لنگی، دھوتی، چادر یہ سب ایک ہی برادری سے ہیں۔فرق اتنا ہے کہ لاچا مذکر ہے اور لنگی مونث،فلموں میں عورت مذکر پہن رہیے اور مرد مونث، اور معاشرے کو بھی اس پہ چنداں اعتراض نہیں۔۔جبکہ عورت کے پتلون پہننے پر ہوہو ہاہا کار مچ جاتی ہے۔۔اب دیکھیں نا، لاچا پہن کر انجمن نے کھیتوں میں کتنے کدکڑے لگائے ہیں، کتنی فصلیں تباہ کی ہیں۔اور سلطان راہی نے لنگی پہن کر گنڈاسہ اٹھایا ہے، بڑکیں ماری ہیں اور بہتوں کے ٹوٹے کیے ہیں۔اس پر معاشرے کو بھی کوئی اعتراض نہیں۔

لنگی کے تو اور بھی ہزار فوائد نکلے۔ایسا لباس جسے کاٹنا سینا پرونا بھی نہیں پڑتا۔ادھر بازار سے لائے ادھر بندہ پہننے کو تیار، بوقت ضرورت بستر پر بچھ سکتی ہے۔سر پر ڈالی جا سکتی ہے۔چھتری کی طرح تانی جا سکتی ہے۔سر پر باندھنے کا صافہ بنا دیا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر جب کوئی دوسرا کپڑا دستیاب نہ ہو رہا ہو تو فوراً لوگ اسے استعمال میں لے آتے ہیں۔اس کے چار کونے گرہیں

باندھنے میں بڑے کارآمد ہیں۔ اسی لیے دھوبی جب بھی گندے کپڑے لینے آتا ہے تو باقی کپڑے اس لنگی نما چادر میں لپیٹ کر فوراً گٹھڑی بنا لیا ہے۔ یقین نہ آئے تو آئندہ اسے کہہ دیکھیے کہ صاحب کی پتلون میں کپڑے باندھ کے لے جائے یا بیگم صاحبہ کے شرارے میں میلے کپڑے باندھ لے۔

ویسے سمجھا جاتا ہے کہ لنگی ایک دیہاتی پہناوا ہے۔ تو کچھ غلط بھی نہیں ہے۔ شہر میں آپ کو لنگی پہننے والوں کا تناسب ذرا کم نظر آئے گا اور دیہات میں زیادہ، وہاں اس کے دلدادہ اور دلدار زیادہ ملیں گے۔ کچھ لوگ اس سے اتنے مانوس اور بے تکلف ہیں کہ لنگی کے لٹکتے سرے کو پکڑ کر اس سے بھی کوئی نہ کوئی کام لے لیتے ہیں۔ جیسے ہاتھ پونچھ لیے، منہ دیکھنے کے لیے آئینہ پکڑ کر صاف کر لیا، اور نہیں تو اس سے بچے کی بہتی ناک صاف کر دی۔ پھر اس کی ڈب اک خفیہ تجوری کا کام دیتی ہے۔ کچھ مہربان اسی سرے میں روپے لپیٹ کر جلدی سے اسے اڑس لیتے ہیں۔

لنگی کی ایک اور قسم ہمسایہ ملک کی ہندی فلموں میں بھی نظر آتی ہے اور ان کے ٹی وی ڈراموں میں بھی۔ جو کچھ ایسے انداز، بھول بھلیوں کی طرح نظر آتی ہے کہ فلم بین کہانی چھوڑ کر اس لنگی کو پہننے کا طریقہ سوچنے لگتا ہے۔ ویسے کمال کی بات ہے کہ اس طرح لنگی پہن کر کچھ شلوار جیسی دکھنے لگتی ہے۔

ہر زمانے میں لنگی آرام دہ نائٹ سلیپنگ ڈریس بھی رہی ہے۔ لنگی ایک رنگ کی ہوتی تھی یا لائنوں ڈبیوں والی۔ شکر ہے کبھی پھولوں والی لنگی دیکھنے کو نہیں ملی۔

ویسے کہنے میں کیا حرج ہے، شاعر علامہ اقبال بھی گھر میں اسے شوق سے پہنتے تھے اور سکھ صاحبان تو لنگی پہن کر خوب۔۔ آہو آہو، بلے بلے۔۔ کر کے بھنگڑا ڈالتے ہیں۔

پہلوان لوگ لنگی پہن کر اسی کو چڈی میں تبدیل کر کے فوراً کس کرا کھاڑے میں اتر آتے ہیں۔

عربی لوگ بھی چوغہ کے نیچے لنگی ہی تو پہنتے ہیں۔

ساڑھی بھی ایک طرح سے اسی برادری سے ہے جس کا دو تہائی حصہ کمر پر لنگی کی طرح ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر باقی ایک تہائی حصہ فوراً پلو کی طرح کندھے یا سر پر ڈال لیا جاتا ہے۔

پاکستان میں شلوار پہلے زیادہ عورتوں کا پہناوا ہوا کرتی تھی یا پھر گاؤں کے پگڑی والے جاگیردار، وڈیرے، نمبردار اسے پہنتے تھے۔ لیکن صدر ضیا الحق نے شلوار سوٹ پہن کر اسے مردوں میں عام و دوام بخش دیا۔ اس فیشن کو آگے لے جانے کے لیے بعد میں نواز شریف نے بھی خوب ساتھ دیا۔ وہ کلف لگے شلوار سوٹ کے ساتھ بااعتماد امریکہ کا دورہ کیا کرتے تھے اور امریکن صدر کے بالمقابل بیٹھا کرتے تھے۔

لوگ اور سیاستدان شلوار سوٹ کو خوب کلف لگا کر پہن کر اکڑے پھرتے ہیں۔ جبکہ لنگی سادہ ہی رہتی ہے اور اسے پہننے والا بھی منکسر المزاج رہتا ہے۔

ویسے شارجہ میں پولیس نے گشت کے دوران ایک شخص کو لنگی پہننے کے جرم میں گرفتار کر لیا اور اس سے تفتیش شروع کر دی۔ پولیس افسران کا کہنا تھا کہ لوگوں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام میں شائستہ لباس پہن کر باہر آئیں۔ جبکہ اس شخص کا واویلا تھا کہ لنگی نے مجھے اوپر سے نیچے تک ڈھانپ رکھا تھا۔ میری ٹانگیں مکمل طور پر ڈھکی ہوئی تھیں۔ یہ مکمل طور پر شائستہ اور صاف تھی اور لنگی میرے آبائی وطن کا روایتی لباس ہے جسے اسے عام پہنا جاتا ہے۔

ہاں بھئی۔۔ اسی لیے تو بنگالی اور کیرالہ والے مہربان بنیان کے نیچے دھوتی پہن کر آرام سے بازار میں گھومتے ہیں۔

اب شلوار کتنی تمیز کے دائرے میں ہے اور لنگی غیر شائستہ، ان کے مداحوں کی تعداد کبھی کم نہ ہوگی۔ بہت سالوں غالباً صدیوں سے یہ دونوں پہناوے چلے آ رہے ہیں۔ ابھی تک کوئی بھی زمانہ، رواج اور فیشن انھیں مکمل آوٹ نہیں کر سکا۔ یہ بھی ثقافتی لباس کی طرح بڑے کروفر سے اپنی جگہ بنائے ہوئے ہیں کیونکہ ہر گھر میں ایک آدھ فرد ضرور لنگی پہننے والا مل جاتا ہے اور خاندانی تناسب اس سے بھی زیادہ۔ سو امید ہے کہ اسی طرح یہ دونوں رواج میں رہتے ہوئے آنے والے فیشن کو مقابلہ اور ٹکر دیتے رہیں گے۔

راشد حمزہ

حالتِ خاوندگی میں ایک دن

جب سے پاپا کو امی جی سے یہ سرگوشی کرتے ہوئے سُنا ہے کہ (دوہ ھم غم کوو) ''اس کا'' بھی ''بندوبست'' کرتے ہیں، تب سے میرے پاؤں کے چوہے ہاتھوں کے طوطے اور بالوں کے کوے اُڑ گئے ہیں، میری مظلومیت کی اس سے بڑی نشانی اور کیا ہوسکتی ہے کہ مجھے تواتر سے ''خاوندگی'' کے دورے پڑنے لگے ہیں، میں بری طرح خود کو ''خاوند خاوند'' محسوس کرنے لگا ہوں۔

تصورِ مستقبل میں ''خاوند'' کی جو تصویر دکھا رہا ہے وہ کچھ ایسی ہے کہ میں ''خاوند'' بنا ہوا ہوں، شکل بہت معصوم اور رحم کھانے والی ہے، میرے سر کے بال بوجہ بڑی ہیل والے جوتا زدگی صاف ہوچکے ہیں، ٹنڈ کے ناف پر ہیل کی نشانات واضح دکھائی دیتے ہیں، تنخواہ پر بیوی کی میک اپ کا خرچہ بھاری ہے، میں ایک بات کرتا ہوں بیوی تین سنانا ثواب سمجھتی ہیں، ضروریاتِ لازمیہ پوری کرنے کا بوجھ کیا کم ہے کہ بیوی کے نخرے اٹھانے کا وزن بھی کندھوں پر ہے، صبح فرمائشوں کی ایک فہرست دکھا کر جگایا جاتا ہے، خاوند جاگنے میں لیت ولعل سے کام لے لیں تو زوجہ محترمہ لحاف کھینچنے اور پانی چھڑکانے سے گریز نہیں کرتی، اس سے بھی کام نہ بنے تو خاوند نامدار کو بیڈ سے گھسیٹنے کا باقاعدہ عمل بھی سرانجام دیا جاتا ہے۔

ناشتہ تیاری بنانے کا ٹھیکہ بھی خاوند کی کارکردگی سے منسوب کیا گیا ہے، جس دن ایک چھوٹی سی فرمائش پوری نہ ہو، بیوی روٹھنے کا عمل شروع کرتی ہے، نتیجتاً خاوند کو اپنے لئے ناشتے کا اور اسے منانے کیلئے پاستے کا انتظام بھی کچن پوشی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

ناشتہ بنوانے اور زوجہ محترمہ کے منہ میں ٹھونسوانے کے بعد بیوی میک اپ کرنے سنگھار میز کے آگے بیٹھ جاتی ہے تو خاوند نامدار دفتر تیاری کیلئے کپڑے پریس کرنا شروع کردیتا ہے، خاوند اپنے کپڑے ختم کردیتا ہے تو ایک اور فرمائش دہانہ کھولے کھڑی ہوتی ہے، اپنے کپڑے پریس کرنے کا فرض ادا کرتے ہوئے بیوی خاوند پر ترس کھا کر ایک ادا سے جسے احسان کررہی ہو کچھ یوں کہتی ہے ''یار میرے بھی کرونا۔''

خاوند بیوی کے اس جملے سے ہواؤں میں اُڑنے لگتا ہے اسے ہر وہ رنگین خواب پھر دِکھنے لگتا ہے جو وہ زمانہ عاشقی معشوقی میں دیکھا کرتا تھا، کپڑے پریس کرنا جب ختم ہوجاتا ہے پر بیوی کے سنورنے کا عمل ابھی درمیاں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔

اب شوہر نہایت احترام کے ساتھ التجا بھری نظروں سے دفتر جانے کی اجازت طلب کرتا ہے تو بیوی کی آنکھوں میں خون کے قطرے تیرنے لگتے ہیں، یہ غصے کا شدید اظہار یہ ہوتا ہے، ساتھ ہی

دوتین عددطعنوں سمیت چندنا قابل اشاعت جملے ارشادفرما کرکہتی ہے، ''ارے دفتر میں تم نے کون سا تیر مارنا ہوتا ہے'' گھر کے تھوڑی اور چھوٹے موٹے کام پوری طرح کرنہیں سکتے چلتے ہیں دفتر کام کرنے''، اس کے ساتھ شوہر پر مظلومیت کے دوتین شدید دورے پڑتے ہیں، اور دل ہی دل میں بیشمار غلیظ ترین گالیاں نکالتا ہے جو کسی ڈکشنریوں میں ملنا ممکن نہیں۔

ایک حکم بجالانے کے بعد بیوی ایک اور حکم سناتی ہے کہ آجا میک اپ بنوانے میں ہاتھ بٹھا، شوہر نامدار کو اپنے کنوارے پن کا زمانہ یاد آجاتا ہے جب وہ شادی کے متعلق سوچا کرتا تھا کہ جب گلابو بیوی بن کر گھر آئیگی صبح جگانے و دیگر خدمات سرانجام دینے کے بعد دفتر نکلتے سے ٹکٹائی جب بندھوائے گی، اس کے دونوں ہاتھ میرے ٹکٹائی پر ہونگے اور میرے ہاتھوں کے گھیرے میں اسکی پتلی نازک سی کمر ہوگی، اسی سے میرے روں روں کانپ اٹھے گی، بدن میں بجلی جیسے 440 واٹ کا کرنٹ محسوس ہوگا یوں میں آہستہ آہستہ ہاتھوں کا گھیرا تنگ کرکے اسے قریب اور قریب لے آونگا اتنی قریب کہ پھر درمیاں میں رہے گا نہ کوئی فاصلہ، جب تک وہ ٹکٹائی باندھنے کا کام تمام کردے میں اسکے ہونٹوں کا رس پیئوں گا، تب وہ لجائے گی شرمائے گی ہچکچائے گی اور کہے گی کیا کر رہے ہو دفتر کیلئے دیر ہورہی ہے۔

ذمہ داری اور باس کی گالیاں یاد آتے ہی بددلی کیساتھ یہ پُرخمار رومانوی منظر تمام ہوگا، یوں میں دفتر کیلئے بخوشی نکلنے لگوں گا، شادی کے بعد بالکل برعکس ہورہا ہے، حکم بجالانے کی خاطر خاوند سنگھار میز کی قریب جاتا ہے، بیوی ان سے بال بنوائی کا حکم دیتی ہے، خاوند بال بنوانا شروع کردیتا ہے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہیں اسے سیدھا کرتے ہیں سٹریٹنر استعمال کرتا ہے لیکن اسکے دل میں ایک بھی رومانوی خیال رنگین خواہش نہیں گزرتا کیونکہ اب وہ فرائض ادائیگی میں مصروف ہے، فرائض ادائیگی ہمیشہ بوجھ رہتی ہے، آخرکار بیوی تیاری کا مرحلہ بخیریت اختتام پذیر ہونے کی بعد خاوند دفتر جانے کیلئے پھر حوصلہ کرکے اجازت طلب کرتا ہے، تو بیوی حکم صادر کرتی ہے کہ ساتھ جائیں گے۔

ممتاز افسانہ نگار کرشن چندر اپنی کہانی کا پانچ سو روپیہ معاوضہ لیا کرتے تھے۔
ایک مرتبہ اردو زبان کے دفاع کی تحریک کے سلسلے میں کرشن چندر نے بمبئی میں دوسرے اہلِ قلم کے ساتھ مختلف بینر لگائے
اگلے دن صبح سویرے ان کے ایک دوست نے آکر اطلاع دی کہ رات جن بینروں کو انہوں نے بڑی محنت سے لگایا تھا۔ فٹ پاتھ پر سونے والوں نے انہیں اتار کر بطورِ چادر استعمال کرلیا ہے۔
کرشن چندر نے دوست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا:۔ "یار صبح صبح تم نے پانچ سو روپے کا فائدہ کرادیا۔ مجھے ایک کہانی لکھنے کا موضوع مل گیا ہے۔

خاوند سوال طلب نگاہیں بیوی کی طرف اٹھاتا ہے بیوی معاملہ بھانپ لیتی ہے کہتی ہے راستے میں ''صغراں'' کا گھر پڑتا ہے میں وہاں انکے ہاں آنے والے نئے مہمان بچے کی مبارکباد دینے جا رہی ہوں۔ بیوی خاوند کیساتھ معاشی بدحالی کا نمونہ سوزوکی مہران میں بیٹھتی ہے، شوہر نامدار گاڑی سٹارٹ کرتا ہے ساتھ سوچتا رہتا ہے کہ کہاں بیوی کو ٹھکانے لگادوں، انہی سوچوں میں گُم ''صغریٰ'' کا گھر آپہنچتا ہے، بیوی ایک چیخ مار کر کہتی ''ارے دھیان کدھر رکھ چھوڑ آئے صغریٰ کا گھر آپہنچا ہے'' شوہر کو دھچکا اور جھٹکا سا لگتا ہے کانپتے کانپتے کار روکتا ہے، ایسی نظروں سے بیوی دیکھتا ہے جیسے قریب اسے لات مار کر گاڑی سے باہر نکالے گا، اِتنے میں بیوی ایک اور بم یہ کہہ کر گراتی ہے کہ ذرا پانچ سو دینا ساتھ فروٹ لیے جانا ہے، خاوند چارو نا چار یہ بھی کرتا ہے اور اپنی راہ ایسے لے لیتا ہے جسے جیل سے بھاگا ہوا قیدی۔

خاوند دفتر پہنچتا ہے حسبِ معمول اور حسبِ ذائقہ باس سے دو تین عدد گالیاں دفتری چائے سمجھ کر نکال لیتے ہیں، دن دفتر میں بغیر کام کی بیوی کی فرمائشیں پوری کرنے کی منصوبہ بندی کرنے میں گزر جاتا ہے، دفتر سے نکلتے ہی وہ قریبی مارکیٹ کی راہ لیتا ہے جہاں اسے بیوی کی فرمائشیں پوری کرکے خاوندگی کا فرض ادا کرنا ہے، بیوی کے سامانِ فرمائشیہ میں ہیئر سٹریٹنر، فیس پوڈر، فیس

کریم، فیس واش، مسکارا، پن کیک، اور آئی شیڈ وغیرہ خرید لیتا ہے، مارکیٹ سے نکلتا ہے تو ایک پھوٹی کوڑی جیب میں نہیں بچی، اب وہ یہ منصوبہ بندی کرنے لگتا ہے اگر راستے میں سی این جی ختم ہوجاوے تو کیا کریں گے، دھکے دے کر گاڑی کو گھر لے جایا جائیگا کہ گاڑی چھوڑ کر پیدل چلیں گے، اسی دوران صغراں کا گھر آ پہنچتا ہے، خاوند کے برے وقت کا آغاز خود اسکے ہاتھوں ہارن بجانے سے ہوتا ہے، بیوی صغریٰ کے گھر سے رخصت ہو کر کار میں آ بیٹھ جاتی ہے، سفر شروع ہوا چاہتا ہے، خاوند نامدار دل میں اپنے سے کہتا ہے ''میرا برا وقت تب چلتا ہے جب بیوی ساتھ ہوتی ہے'' یوں گھر آ جاتا ہے۔

خاوند نامدار اتر کر بیگم کی طرف کا دروازہ کھول دیتا ہے بیوی کے چہرے پر بادشاہت کے تازہ تازہ اثرات واضح ہوجاتے ہیں، خاوند کے جسم سے کمزور بے بس اور مظلوم رعایا کی سی بو آنے لگتی ہے، بیوی کمرے میں پہنچ کر ہی لیٹ کر ایک ہی فریاد کرنے لگتی ہے ''ہائے مڑہ شومہ'' ہائے میں مرگئی، یوں اس فریادِ بامراد کے ذریعے وہ رات کیلئے کھانا بنانے سے بری الذمہ ہوجاتی ہے، خاوند بیوگی کے فرائض کی انجام دہی شروع کرتا ہے، سب سے پہلے سالن پکاتا ہے پھر روٹی، کھانے کی گھڑی آتی ہے تو کھانا لے کر بیوی کے سامنے میز پر پروستا ہے دونوں اکھٹے کھانا کھاتے ہیں، بیوی میں سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ خاوند کو کبھی نوکر نہیں سمجھتی تبھی ساتھ کھانے پر اعتراض نہیں اٹھاتی۔

نوالہ ٹھونسائی کے عمل سے فراغت کے بعد بیوی ٹیلی ویژن آن کر کے ریسلنگ دیکھنا شروع کرتی ہے، بیوی ریسلنگ دیکھنے اور کھیلنے کی شوقین ہے اور کسی حد تک دیکھ دیکھ کر سیکھ بھی چکی ہے آج نجانے اسے کیوں سوجھی کہ شوہر سے ریسلنگ کھیلی جائے، شوہر نامدار باوجود سخت تھکاوٹ کے اس لئے حامی بھر لیتا ہے کہ دن کا حساب برابر کردے، دونوں سٹارٹ ہوجاتے ہیں، شوہر نامدار کے ناتجربہ کاری کیوجہ سے تمام مکوں کے ایٹم بم خالی جاتی ہے، پھر بیوی شروعات کرتی ہے اور ابتدائی مکا شوہر کے منہ اور ناک پر ایسا لگتا ہے کہ وہ یکدم گر کر بیہوش ہوجاتا ہے۔

سید ممتاز علی بخاری

گرل فرینڈ

میرے احباب عموماً مجھ سے شکوہ کناں رہتے ہیں کہ میں نے گرل فرینڈ جیسی کوئی شے کوئی نہیں پال رکھی۔ میں ان سے ہمیشہ یہ عرض کرتا ہوں: جناب! گرل فرینڈ کی آخر ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گرل فرینڈ انسان کو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر موقع پر کام آتی ہیں۔ آپ کا بیلنس ختم ہو جائے تو ایک مختصر سے پیغام پر آپ کے موبائل کا پیٹ بھر جائے گا۔

آپ کوئی شے خریدنا چاہتے ہوں لیکن آپ کا جیب خرچ اجازت نہ دیتا ہو تو آپ اپنی گرل فرینڈ سے بطور گفٹ طلب کر سکتے ہیں۔ آپ اکیلے بیٹھے تنگ ہو رہے ہوں تو ایک کال یا میسج کی دوری پر آپ کی بوریت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آپ کی فضولیات اگر کوئی نہیں سنتا تو آپ کی گرل فرینڈ کی حسِ سماعت حاضر ہے۔ گرل فرینڈ بہت ہی مددگار ہتھیار ہوتی ہے۔ اگر آپ کی گرل فرینڈ کسی بااثر خاندان کی ہو پھر کبھی آپ کا کوئی کام کسی افسر کے ہاں نہیں پھنسے گا۔

گرل فرینڈ بھی دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کھانے والی اور دوسری کھلانے والی۔ کھلانے پلانے والی گرل فرینڈ ہمیشہ نقصان میں رہتی ہے۔ اس سے بیلنس منگوا کر اور دوسرے اخراجات حاصل کر کے اس کا محبوب اکثر دوسری لڑکیوں سے گلچھرے اُڑاتا رہتا ہے۔ مشکل اوقات میں جب بیوی بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے ایسے میں انسان گرل فرینڈ کا ہی سہارا تلاشتا ہے۔ چپ شاہ کہتے ہیں کہ اگر آپ گرل فرینڈ کو ایک سو روپے کی خریداری کروائیں تو وہ پوری زندگی آپ کی ممنونِ احسان رہے گی لیکن بیویاں جن کے ہاتھ پر انکے شوہر اپنی پوری تنخواہ رکھ دیتے ہیں وہ پھر بھی ناشکری کرتی رہتی ہیں۔ لوگ گرل فرینڈ کی تعداد کو اسی طرح باعثِ برکت سمجھتے ہیں جیسے زمانہ جاہلیت میں کثرتِ اولاد کو منبعِ قوت سمجھا جاتا تھا۔

ایک دفعہ چپ شاہ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں جس گاڑی پر وہ سوار تھے۔ اس مین ان سے پچھلی نشست پر بیٹھی دو لڑکیاں ایک دوسری کو زبردستی شاہ جی کی زوجیت کی سعادت نصیب کروانے کی کوششیں کر رہی تھی۔ جب کافی دیر ان کی جنگ ختم ہونے کے آثار نظر نہ آئے تو چپ شاہ نے ان کی طرف رخ موڑا اور کہنے لگے: "آپ آپس میں کیوں اُلجھ رہی ہیں؟ میں آپ دونوں سے بیک وقت شادی کے لیے تیار ہوں۔ اسلام نے تو چار شادیوں کی اجازت دے رکھی ہے۔"

گرل فرینڈ وہ افیون ہوتی ہے جو بدخوابی کے مریضوں کو بے خوابی کی گولی دیتی ہیں اور یوں ہر دو خاتون وحضرت شب بیداری کر کے اپنی نیکیوں میں روز افزوں ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ اب

آپ سے کیا پردہ۔۔۔ہمارے دوست اور مشہور مفکر چپ شاہ نے بھی گرل فرینڈ کا ایک جوڑا رکھا ہوا ہے۔ہم نے ایک روز اعتراض کیا۔ہمیں اعتراض اس بات پر نہیں تھا کہ انہوں نے کیونکر گرل فرینڈ کی مصیبت پال رکھی ہیں بلکہ ہم اس بات پر حیران تھے کہ بیک وقت دو گرل فرینڈز سے وہ کیسے نبھا کر پاتے ہیں۔کہنے لگے: بخاری صاحب! ہم اہلِ ایمان ہیں اور بقولِ اقبال اہل ایمان کی نشانی یہ ہے

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

وہ گرل فرینڈ جو انسان کی جان ہوتی ہے شادی کے بعد وبالِ جان بن جاتی ہے غالباً جنرل ایوب خان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا تبھی تو وہ بے اختیار پکار اُٹھے "FRIENDS , NOT MASTERS"۔

اس حوالے سے ہم کافی بدقسمت واقع ہوئے ہیں۔جب ہم یونیورسٹی کے ہاسٹل منتقل ہوئے تو وہاں جو معمولات جاری تھے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ ہر رات نو بجے کے بعد پورے ہاسٹل میں بستروں پر، کرسیوں پر، باہر لان میں، کینٹین پر۔۔۔غرض کوئی جگہ ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں کوئی نہ کوئی اپنی گرل فرینڈ سے پیکج پر لمبی لمبی باتیں نہ کر رہا ہوتا۔

خدا معاف فرمائے ان موبائل کمپنیوں کے مالکان کو جن کے باعث ہمارے ہاسٹل کا سکون نہ جانے کہاں کھو گیا تھا۔پہلے پہل تو ہم ملاں فضیحت کا کردار نبھاتے ہوئے چار سُو پند و نصائح کرتے پھرا کرتے لیکن آخر کب تک۔۔۔؟؟؟ آخر کار تنگ آ کر ہم نے اپنے ہم کمرہ حضرات سے پُر امن بقائے باہمی کے اصول کے تحت درخواست کی کہ آپ یا تو ہمارے سامنے پیکج نہ لگایا کریں کیوں کہ اس طرح ہم اپنے آپ کو ایک مجرم گرداننے لگتے ہیں اور گلٹی محسوس کرتے ہیں یا پھر بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے ہمیں بھی ایک عدد گرل فرینڈ عنایت فرمائی جائے۔دوستی کی خاطر جان دینے کی بات کرنے والے دوستوں نے دو دو تین تین گرل فرینڈز ہونے کے باوجود ہمیں یہ سہولت میسر کرنے سے انکار کر دیا

ایک زمانہ تھا کہ فلمی دنیا اس طرح سے ایک طلسماتی دنیا نظر آتی تھی کہ شوٹنگ دیکھنے کا شوق ہر شخص کو ہوتا تھا۔اکثر باریش اور مذہبی حضرات بھی اس خواہش پر قابو نہیں پا سکے ایک بار اتفاق سے ماہر القادری صاحب اپنے اس شوق کی تسکین کے لئے کسی کے ساتھ اسٹوڈیو پہنچ گئے کہ وہاں ان کا جاننے والا کون ملے گا۔اتفاق سے اسی دن شورش کاشمیری بھی پہلی مرتبہ شوٹنگ دیکھنے پہنچے اور دونوں کی ملاقات ہوئی تو ماہر القادری نے ہنستے ہوئے فی البدیہہ یہ شعر کہا

دل لگانے کا جہاں موقع بھی تھا کوشش بھی تھی
ہائے وہ محفل جہاں شورش بھی تھا شورش بھی تھی

اور اپنے معمول سے بھی باز نہیں آئے۔پھر ہم جتنا عرصہ ہاسٹل میں قیام پذیر رہے ''کتابوں'' کو گرل فرینڈ بنائے رکھا لیکن میرے دوستوں کا کہنا تھا کہ کتابیں گرل فرینڈ نہیں ہو سکتیں۔

ہاسٹل کے دور میں جب ہم سب دوست اکٹھے بیٹھے چائے پی رہے ہوتے یا پھر کہیں سیر سپاٹے کے لیے نکلتے تو وہاں ہمیں ایک عجیب سی صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا۔ہمارا کوئی نہ کوئی مہربان ہماری اس محرومی کا ذکر کرتا اور پھر سب مل کر حسبِ توفیق ہمیں اس کمی کا جی بھر کر احساس دلاتے اور پھر اپنے اپنے تجربات سے روشناس کرواتے۔

کچھ حضرات تو اپنے تو اپنے ''سُسر فرینڈ'' کے حوالے سے بھی من گھڑت باتیں اور ''ساس فرینڈ'' کی دعائیں اور پیار ہمارے سامنے یوں جتاتے کہ کبھی کبھی ان کی اور اکثر اوقات ہماری آنکھوں سے آنسو ایک سَیل رواں کی طرح جاری ہو جاتے۔پھر کچھ یوں ہوا کہ جب بھی ہمیں ہمارا کوئی دوست ملتا یا وہ ہمیں کہیں دیکھتا تو اپنے ساتھ چلنے والے لوگوں کو ہماری طرف متوجہ کر کے بتاتا: ''بھائی! اُس کو دیکھو، بے چارے کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔'' پھر اس کے سارے ہمراہی ہمارے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے لگتے۔اکثر اوقات تو فٹ پاتھ پر بیٹھے بھکاری بھی ہم پر ترس کھا کر مفت میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنی

بارگاہ سے ہمیں ایک گرل فرینڈ عطا فرمائے۔ پھر تو انتہا ہی ہوگئی لڑکیوں نے ہمیں راہ چلتے دیکھ کر آپس میں کُھسر پُھسر کرنی شروع کردی۔

شاید اس طرح یہ سب مل کر بھی ہمیں ہمارے ''اصولی'' مؤقف سے ہٹا نہ سکتے لیکن ایک حادثے نے سب کچھ زیروزبر کر دیا اور پھر ہم کسی اور کی ''گرل فرینڈ'' بن گئے۔ ''کسی اور کی گرل فرینڈ''۔۔۔۔یقیناً ان الفاظ سے آپ بھی چونک گئے ہوں گے۔ واقعہ کچھ یوں ہوا کہ ہمارا ایک دوست حیدرآباد کا رہنے والا تھا۔ ہماری آپس میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک روز فون پر کہنے لگا: یار! میرا ایک لنگوٹیا مجھ سے کسی لڑکی کا نمبر مانگ رہا تھا جسے وہ اپنی گرل فرینڈ ہونے کا اعزاز بخشے۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ میں اس کی یہ معصوم سی خواہش کیسے پوری کرتا؟ اب دوست کی حیثیت سے اس کے کام آنا ضروری تھا سو میں نے اسے آپ کا نمبر بھیج دیا ہے یہ کہہ کر کہ یہ ایک لڑکی کا نمبر ہے۔

اب آپ سے درخواست ہے کہ اس سے لڑکی بن کر کچھ عرصہ گپ شپ کرو۔ جب اس کا جنون کچھ کم ہوا تو میں اسے اصل صورتِ حال سے آگاہ کردوں گا۔ ہم نے معذرت کرتے ہوئے کہا: یہ عمل نہ صرف دھوکہ دہی کے زمرے میں آتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ آواز کی جنس کا بدلاؤ کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ وہ کہنے لگا: آپ میسجز کے ذریعے رابطہ کرنا۔۔۔ اور اب کچھ نہیں ہوسکتا کیونکہ میں نے اُسے تمہارا نمبر دے دیا ہے۔ بالآخر اُس کے مسلسل اور پُرزور اصرار پر ہم اُس نامعلوم کے ''گرل فرینڈ'' بن گئے۔ پھر مت پوچھیے کیا ہوا؟ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا اور ہم خود دیگ کے مزے لے رہے تھے اور ہمارا ''عاشق'' ایک چمچے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا اور ہمارا وہ دوست منظرِ عام سے غائب ہوچکا تھا۔

ذوالفقار علی بخاری (برادر محترم سید احمد شاہ بخاری پطرس) ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل تھے، بخاری صاحب جیسا حاضر دماغ اور اعلیٰ پایہ کا بذلہ سنج مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ لطیفہ گوئی، پھبتی، شوخی، شرارت ان کی شخصیت کا اٹوٹ حصہ تھے۔

ایک روز بخاری صاحب کو اس وقت کے سیکرٹری اطلاعات نے فون کیا اور کہا کہ ایک بڑے عالم دین نے شکایت کی ہے کہ جس کار میں صبح سویرے انہیں درس قرآن کے پروگرام کے لیے لیا جاتا ہے، اس گاڑی میں سارنگی نواز بندو خان بھی بیٹھے ہوتے ہیں۔

بخاری صاحب کو آرٹسٹوں اور فنکاروں سے جس قدر محبت اور لگاؤ تھا، اس کے پیش نظر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے دل پر یہ اعتراض سن کر کیا گزری ہوگی۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، صرف یہ کہا کہ میں دیکھتا ہوں۔ چار چھ دن بعد پھر وزارت کے سیکرٹری نے دریافت کیا کہ ''آپ نے اس سلسلے میں کیا کیا؟''

بخاری صاحب نے فی الفور جواب دیا ''میں نے معافی مانگ لی ہے۔''

''لیکن مولانا تو کل مجھ سے پھر شکایت کر رہے تھے؟'' اُنہوں نے بتایا۔

''جی۔۔۔لیکن میں نے تو استاد بندو خان سے معافی مانگی ہے۔''

سیکرٹری یہ بات سن کر سناٹے میں آ گیا۔

تب بخاری صاحب نے بڑی سنجیدگی سے کہا کہ ''جناب عالی اس ملک میں بندو خان کے پائے کا سارنگی نواز کوئی دوسرا نہیں، ان کی جس قدر و منزل کی جائے، کم ہے۔ مولانا کے ہم پلہ تو اور بھی مل سکتے ہیں۔''

(آغا ناصر کی کتاب ''گمشدہ لوگ'' سے ماخوذ)

حماد احمد، لاہور

خرّاٹے

خرّاٹا دراصل ایک ایسی سریلی اور ''خرخراتی'' آواز کو کہا جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کے حلق سے سوتے وقت برآمد ہوتی ہے۔ یہ وہ منفرد اور جادوئی آواز ہوتی ہے جسے نکالنے والا بذات خود نہیں سن پاتا۔ آسان الفاظ میں اس ''ساز'' کے متعلق آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ:۔

جس نے بھی یہ ساز بجایا
خود نہ سنا اوروں کو سنایا

آپ کسی خراٹا مار شخصیت سے یہ بات کہہ کر دیکھیں کہ میں گزشتہ رات آپ کے شدید ترین خراٹوں کی وجہ سے بالکل نہ سو سکا۔ فوری طور پر آپ کو جواب سنائی دے گا کہ کیا میں واقعی خراٹے مار رہا تھا؟ اگرچہ خراٹے مارنے والے لوگ اپنے خراٹوں کی ''خوفناک خرر خرر'' نہیں سن پاتے، لیکن اگر ان کے پاس بیٹھ کر لیز چپس کا پیکٹ کھولا جائے تو اس کی ''دلنشین کھر رکھرر'' سے فوری طور پر ان کی نیند اڑ جاتی ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ خراٹے مارنے کے دوران ''قوت سماعت'' میں کسی بھی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ یہ محض خراٹوں کی انفرادیت ہے کہ خراٹا مار شخص بذات خود اپنے خراٹوں سے فیض یاب نہیں ہو پاتا۔

انسانی نیند کی مثال کسی شدید ترین نشے کی طرح ہوتی ہے۔ چارپائی یا بیڈ اس نشے کے ''سپلائر'' کی طرح ہوتے ہیں۔ اور آپ کے قریب سوئے ہوئے ''خراٹا مار شخص'' کا خراٹا، ایک ایسے پولیس افسر کی طرح ہوتا ہے، جسے آپ کی نیند کے نشے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہو۔۔

کچھ لوگوں کے خراٹے اس قدر شدید ہوتے ہیں کہ ان کے خراٹوں کی توانائی سے جنریٹر بھی چلایا جاسکتا ہے۔ یوں نہ صرف اس ''خرکی توانائی'' سے گھر کے پنکھے، اے سی اور بلب وغیرہ با آسانی چلا کر لوڈ شیڈنگ سے دائمی نجات حاصل کی جاسکتی ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ بجلی کے بڑھتے ہوئے بلوں سے بھی خود کو محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

شدید ترین خراٹوں کی طاقت کے ساتھ ساتھ ان کی آواز کی شدت بھی عموماً کسی انجن یا جنریٹر کی طرح ہی ہوتی ہے۔ ایک موٹر مکینک کو سوتے میں خراٹے لینے کی عادت تھی۔ خراٹوں کے دوران یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ریکٹر سکیل پر ان کے خراٹوں کی شدت ''بارہ'' کے ہندسے کو بھی کراس کر گئی ہے۔ ایک دن موصوف نے سوتے ہوئے کروٹ بدلی تو خراٹے کی آواز آنا بالکل ہی بند ہو

گئی۔ ان کا بیٹا پریشان ہو کر ماں کی طرف بھاگا اور بولا: ''اماں اماں۔۔! ابا کا انجن بند ہو گیا ہے''۔

کچھ لوگوں کے خراٹوں کا شور تو جیٹ فائٹر طیاروں کی گونج سے بھی زیادہ شدید ترین ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے خراٹوں کی آواز کے سامنے واشنگ مشین، ٹریکٹر یا ریل گاڑی تک کی آواز اپنے کان پکڑ پکڑ کر پناہ مانگتی ہے۔ ایسے ''عظیم الشان'' افراد اپنے خراٹوں پر مغرور ہوتے بھی نظر آتے ہیں اور دیگر ''خراٹا مار'' لوگوں کے خراٹوں کو محض ''مکھیوں کی بھنبھناہٹ'' سے ہی تشبیہہ دیتے نظر آتے ہیں۔

جیسے تالی ایک ہاتھ سے بجنے کی بجائے دونوں ہاتھوں سے ہی بجتی ہے، اسی طرح خراٹے بھی ہمیشہ کسی ''ٹو وے'' روڈ کی طرح ''دو طرفہ'' ہی چلتے ہیں۔ خراٹا مار شخص اپنی سانس منہ کے اندر کی طرف کھینچنے اور باہر کی طرف خارج کرنے کے دوران بالکل الگ اور منفرد قسم کی آوازیں نکالتا ہے۔ کسی امیر ترین تاجر کے متعلق مشہور ہے کہ چوروں کے خوف نے اس کی رات کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ جب اس نے اپنی یہ پریشانی دوسرے تاجر دوست کو بتائی تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ خراٹے لینے کی ایک خاص مشق کرے۔ وہ اس طرح کہ منہ کے اندر کی طرف سانس کھینچتے ہوئے ''کوووون'' اور منہ کے باہر کی طرف سانس خارج کرتے ہوئے ''ہیہے'' کی آواز نمودار ہو۔ یوں مستقل ''کووووووووون ہیہیہے، کون ہے، کون ہے'' کی آوازیں برآمد ہونے سے چور تمہارے نزدیک آنے کی حماقت بالکل نہیں کر پائے گا۔ امیر تاجر نے اپنے دوست کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے خراٹوں کو ''ماڈریٹ'' کیا۔ یوں اس کے ہاں چوریوں کے واقعات پیش آنا بند ہو گئے۔

جس کمرے میں دو یا دو سے زیادہ افراد خراٹے مارتے ہوئے سو رہے ہوں تو ان کے مشترکہ خراٹوں کی گونج ماحول پر ایک ''روحانی وجد'' کی کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ دائیں طرف سے اگر ''خوڑڑڑااں خواں خواااااں ں ں'' کی آوازیں برآمد ہو رہی ہوں تو بائیں طرف سے ''خاؤں خاؤں خاؤں خاؤں'' کی

مشہور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی ریل میں سفر کر رہے تھے۔ دورانِ سفر ٹکٹ چیکر نے ان سے ٹکٹ مانگا تو بیدی صاحب نے اپنی جیبیں ٹٹولیں مگر ٹکٹ کا پتا نہیں تھا۔

ٹکٹ چیکر بیدی صاحب کو پہچانتا تھا۔ کہنے لگا ''مجھے آپ پر بھروسہ ہے، آپ نے یقیناً ٹکٹ خریدا ہوگا''

بیدی صاحب پریشانی سے بولے ''بھائی! بات آپ کے بھروسے کی نہیں، مسئلہ تو سفر کا ہے۔ اگر ٹکٹ نہ ملا تو یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ مجھے اُترنا کہاں ہے۔؟''

آوازیں بھی ساتھ ہی برآمد ہو رہی ہوتی ہیں۔ دونوں کی مشترکہ آواز یعنی ''خاؤں خواں خاؤں خواں'' سن کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ نے خراٹے مارنے والی شخصیات سے چپ کرنے کی فرمائش کی ہو اور وہ دونوں شخصیات مشترکہ طور پر، آپ کی فرمائش کا پنجابی زبان میں کچھ یوں جواب دے رہی ہوں کہ ''کیوں کراں؟۔۔ کیوں کراں؟'' (کیوں کروں؟۔۔ کیوں کروں؟)۔

خراٹوں کی سب سے زیادہ شکایات بیگمات کی طرف سے اپنے شوہروں کے لئے ہی ہوتی ہیں۔ دراصل شوہر ایک ایسی مخلوق کا نام ہے، جو تکیے پر سر رکھنے کے دو منٹ بعد ہی اپنے منہ سے ایسی ایسی آوازیں برآمد کرتا ہے جیسے کوئی ڈبل ڈیکر بس زیادہ لوگوں کے بوجھ کی بدولت عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے چلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ منہ سے نکلنے والی یہ عجیب و غریب آوازیں دراصل خراٹوں کی ہی ہوتی ہیں۔

ایسے شوہر حضرات کے سامنے جب بیگم، کسی جج کی حیثیت سے ''فردِ جرم'' عائد کرتی ہیں تو موصوف اس کا صاف صاف انکار کر دیتے ہیں۔ ''حکمت و بصیرت'' کا عملی نمونہ بنتے ہوئے بیگم صاحبہ بھی فوراً ان کا انکار تسلیم کر لیتی ہیں۔ اگلے ہی دن بیگم صاحبہ دوبارہ ''ایمرجنسی عدالت'' نافذ کر دیتی ہیں اور اپنے شوہر کو موبائل کیمرے کے ذریعے بنی ہوئی وہ ویڈیو دکھاتی ہیں، جس میں انہوں نے گزشتہ رات ہی شوہر کے خراٹوں کے خوفناک مناظر محفوظ کئے

پاپ بیتی

مشتاق احمد یوسفی نے کسی کی آپ بیتی احمد فراز کو بذریعہ ڈاک بھجوائی۔ ساتھ میں ایک سطری رقعہ لکھا۔

''مطلوبہ آپ بیتی ارسال خدمت ہے۔ سائیں آپ اپنی ''پاپ بیتی'' کب لکھ رہے ہیں؟''

ہوتے ہیں۔ تب کہیں جا کر شوہر حضرات کو اپنا جرم تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ سمجھدار شوہر حضرات اپنا جرم ثابت ہونے کے بعد، ''جج'' کی طرف سے سزا سنائے جانے سے قبل، از خود ہی باعزت طریقے سے کان پکڑ لیتے ہیں۔ مگر چند شوہر تو جرم ثابت ہونے پر بھی ''سمارٹ'' بننے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ ''بیگم صاحبہ! آپ کی ویڈیو جھوٹ نہیں ہو سکتی لیکن دراصل میں ان آوازوں خراٹے نہیں مارتا بلکہ خواب میں خود کو سائلنسر نکلی ہوئی موٹر سائیکل سمجھ کر، اپنے منہ سے اس جیسی آوازیں نکالنے کی کوشش کرتا ہوں''۔

ایک خراٹوں سے متاثرہ خاتون تو اپنے شوہر کو خراٹوں کے علاج کے لئے ملک کے مشہور و معروف سرجن کے پاس بھی لے گئیں۔ ڈاکٹر اس کے شوہر کو آپریشن تھیٹر کے اندر لے گئے۔ دو گھنٹے مستقل آپریشن کرنے کے بعد جب ڈاکٹر صاحب تھیٹر سے باہر نکلے تو انتہائی افسردگی سے بولے کہ ''محترمہ! ہم معذرت خواہ ہیں کہ ہم جو کچھ کر سکتے تھے، ہم نے کیا۔ ہم نے نہ صرف انجیو پلاسٹی کی بلکہ ساتھ ہی ساتھ لیزر سرجری بھی کر لی۔ اگر ایک والو تبدیل کیا تو ساتھ ہی ساتھ ایک سٹنٹ بھی ڈال دیا۔ لیکن افسوس کہ تمہارا شوہر اب بھی کسی برفانی سنڈے کی طرح ہی خراٹے مارتا ہے''۔

خواتین تو اپنے شوہروں کے خراٹوں کی اس قدر عادی ہو جاتی ہیں کہ اگر شوہروں کے خراٹوں کی آواز آنا بند ہو جائے تو اس کے ناک کے قریب اپنی انگلی لے جا کر چیک کرتی ہیں کہ اندر سے ''ہوا'' بھی برآمد ہو رہی ہے یا نہیں۔ دیگر الفاظ میں وہ یہ چیک کر رہی ہوتی ہیں کہ کیا موصوف ابھی سانس لے رہے ہیں یا پھر ترکے کی صورت میں میرے مالی لحاظ سے مضبوط ہونے کا وقت آ گیا ہے؟۔

بہت سی بیگمات اپنے شوہروں کے خراٹوں کے حوالے سے مجبوراً صبر بھی کر لیتی ہیں، مگر شک و شبہ ان کے دل سے کبھی بھی نہیں نکل پاتا۔ ایسی خواتین انتہائی غور سے اپنے میاں کے خراٹے سنتی ہیں کہ کہیں میاں صاحب اپنے خراٹوں کے اندر بھی کوڈ ورڈز میں ''کسی اور'' کا نام تو نہیں لے رہے؟۔

آج کل تو ضرورت رشتہ کے اشتہار بھی کچھ اس طرح سے آنے لگے ہیں کہ ہماری خوب صورت و خوب سیرت بچی کے لئے انتہائی نیک اور پرہیز گار لڑکے کا رشتہ درکار ہے۔ لڑکا اس قدر پرہیز گار ہو کہ خراٹے مارنے سے بھی پرہیز کرتا ہو۔ ایسے اشتہارات دینے والے شاید یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دو طرح کے مرد دنیا میں مشکل ہی ملتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے گندی اور بدبودار جرابیں زیب تن نہ کر رکھی ہوں اور دوسرے وہ جن کے خراٹوں کی گونج بہت زیادہ نہ ہو۔

عمومی طور پر ناؤ ہی ندیا میں ڈوبتی ہے لیکن صوفی غلام تبسم مرحوم نے اپنے کتابچہ ''جھولنے'' میں ''ناؤ میں ندیا ڈوب چلی'' کی خبر بھی سنائی تھی۔ ''ناؤ میں ندی ڈوبنے'' کی ہی طرح، کبھی کبھار مرد حضرات بھی اپنی بیگم کے خراٹوں سے متاثر ہوتے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ''دہشت گردی'' کے ایسے واقعات کم کم ہی وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ بیگم کے خراٹوں کے حوالے سے شکوہ کرتے ہوئے ایسے ہی ایک ''میاں'' کی ترجمانی سلمان گیلانی نے اپنے اشعار میں کچھ یوں کی ہے۔

کمرے میں تھی خراٹوں کی کھڑ کھڑ متواتر
ناسیں تیری بجتی رہیں پھڑ پھڑ متواتر
سوتے میں بھی تکتی رہی لڑنے کے تو سپنے
تھی نیند کی حالت میں بھی بڑ بڑ متواتر

ہاسٹل میں روم میٹس کے حوالے سے بھی بہت سے لوگ خراٹوں کی شکایات کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسے روم میٹس کے

حوالے سے استاد بشیر چار عدد انتہائی مفید حل بتایا کرتے ہیں۔
پہلا حل تو یہ ہے کہ آپ کسی بہانے سے اپنا کمرہ تبدیل کرلیں۔
دوسرا حل یہ ہے کہ آپ ہاسٹل میں جس مقصد کے لئے رہائش پذیر ہیں، اس مقصد کی ہی قربانی دے کر اپنے گھر واپس تشریف لے جائیں۔ تیسرا حل یہ ہے کہ آپ اپنے روم میٹ سے انتہائی شدید ترین لڑائی کریں۔ لڑائی اس قدر شدید ہونی چاہئے کہ آپ دونوں میں سے کسی نہ کسی کا تھوڑا سا خون جسم سے باہر ضرور نکل آئے۔ زخمی شخص کو ''ابتدائی طبی امداد'' دینے کے بعد، ہاسٹل انتظامیہ آپ دونوں کو خود بخود ہی الگ الگ کردے گی۔ اگر مندرجہ بالا تین آپشنز میں سے کسی بھی آپشن پر عمل درآمد مشکل یا ناممکن محسوس ہو تو آپس میں مل بیٹھ کر مذاکرات کریں اور دونوں اپنے اپنے سونے کے اوقات ایک دوسرے سے الگ الگ مقرر کرلیں۔

ایک ہاسٹل میں رہائش پذیر دوست نے بتایا کہ انہوں نے رات کے آخری پہر چند دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر ایک شدید ترین خراٹے مارنے والی شخصیت کی چارپائی کو اٹھایا اور نزدیکی قبرستان کی طرف لے گئے۔ قبرستان کے بالکل ساتھ ہی مسجد تھی۔ فجر کی جماعت ختم ہوئی تو مسجد سے نکلنے والے نمازی بھی ''جنازہ'' سمجھ کر چارپائی کے اردگرد اکٹھے ہونا شروع ہوگئے۔ جب نمازیوں کی اچھی خاصی تعداد اکٹھی ہوگئی تو ہاسٹل کے تمام دوست مکھن میں سے بال کی طرح، ہجوم سے باہر نکل آئے۔ مسجد کے مولوی صاحب اور تمام نمازی یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہے کہ آخر یہ کس شخصیت کا جنازہ ہے؟۔ اور تدفین کے لئے قبر کی کھدائی بھی کیوں نظر نہیں آرہی؟۔ جیسے ہی ایک صاحب نے ہمت کرکے ''مرحوم'' کے چہرے سے چادر ہٹائی تو ساتھ ہی چیخ مار کر بولے:۔ ''مرحوم بدقسمتی سے زندہ ہیں۔ یا شاید ڈائریکٹ دوزخ میں پہنچ چکے ہیں۔ کیونکہ انتہائی کراہت ناک آوازان کے حلق سے برآمد ہورہی ہے''۔ چیخ وپکار سن کر چارپائی والے حضرت کو بھی ہوش آگیا۔ کچھ دیر تو انہیں اپنے ''محل وقوع'' کو سمجھنے میں لگ گئی۔ مگر جیسے ہی اس بات کا ادراک ہوا کہ ان کی نماز جنازہ ادا ہونے لگی ہے تو موصوف چارپائی سے نکل کر نو دو گیارہ ہوگئے۔۔

خراٹوں کی مدد سے یہ بات بھی معلوم کی جاسکتی ہے کہ کس جگہ پر کون کون سورہا ہے اور کون کون جاگ رہا ہے۔ دراصل خراٹے مارنے والا شخص خود تو خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوتا ہے، مگر ان کے گھر والے اور اردگرد کے لوگ شب بھر ''نجم شماری'' کا فریضہ ہی انجام دیتے رہتے ہیں۔ خراٹوں کے شور کے اندر بھی اگر کوئی سورہا ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ کسی ماہر اداکار کی طرح ''ڈرامہ'' کررہا ہے۔

کئی لوگوں کے خراٹوں کی آوازیں ان کے گھر سے باہر بھی دور دور تک سنائی دے رہی ہوتی ہیں۔ دیگر گھروں کے بچے تنگ آکر ان کے گھر کے باہر ''فلڈ لائٹ کرکٹ'' کھیلنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ جب خراٹا مار شخصیت کی نیند بھی بچوں کے کھیلنے کی وجہ سے خراب ہوجاتی ہے تو باہمی مذاکرات اس شرط پر کامیاب ہوتے ہیں کہ ''تم اپنے خراٹے بند کرو، اور ہم اپنی کرکٹ ختم کرلیتے ہیں''

ایک صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے کرائے پر مکان حاصل کیا۔ چند دنوں کے بعد ایک شخص ان کے گھر آیا اور گزارش کی کہ آپ کو اپنا نیا پڑوسی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ لیکن پلیز آپ خراٹے ذرا آہستہ مارا کریں کیونکہ آپ کے خراٹوں سے میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ جب ان صاحب نے آنے والی شخصیت سے تعارف پوچھا تو جواب ملا کہ: ''جناب! میں رات کو آپ کے محلے میں چوکیداری کی ذمہ داریاں نبھاتا ہوں''۔

مجاز سخت بیمار تھے۔ ہسپتال میں دوستوں کا ایک گروہ عیادت کے لئے پہنچا۔
ایک نے کہا ''مجاز زندہ باد۔ اب تم ٹھیک ٹھاک نظر آتے ہو۔''
دوسرے نے کہا ''تمہارے چہرے پر سرخی جھلک رہی ہے۔''
تیسرے نے کہا ''خدا کا شکر ہے کہ آنکھوں میں پرانی چمک عود کر آئی ہے۔ اب تم بالکل صحت مند دکھائی دیتے ہو۔''
مجاز نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا ''مسرت ہے کہ میں تندرستی کی حالت میں مر رہا ہوں۔''

خراٹے مارنے والی شخصیات کے ساتھ آرام کرنے والوں کو ڈھیروں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر ''خراٹا متاثرین'' کی پہلی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ خراٹا مار شخصیات سے پہلے ہی نیند کی میٹھی وادیوں میں کھو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے نیند کی گولیوں کا استعمال، رات کا کھانا جلدی کھا لینے اور بیڈ پر ایک گھنٹہ جلدی پہنچ جانے، جیسی آپشنز کا بھرپور استعمال کیا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے تمام تر احتیاط کے باوجود عموماً خراٹا مار شخصیت کی طرف سے ''داغا'' گیا پہلا خوفناک خراٹا ہی ''مہلک'' ثابت ہوتا ہے اور آپ کے کان کے ''ہدف'' سے جاٹکراتا ہے۔ یوں آپ کی نیند بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ آپ خراٹا مار شخصیت کو جتنی مرتبہ مرضی کہنیوں کی ضربیں مار لیں، ان کی نینداور خراٹوں پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ البتہ کچھ دیر بعد آپ کی کہنیوں میں درد ضرور شروع ہو جائے گی۔ انتہائی شدت کی بے بسی تب محسوس ہوتی ہے، جب خراٹا مار شخصیات نیند کے دوران اپنی سائیڈ یعنی نیند کی پوزیشن تبدیل کرنے کے باوجود خراٹے مارنا ختم نہیں کرتے۔ یہ منظر دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نان سٹاپ ٹرین کسی چھوٹے سے سٹیشن کے اندر سے گزرنے کے باوجود رکے یا آہستہ ہوئے بغیر تیزی سے آگے کی جانب رواں دواں ہوگئی ہو۔

کسی کے خراٹے ختم کرنے کا سب سے آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ ایک تکیہ پکڑیں اور اسے خراٹے مارنے والی شخصیت کے ناک پر رکھ کے زور سے نیچے کی طرف دبائیں۔ جب تک خراٹوں کی آواز ختم نہ ہو جائے، تب تک یہ عمل جاری رکھیں۔ جیسے ہی خراٹوں کی آواز بند ہو جائے تو ''تکیہ'' سمیت پولیس سٹیشن جائیں اور ''اقدام قتل'' کے جرم کا اعتراف کر لیں۔

ایک اور طریقہ یہ ہے کہ آپ خراٹا مارنے والی شخصیت کے کانوں کے قریب جا کر انتہائی زور سے تالی بجائیں۔ خراٹے مار شخصیت فوری طور پر نیند سے بیدار ہو جائے گی۔ اور آدھا گھنٹہ آپ پرسکون انداز سے سونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ دوبارہ خراٹے شروع ہوں تو پھر سے یہی عمل دہرائیں۔ یوں چھ گھنٹوں کی نیند کے لئے آپ کو کم سے کم درجن بھر تالیاں ضرور مارنا پڑیں گی۔ اگر تالیوں سے کام نہ بنے تو پانی کی ایک خالی بوتل لے کر اس میں چھوٹے چھوٹے سنگ ریزے بھریں۔ اور جیسے ہی خراٹے شروع ہوں، اس بوتل کو دو تین مرتبہ زور زور سے ہلائیں۔ امید ہے خراٹوں کی نشریات کم سے کم آدھے گھنٹے کے لئے پھر سے معطل ہو جائے گی۔ بوتل ہلانے کا کام بھی تالیوں کی طرح ہی حسب ضرورت کچھ کچھ وقفے کے بعد دہراتے چلے جائیں۔

تمام طریقے آزمانے کے باوجود بھی اگر آپ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے تو محض صبر کرنے پر ہی اکتفا کریں۔ اس کے علاوہ کچھ کر بھی تو نہیں سکتے۔ زیادہ سے زیادہ اپنے دل کی تسلی کے لئے کبھی کبھار خراٹا مار شخصیت سے شکوہ شکایت کر لیا کریں۔

کسی شاعر کا یہ ''شکایتی شعر'' بھی آپ وقتاً فوقتاً گنگنا سکتے ہیں:۔

ٹوٹے کسی کی نیند مگر، تم کو اس سے کیا
کرتے رہو خراٹے نشر، تم کو اس سے کیا

شکوہ شکایت سے خراٹوں کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن شاید آپ کے دل کو ہی کچھ نہ کچھ تسکین حاصل ہو ہی جائے۔

کیا بنے گا؟

تخلص بھوپالی فطری طور پر ظریف اور بذلہ سنج واقع ہوئے تھے۔ ان کی بات چیت میں بھی بڑی شوخی ہوتی تھی۔ ان کے ایک واقعہ حال ہی میں نظر سے گزرا ہے، جو پیشِ خدمت ہے۔ ایک مرتبہ وہ مولانا علی میاں رحمت اللہ علیہ کے پاس بیٹھے تھے اچانک ایک صاحب آئے اور اطلاع دی کہ پنڈت نہرو کا انتقال ہو گیا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے مولانا سے سوال کیا کہ اب مسلمانوں کا کیا ہوگا۔

مولانا نے تخلص صاحب کی طرف دیکھا گویا وہ چاہتے ہیں کہ تخلص صاحب ہی اس کا جواب دیں۔

تخلص صاحب نے برملا کہا ''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اب پنڈت نہرو کا کیا ہوگا۔''

سید عارف مصطفٰی

ہائے میرا ریڈیو

سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے اسباب کو نصاب میں کئی بار پڑھا لیکن کچھ زیادہ سمجھ نہ آئے بعد میں جب ریڈیو کا زوال دیکھا تو وہ اسباب سمجھنا بہت سہل ہوگیا لیکن تب تک دیر ہوچکی تھی اور اس وقت ممتحن کے اتفاق کی گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ آج نئی نسل کے لیئے ریڈیو کا مطلب ہے ایف ایم کہ جہاں سارا سارا دن لوکل بقراط یا بقراطن کبھی خوابناک لہجے میں سرگوشیاں کرتے تو کبھی خوفناک سے لہجے میں بڑبڑاتے اور چلاتے سنے جاتے ہیں اور وقفے سے اُن کی گفتگو سے پاگل ہونے سے بچانے کے لئے نغمات بھی برائے تلافی سنائے جاتے رہتے ہیں۔۔۔ اُنہیں خاص طور پہ اُن کے غلط تلفظ کی وجہ سے ترجیح دی جاتی ہے تاکہ انگریزی میڈیم کے بگڑے ہوئے معلوم ہوں، بالعموم ان میزبانوں کی ساری افلاطونی ولفاظی اقوالِ زریں کی چند کتابوں کے تراشوں اور چند پرانے ڈائجسٹوں سے اتارے گئے لطائف یا پند و نصائح کے بل پہ ہوا کرتی ہے جو اُن کے سامنے وہیں میز پہ دھرے ہوتے ہیں۔۔۔ یہ عموماً وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن سیانوں سے گھر میں بھی شاذ ہی کوئی رائے مشورہ لیا جاتا ہے بلکہ ایسے وقت کمرے سے باہر کردیا جاتا ہے لہٰذا وہ انتقاماً سارے شہر کو مشورے دینے نکل پڑتے ہیں لیکن اپنے پرانے ریڈیو کے دنوں میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا اس میں تو بھلے بندے کی نیت اور اعمال دونوں ہی غلط ہوں تب بھی چل جاتا تھا لیکن اس کا تلفظ غلط ہو، یہ نہیں چل پاتا تھا۔

اُن دنوں ریڈیو بہت بلند مقام پر تھا اور اس کی بہت توقیر تھی اتنی کہ بہت سے بزرگ حسبِ جلن، حسد کیا کرتے تھے جس کی ایک وجہ تو یہ ہوتی تھی کہ وہ بزرگ تو پرانی تہ بند لپیٹے پھرتے تھے جبکہ وہ ناز پرور مستطیل ڈبہ یعنی ریڈیو اونچی جگہ پر قیمتی کپڑے کا غلاف سا ڈال کر رکھا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اہلخانہ ان کی کم سنتے تھے اور ریڈیو کی بہت زیادہ، کئی بزرگ تو کلیجہ مسوس کے رہ جاتے تھے کہ وہ ریڈیو کیوں نہ ہوئے۔۔۔ ریڈیو کی آواز اور ذاتی آوازیں دونوں ہی اونچا رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی چونکہ تقریباً ہر گھر میں ہی ریڈیو بجتا تھا لہٰذا کسی پروگرام کو باہر گلی سے گزرتے ہوئے مسلسل ہی سنا جاسکتا تھا، بس ایک جمعے والے دن کے علاوہ کہ اس روز دوپہر سے سہ پہر تک ریڈیو پر اس شدت سے قوالیاں گونجتی تھیں کہ لگتا تھا کہ یا تو سیل باہر جاپڑیں گے یا قوال کا کلیجہ، اسکول براڈ کاسٹ اور بزمِ طلباء کے پروگراموں میں عموماً خشک سائنسی بچوں، مجاہد اور غازی قسم کے بچوں کی یلغار ہوتی تھی جن میں اوّل الذکر وقت بے وقت ایجاد شدہ اشیاء کو دوبارہ ایجاد کرنے پہ تلے رہتے تھے یا پھر موخرالذکر کفر سے آخری جنگ کی تیاریاں کرتے معلوم ہوتے تھے، فلمی گیتوں کے فرمائشی نغموں کے پروگرام بھی کثرت سے نشر ہوتے تھے جن میں کالی کھانسی کی طرح پیچھا نہ چھوڑنے والے پھٹیچر قسم کے مستقل فرمائشی جیسے ایم اے بابو

ناشاد وغیرہ قسم کے دس بارہ بوسیدہ التماسی لوگ نجانے کیوں ہر پروگرام میں ہر گلوکار کا ہر طرح کا نغمہ بجانے کی التجاء کرتے تھے ،جس سے بے تعصبی اور قومی یکجہتی کو خود بخود فروغ ملتا تھا، سارا سارا دن ملکہ ترنم سماعت پہ یوں سوار رہتیں کہ اِک ذرا دیر کو چپ ہوتیں تو کان سائیں سائیں کرنے لگتے۔ گا گا کر اُن کا گلا نہیں بیٹھتا تھا مگر سننے والوں کے کان بیٹھ جاتے تھے، پھر ناہید اختر آئیں اور اُن کی تانیں جذبات کو یوں گرمانے لگیں کہ اُن کے نغمات چپکے چپکے بغل میں پاکٹ ریڈیو داب کے سنے جانے لگے، جو جذبات اُن کی آواز کو سن کے ابھرتے تھے، اُنہیں دبانے کے لئے قدرت نے مہناز کو بھیجا۔ اس سے پہلے تصور خانم کے دور میں مالا اور نسیم بیگم اِسی حکمت کی حفاظتی نشانیاں تھیں۔ بعد میں ایک دو پروگرام تازہ فلموں کے تعارف پہ بھی مشتمل ہوا کرتے تھے جس میں حسن شہید مرزا اپنی خوبصورت کراری آواز سے فلم میں وہ رنگ بھی بھر دیا کرتے تھے کہ جو ہدایتکار سے چھوٹ جاتے تھے۔

یوں تو عموماً ریڈیو پڑے پڑے بزرگوں کی طرح بجتا تو سارا ہی دن تھا لیکن اِسے خاص توجہ خبروں کے سبب ملتی تھی جو کہ سننے کے بعد دو چار گنا بڑھا کر آگے بے خبروں تک پہنچانا فرض سمجھا جاتا تھا، خبریں پڑھنے والے بھی خبر میں ذاتی تاثرات کو اس شدت سے داخل کرتے تھے کہ خبر کہیں پیچھے رہ جاتی تھی اور سامع کو اکثر صرف جذبات ہی ہاتھ لگتے تھے۔ جنگوں کے دنوں کی خبروں میں تو نیوز ریڈر شکیل احمد ہر لفظ میں پوری گھن گھرج سے گولے برساتے اور بم پھاڑتے محسوس ہوتے تھے اور لگتا تھا کہ بلیٹن کسی جنگی جہاز یا ٹینک میں بیٹھ کر پڑھا جا رہا ہے، ریڈیو پہ ڈرامے سننا کا الگ ہی ماحول ہوا کرتا تھا۔ رات نو بجتے ہی ڈرامے کا وقت شروع ہو جاتا تھا اور اس سے پہلے ہی ریڈیو کو کسی تپائی پہ رکھ کر فرط عقیدت سے سب یک زانو دراز ہو کر آگے پیچھے بیٹھ جاتے تھے اور ذرا دیر ہی میں ڈرامے کے سحر میں جکڑ کر جیسے دم بخود سے ہو جاتے تھے۔ اُدھر صداکار ایم سلیم نے کسی وقت کوئی ادنیٰ سی سسکی بھری تو آگے پیچھے یہاں سے وہاں تک کتنی ہی خواتین بلکنے لگتی تھیں،، اگر المیہ منظر لمبا ہو جاتا تو پلو سے ڈبڈبائی آنکھیں اور چچپاتی ناکیں بھی بار بار پونچھی جاتیں، اسی طرح کسی ایک برائے نام شگفتہ جملے پہ بھی سبھی حسب توفیق لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے، کسی سنجیدہ موڑ پہ ڈرامہ جتنے پہلو بدلتا تھا سننے والے اس سے دگنے پہلو بدلتے تھے، زیادہ سنگین مراحل پہ تو نیم دراز سامع بھی اکڑوں بیٹھ جاتے تھے۔ ایسے میں جس پرانے کھنکھارتے بزرگ کو اپنی کئی روز سے نظر انداز کردہ دوا منگوانی ہو وہ عین کلائمکس کے موقع پہ قریب ہی سے کہیں نمودار ہو کر لگاتار کھانستا یاد رکھتا تھا اور اس حکمت کے نتیجے میں اگلے دن کے ڈرامے سے پہلے ہی اس کی مطلوبہ دوائی اس کے سرہانے لا کر رکھ دی جاتی تھی۔
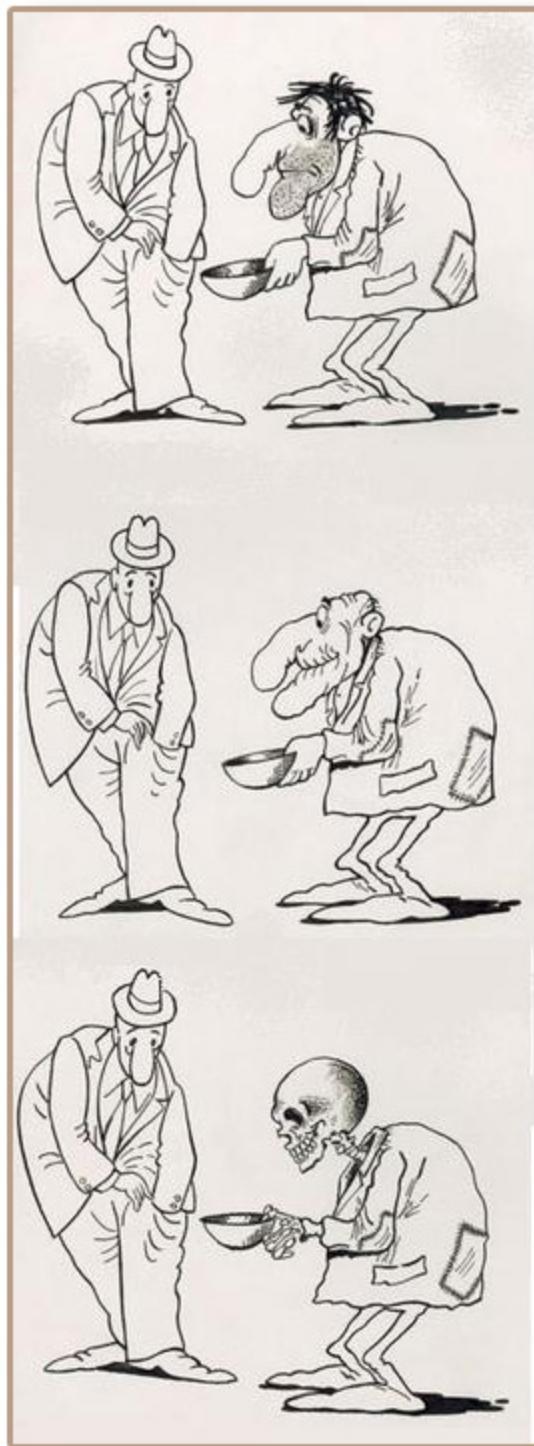
یہ کہنا ہر گز بے جا نہ ہوگا کہ اس دور میں ریڈیو ہر گھر کے ایک سرگرم فرد کی مانند تھا ایسا فرد جو زندگی سے بھرپور تھا اور جس کے زندہ ہونے کا ثبوت صبح دم مل جاتا تھا، کیونکہ آغاز ہی تلاوت اور حمد و نعت سے ہوتا تھا یہ الگ بات کہ بہتیرے اس مقدس آغاز کو محض برائے برکت ہی لیتے تھے اور ریڈیو کھول کر بے نیازانہ اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ روز کسی مولانا کا خطاب بھی لازمی ہوتا تھا اور بیشتر لوگوں کو ان پہ اتنا زبردست اعتماد ہوتا تھا کہ حضرت مولانا جو کہہ رہے ہیں وہ ٹھیک ہی ہوگا' لہٰذا کان لگا کر سننے کی بداعتمادی کم ہی کرتے تھے۔ اکثر ایسے چنیدہ مولانا حضرات ہی مائیک پہ چھوڑے جاتے تھے کہ جو حکومت کے خاص مزاج شناس تھے لہٰذا وہ خود ہی ایسے نکات پہ چیک رکھتے تھے کہ جن سے چیک ملنے کے امکانات خطرے میں پڑتے ہوں۔ وہ لوگوں کو بار ہا یہ بتاتے اور سمجھاتے تھے کہ فرمانبردار شہری کیسے بنا جاتا ہے لیکن شہری تھے کہ ان کی تقاریر کے وقت انہیں سو کام نکل آتے تھے، انہی تقاریر نہ سننے کا نتیجہ تھا کہ عوام بار بار نافرمانی پہ اترے، ہڑتالیں کیں، جلوس نکالے اور کئی حکومتیں ان غیر ذمہ دار شہریوں کی تاب نہ لا کر تاریخ کے پچھواڑے میں جا پڑیں، تاہم ان مولاناؤں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور پوری جرأت اور جوش و خروش سے ہر حکمران کے منہ پہ وہی دھواں دھار تقریریں کیں کہ جو اس سے پہلے والے کی توصیف میں کرتے رہتے تھے۔

ان دنوں ریڈیو پہ تفریحی پروگرام بکثرت ہوا کرتے تھے

کیونکہ لوگ سربراہ اور وزرا کی سرگرمیوں اور ان کے بیانات کو اسی ذیل میں شمار کرتے تھے۔ ہر وزیر کی بھرپور کوشش یہی ہوتی تھی کہ آج سربراہ مملکت کی شان میں اور اپوزیشن کی مذمت میں اس کا کم از کم ایک بیان تو نشر ہو ہی جائے کہ اگر کسی وقت حکمران کبھی اک ذرا دیر کو ریڈیو لگا بیٹھے تو کیا عجب کہ اس کی محنت ٹھکانے لگ ہی جائے۔ حکمران بھی کم نہ تھے، خود بھی آئے دن ریڈیو پہ ہی ڈیرا جماتے تھے اور ہم وطنوں کی سماعتوں کا شکار کھیلتے رہتے تھے۔ وہ ہمہ وقت بس یہی یہ ثابت کرنے میں لگے رہتے تھے کہ ان کی مخالفت کرنے والا دراصل بہت شدید نابکار اور بڑا جہنمی ہے اور وہ تو کمال عظمت سے محض اس کی عاقبت بچانے کے لئے سرگرداں ہیں۔ چونکہ پہلے فوجی انقلاب کے بعد ہی ریڈیو نے حق گوئی کے اہم رموز بخوبی سیکھ لئے تھے چنانچہ ہر سہ پہر کو 'فوجی بھائیوں کا پروگرام نشر ہونا معمول بنا لیا گیا تھا، بینڈ بجانے اور بجوانے کے یہ شوقین اتنے نغماتی مزاج کے تھے کہ ایک گانے کے بعد دوسرا گانا بجوانے ہی میں لگے رہتے تھے۔ بجانے بجوانے کی عادت بڑے منصب داروں میں محض بینڈ ہی تک محدود نہ تھی۔ ایک تصویر میں مادام نور جہاں کو صدر یحییٰ کے گھٹنے پہ بیٹھے دیکھا تو بہتوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا کہ "شوق دا کوئی مل نئیں" پھر شاید صدر صاحب کی عقل اور نیت کے ساتھ ساتھ نظر بھی خراب تھی ورنہ وہ یہ شعر پڑھ کر کام چلا لیتے

یا الٰہی مجھے ہوا کیا ہے
بھلا اِس بی بی میں رہا کیا ہے

لیکن صدر کے وضاحتی بریگیڈ کے مطابق درحقیقت یہ تصویر اس حقیقت کی غماز تھی کہ صدر فنکاروں کی کتنی قدر کرتے تھے اور انہوں نے ایک فنکار کو اگر بوجوہ سر آنکھوں پر جگہ نہیں بھی دی تب بھی گھٹنے پہ تو جگہ دی۔

ریڈیو کے ابتدائی دور میں ہر بڑا اور نامور لکھاری اس وقت ریڈیو کے لکھنے والوں میں تھا۔ بعضے حاسد لوگ یہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ بڑے اور نامور تو ریڈیو میں آنے سے ہوئے ہیں اور ان کا یہ کہا ہوا ان لکھاریوں نے تو دل ہی پہ لے لیا کہ جس کے صدمے سے زیادہ تر کے دل ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گئے اور رخصت ہوتے گئے، یوں ان حاسدوں کو اندر گھس بیٹھنے کا

موقع ملتا چلا گیا اور چونکہ تاریخی طور پہ جلنے والوں کا منہ کالا ہوتا ہے چنانچہ ریڈیو پاکستان کے کمروں میں اندھیرا چھا گیا اور وہاں منہ کالا ہونے یا منہ کالا کرانے ہی کو معیار بنالیا گیا۔ ریڈیو کا یہ دور در حقیقت ریڈیو پروڈیوسروں کی شاہانہ تمکنت کا دور تھا جن کے سامنے سول سروس والوں کی بد دماغی بھی ماند تھی۔ اپنے اپنے کمروں میں مہاراج یوں اکڑ کر بیٹھتے تھے کہ لگتا تھا ابھی چیخ ہی جائیں گے۔ ان میں شریف تر بھی لوکل مغل اعظم سے کم دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ان مہابلیوں کے ہر حکم کی تعمیل کسی ایک چپراسی کے بس کی بات نہ تھی جبکہ کئی کئی پروڈیوسروں پہ ایک ہی خدمتگار مامور ہوتا تھا، اس صورتحال میں خداترس پرائیویٹ خدمتگاروں کا طبقہ ابھرا کہ جو قبائی مزاج رکھتے تھے اور جو گویا پیدا ہی مالش پالش اور نالش کے لئے ہوئے تھے۔ انہوں نے پروڈیوسر مہاراج کے سارے ''نا قابل بیان'' مسائل کو حل کرنے کا کام اپنے سر لے کر اسے مقصد حیات بنالیا تھا۔ ان کی آمد کے بعد زیادہ تر پروڈیوسر بھڑک دار کپڑے پہن کر ٹھرک دار گفتگو کرنے کے سوا کچھ اور کرتے کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ اُسی زمانے میں کچھ ایسے لوگوں نے کہ جن کے کانوں میں پختہ سرکاری عزائم اور پکے راگ سننے سے مستحکم چھید ہوگئے تھے، آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو سیلون (سری لنکا) پہ التفات کیا اور مزید نجانے کون کونسے اسٹیشن ڈھونڈھ نکالے کہ جہاں ان کی روح کی غذا کا انتظام موجود تھا لیکن کمزور سگنل اور مضبوط خواہش کی وجہ سے وہ اور ان کا ریڈیو وقفے وقفے سے مرغ بادنما کی صورت ہر سمت گھومتے رہتے تھے، ملکی حالات خراب ہوجائیں تو بی بی سی لگایا جاتا تھا جو کہ عوامی توقعات کے عین مطابق کشتوں کے پشتے لگا دیتا تھا اور گھر گھر اور ہر تھڑے و چوراہے پہ اس کمال فن کی داد پاتا تھا۔

ریڈیو پہ ایک پروگرام بچوں کے لئے کہانی کا بھی ہوتا تھا جس میں ایک خاتون بہت دلگداز اور سرسراتی سی آواز میں روز ایک جھوٹی کہانی سناتی تھیں لیکن یہ سب کی سب غیر جمہوری ہوتی تھیں کیونکہ ان کا آغاز ہی کچھ یوں ہوا کرتا تھا۔۔۔ پیارے بچو، ایک تھا بادشاہ۔۔۔ اور بادشاہ کے بس دو ہی کام تھے، تخت پہ بیٹھے رہنا اور تالیاں بجا بجا کر حکم جاری کرتے رہنا۔ یہ کہانیاں بچوں سے زیادہ بڑوں کو مرغوب ہونے لگیں اور گھریلو نظام بتدریج غیر پارلیمانی ہونے لگا تو بیگمات نے سردرد کے بہانے اتنی دیر کو ریڈیو کے کان مروڑے رکھنے کی راہ اپنائی۔ حکمران البتہ اس پروگرام سے خوب مستفید ہوئے۔ عجب بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی کہانی میں بادشاہ بھی خود بنے اور وہ دیو بھی کہ جس کے چنگل میں جمہوریت کی پری قید تھی۔ کھیلوں کے پروگرام البتہ لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے پروگرام بنے رہتے تھے کیونکہ سب سے زیادہ سنے جانے والی چیز کرکٹ میچز تھے جن کی کمنٹری بڑے طمطراق سے انگلش میں پیش کی جاتی تھی، آخر حکمران اشرافیہ بدتمیز عوام کو بے حساب خوش ہونے کے لئے یوں بے لگام کیوں چھوڑتی، کہیں بہت بعد میں جب عوام ووٹ لینے کے کام آنے لگے تو کرکٹ کمینٹری میں بھی اک ذرا دیر کو اردو کا ''جھونگا'' پکڑا دیا گیا۔ منیر حسین کی ''وہ جو ہے، وہ جو کہتے ہیں نا'' ٹائپ کے الفاظ سے لبریز. وبھرائی ہوئی کمنٹری بھی عوام کو بہت بھلی لگی۔

ہاکی میں ایس ایم نقی اور ذاکر سید نے مائیک ایسا پکڑا کہ جیتے جی کوئی چھڑا نہ سکا اس وقت ذاکر سے گیند لمبا ہو جاتا تھا اور جو شیلے ایس ایم نقی کھلاڑی سے پہلے گول کرنے سے بال بال ہی بچتے

پطرس بخاری ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر تھے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خان صاحب کو تقریر کے لئے بلایا تقریر کی ریکارڈنگ کے بعد مولانا پطرس کے دفتر میں آ کر بیٹھ گئے۔ بات شروع کرنے کی غرض سے اچانک مولانا نے پوچھا۔ پطرس یہ تانپورے اور تنبورے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ پطرس نے ایک لحہ سوچا اور پھر بولے۔ مولانا آپ کی عمر کیا ہوگی؟ اس پر مولانا گڑبڑا گئے اور بولے۔ بھئی یہی کوئی پچھتر سال ہوگی۔ پطرس کہنے لگے۔ مولانا جب آپ نے پچھتر سال یہ فرق جانے بغیر گذار دئے تو دو چار سال اور گذار لیجئے۔

رائتہ اور اندازِ سخن

ایک بار کسی دعوت میں بہت سے شعراء و ادباء مدعو تھے کھانا آنے سے قبل اس بات پر گفتگو ہو رہی تھی کہ صاحبِ طرز انشا پردازی یا شاعری اکتسابی چیز نہیں ہے کہ انسان اسے محنت سے حاصل کرلے اور وہ اپنے اندازِ تحریر سے پہچانا جائے بلکہ ایک وہبی صفت ہے جو فطری طور پر اسے ملتی ہے اسی لئے ہم بعض دفعہ یہ کہتے ہیں کہ یہ غزل غالب یا علامہ اقبال کے رنگ میں ہے یا یہ مولانا آزاد کی سی نثر ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے رائتہ لاکر رکھا گیا تو مجاز کہنے لگے کہ اب دیکھئے رائتے ہی کو لے لیجئے، اگر اسے مختلف شعرا استعمال کرتے تو کیسے کرتے۔

جیسے علامہ اقبال کہتے

حیف شاہیں رائتہ کھانے لگا

یا جوش ہوتے تو یوں کہتے:

وہ کج کلاہ جو کھاتا ہے رائتہ اکثر

اور اختر شیرانی کہتے

رائتہ جب رخِ سلمیٰ پہ بکھر جاتا ہے

فراق یوں کہتے

ٹپک رہا ہے انگلیوں سے رائتہ کچھ کچھ

اور میں تو یونہی کہتا کہ

ٹھہریئے ایک ذرا رائتہ کھالوں تو چلوں

تھے۔ اسپورٹس سے بڑھ کر ریڈیو پہ بہت دلچسپی سے سنے جانے والے پروگراموں میں فلمی ستاروں و فنکاروں کے انٹرویوز نمایاں تر تھے۔ اداکاراؤں کے انٹرویوز مرد بڑے ذوق وشوق سے یوں سنتے تھے کہ گویا یہ اہم پروگرام نہ سنا تو زندگی میں اک بڑا خلا سا رہ جائے گا۔ انتقاماً خواتین بھی مرد فنکاروں کے انٹرویو سننے میں بہت سرگرمی دکھاتی تھیں اور سارے کام کاج چھوڑ کے مردوں کا دل جلاتی تھیں۔ کامیاب لوگوں کے یہ احوال بعد میں گھریلو فسادات میں طعنہ زنی کیلئے خاطر خواہ کام میں بھی لائے جاتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب فلم انڈسٹری زوروں پہ تھی اور زیادہ تر فنکار اینٹھے اینٹھے پھرتے تھے اور جب کبھی کوئی بڑا فنکار ریڈیو پر لایا جاتا تھا تو افریقہ سے لائے گئے ہاتھی کی مانند دیکھنے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ جایا کرتے تھے اور چھوٹا موٹا مجمع تو ریڈیو پاکستان کراچی کے گیٹ پہ تقریباً سارا ہی دن لگا رہتا تھا کیونکہ ان دنوں ریڈیو کی عمارت میں داخلہ بڑی بات سمجھی جاتی تھی اور اندر جانے کے لئے مشتاقان کی منت سماجت دیدنی ہوتی تھی اور اکثر ہی استقبالیہ کلرک کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگاتے دکھتے تھے۔ ریڈیو کی انتظامیہ نے ایسے بلکتے لوگوں کے لئے صرف یہ سہولت فراہم کی تھی کہ بالعموم ایسا تنومند و لحیم شحیم بندہ وہاں مامور کیا جاتا تھا کہ جس کی تھوڑی بہت بڑی بلکہ ڈبل ہو اور التجا کے لئے ایک ہی ساتھ بہت سارے لوگوں کو اسے چھونے میں آسانی ہو۔ ریڈیو پہ فنکاروں کے جو انٹرویوز نشر ہوتے تھے ان کی خاص بات جو عام ہو چکی تھی، یہی ہوتی تھی کہ انہیں اس کام کا بچپن ہی سے شوق تھا اور وہ فن کی خدمت کو مقصد حیات سمجھتے ہیں، گویا یہ فنکار حتیٰ الامکان جھوٹ بولنے سے پرہیز نہ کرنے کی پوری پوری کوشش کیا کرتے تھے اور وزراء کو شرماتے تھے۔ اس زمانے میں اینکر یا میزبان ہونے کے لئے زبان درازی کی صفت مطلوب نہ تھی لیکن عزت نفس سے محرومی، اور نہایت بہتر تلفظ سے آراستہ شدید چاپلوسی ہی سب سے زیادہ درکار صلاحیتیں تھیں۔ مہمان سے چبھتے ہوئے سوالات کرنا تو قابل دست اندازی پولیس باور کیا جاتا تھا، ایسے میں فنکاروں و وزیروں کی فنکاریاں عروج پہ ہوتی تھیں۔

قومی تہواروں اور اہم دنوں پر ریڈیو پہ خصوصی نشریات کا انبار سا لگا رہتا تھا۔ قومی دنوں پہ سارا دن وجذبات سے سرشار قومی وملی نغمے بجتے و گونجتے رہتے تھے جن کے باعث گلی محلے میں چلتے پھرتے لوگ بھی پریڈ کرتے معلوم ہوتے تھے اور جذبات کی بلندی کے سبب کلینکوں پہ بلند فشار خون کے ماروں کی قطاریں لگ جاتی تھیں۔ درحقیقت کئی اہم دن تو اہم محسوس ہی ریڈیو کے سبب کئے گئے ورنہ جس گھر میں بھی ریڈیو کبھی خراب ہوا، اہم دن بھی نارمل بن کے چپ چاپ گزر گیا، ان اہم دنوں کے حوالے سے پیش کئے

جانے والے خاص پروگراموں میں معلومات عامہ کے پروگراموں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، ان پروگراموں کی مقبولیت بڑھی تو عام دنوں میں بھی ذہنی آزمائش کے مقابلے منعقد کیے جانے لگے اور لوگ معمولی انعامات کے لئے بھی غیر معمولی عزم سے ریڈیو پاکستان کی عمارت کے چکر لگانے لگے اور داخلہ پاسوں کے حصول کے لئے ہر حربہ آزمانے لگے یوں لالچ کے ماروں اور انعامات کے طلبگاروں کے ہاتھوں ذہن کی آزمائش بتدریج علم کی نمائش اور ذہنیت کی آزمائش میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ اس زمانے میں ہمیں بھی متعدد باران معلوماتی مقابلوں میں شرکت کا موقع ملا اور رفتہ رفتہ بزم طلبہ اور نجانے کن کن پروگراموں میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اس زمانے میں بڑی بڑی نابغہ روزگار ہستیاں جیسے سلیم احمد، رضی اختر شوق، قمر جمیل، محشر بدایونی اور ضمیر علی ان دنوں ریڈیو کے پروگراموں کے پیشکاروں میں شامل تھیں جن کے پاس ہر وقت لوگوں کا یوں جمگھٹا سا لگا رہتا تھا کہ گویا نامرادوں کو مراد پانے میں مدد دیتے ہیں اور عین وقت پہ شرمندگی سے بچاتے ہیں۔

ایک طبقہ مگر ایسا تھا کہ جسے ہم ہر وقت کسی نہ کسی اسٹوڈیو میں یہاں وہاں پڑا پاتے تھے اور جس بندے کو جس حالت اور جس پہلو پہ دیکھتے گزرتے تھے، گھنٹوں بعد بھی اسی پہلو پہ دھرا پاتے تھے۔ عموماً غنودگی کی حالت میں رہتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ جاگتے رہے تو کسی بیگار میں کھپا دیئے جائیں گے۔ یہ کلاسیکل فنکاروں کا طبقہ تھا جو کہ اگر بٹ اور بھٹی خاندان میں بھی جنم لیتے تھے، تب بھی پہلے ہی دن سے استاد فلانے خان صاحب ہی کہلوانا پسند کرتے تھے۔ عام طور پہ اپنے سازوں کے ساتھ ہی ساز باز کرتے نظر آتے تھے۔ ستار والا تو باقاعدہ اپنے ستار کے کان میں پہروں سرگوشیاں کرتا دکھڑے سناتا دکھتا تھا۔ ریڈیو کے اندر کسی اسٹوڈیو میں یہ وہ بدقسمت لوگ تھے کہ جنہیں شاید ان کے لوگوں نے بھی کبھی توجہ سے نہیں سنا، ہر چند کہ روٹھی قسمت کو منانے کے لئے وہ ہر انگلی میں دو دو پتھروں والی شرطیہ قسمت بدلنے والی رنگ برنگی انگوٹھیاں پہنے رہتے تھے لیکن عوام کے ذوق کا ہاتھی ذرا ٹس سے مس نہ ہوا اور پھر ریڈیو انتظامیہ نے بھی انہیں اپنے فن کی نکاسی کے لئے وہ اونگھتا بسورتا وقت الاٹ کیا کہ جب عوام کے کان سارا دن ریڈیو کے غل اور بیوی کے غپاڑے سے تھک کر رخساروں پہ لٹک چکے ہوتے تھے اور ہوتا یہ تھا کہ جہاں ان فنکاروں کے راگ راگنیاں شروع ہوئے، عوام نے اسے گرم ہوتے ریڈیو کو ٹھنڈا کرنے کا غنیمت موقع سمجھا۔ چند سیانے ریڈیو کے موجودہ زوال کو انہی خان صاحبوں کے کوسنوں اور بددعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں ورنہ ذرا بتایئے کہ آخر یہ کیا بات ہوئی کہ دیکھتے دیکھتے ادھر ٹی وی کی آمد کا کوندا لپکا، ادھر آناً فاناً برسوں سے دھوم مچاتے ریڈیو کی دنیا اندھیر ہوگئی۔

ہمارا باس

زید عفّان

حفظِ ماتقدم کے تحت تمام نام فرضی ہیں

پہلی جاب پر جس فرد سے واسطہ پڑا وہ باس کہلائے جانے کے قابل تھا یا نہیں اس کا اندازہ آج کئی سال گزرنے کے بعد بھی نہ ہوسکا۔۔۔ درمیانہ قد، عمر ۴۵ لگ بھگ رہی ہوگی۔۔۔ بائیں طرف سے مانگ کی سیدھی لکیر دیکھ کر شروع میں ایسا لگتا رہا کہ "بیگم" کی کئی گھنٹوں کی محنت رہتی ہوگی۔ وقت کے ساتھ اندازہ ہوا کہ قدرت نے ایک ہی دفعہ محنت سے بنایا تھا مگر توند کا تعلق خود ان ہی محنت سے تھا جو کسی فٹ بال سے بس دوگنا زیادہ تھی، تیز چلنے کی صورت میں توند دائیں بائیں لچکارے مارتی تو بے ساختہ اور بے آواز ہنسی کا فوارہ باقیوں کے چہرے پر موجود چھوٹے سے منہ بلند ہوتا.. جیسے کسی پرانے استعمال شدہ کنویں میں پتھر ڈال کر پانی کے اچھل کودنے کی آواز بھی سنی نہیں جاسکتی۔ ان کے جوانی کے ساتھی حامد خان اکثر جملہ کستے کہ

"بے حیا عورت اور آپ پیٹ بڑنے (بڑھنے) پر بھی منہ نہیں چھپاتے!"

توند کم کرنے کے لیے اٹھک بیٹھک کی انتھک مشقیں کرتے۔۔۔ کہتے تھے اس سے چربی پگھلتی ہے۔ حامد خان کو ہی ان پر پورا حق تھا اور ایسے موقعوں پر وہ حق پورا استعمال ہوتا۔ گھنی مونچھوں کی چھاؤں سے اردو اور پنجابی لہجے کی مکس اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر آواز ابھرتی "گھٹنے پگھر غئے (پگھل گئے) تو کیا ہوگا؟"

آنکھوں میں سرخی رہتی مبادا شریف مردوں کی طرح ان کو بھی گھر میں شب خوابی پر اکسایا جاتا۔۔۔ کس لیے؟ یہ کبھی پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وزن کسی طور ۱۰۰ کلو سے کم نہ تھا۔ ہمارا باس ہونے کے ناطے ہمارا دل تو یہ ہی کرتا تھا کہ "کبڈی" کے اکھاڑے میں کھڑا کر کے اگلے سے دانت پیس کر کہیں "کھیلوان سے" کبڈی کبڈی!"

کام کے بعد ان کا دوسرا شوق تھا نازیبا گفتگو۔۔۔ ہماری لائن کے اکثر لوگوں کی دو عادتیں بہت بری ہوتی ہیں، ایک یہ وہ گالیاں بکتے ہیں اور دوم یہ کہ زبان بہت گندی ہوتی ہیں۔ ان کی زبان کی گندگی کی عالم یہ تھا کہ اکثر بے دھیانی میں خود پر مغلظات کا طوفان الٹ دیتے۔ اسٹاف کے سامنے چرب زبانی ایسی ہوتی کہ بعض دفعہ ہم "شریف" نوجوانانِ وطن آنکھیں بند کر کے دیر تک دل میں "مطلب" کی بات سوچتے رہتے۔۔۔ یعنی بات میں سے اپنے

مطلب کی بات نکالتے! کوئی خود سے بڑا باس آجائے تو منہ میں گھگیاں پڑ جاتیں، جیسے آج کل بازاری عورتیں رمضان کے آتے ہیں سر پر ڈوپٹہ لے کر ''اللہ ہو، اللہ ہو'' کا ورد کرتی ہیں۔

دوپہر کے کھانے پر سب اکٹھے ہوتے سوائے ان کے جو باس کی نظروں، باتوں اور انگلیوں کا نشانہ بنتے۔۔۔ اکثر بیٹھے بیٹھے دوسروں کی نقل اتارنا شروع کر دیتے۔ خود ان کو جانے کیا لگتا ہو مگر بلا مبالغہ دوسروں کو ایسا لگتا کہ پاگل خانے کا خطرناک پاگل رسیوں سے آزاد ہوا پڑا ہے۔۔۔ مزے لینے والے کھل کر مزے لیتے اور منہ چھپانے والے دل میں ہی کسر نکال لیتے۔ کھانے میں پائے، نلی نہاری اور بڑے کا قیمہ از حد پسند تھا۔ کھانے کے بعد پیٹ پر اوپر سے نیچے ہاتھ پھیر کر کہتے تھے کہ ''مولا تیرا کرم ہے جو تونداب تک بنی ہوئی ہے۔'' سندھی ملازمین سے اُنھی کی سطح پر اتر کر بات کرتے۔ کہتے تھے جیسے کو تیسا۔۔۔ اس لیے ملازمین بھی ان کے ساتھ ان کے ''جیسے کو تیسا'' والے اصول پر سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔

ان کا گھر ہمارے گھر سے کچھ اُدھر ہی تھا۔۔۔ اتفاق کہیے یا عذاب کہ ایک دن ہمیں اُنھیں گھر سے جائے وقوعہ یعنی کام کی جگہ تک پہنچانا پڑا۔۔۔ سارے راستے موٹر بائیک ان کے وزن سے اور ہم باس کے گر جانے کے خوف سے کانپتے رہے۔۔۔ اس دور کے نوجوانوں میں بائیک کے سائڈ مرر (mirrorside) کا استعمال ویسے ہی ناپید ہے چنانچہ جب ہم ذرا پیچھے جھانکنے کو دائیں بائیں سر کرتے تو ہمیں اپنا آپ کوہ قاف کے دیو کے بازوؤں میں لگتا۔

کام میں کوئی خرابی ہوجائے تو دوسرے پر اس کا بار ڈال دیتے اور اگر دوسرے کا کام اچھا ہوجائے تو بڑے باس کے سامنے اپنی شیخیاں بگھارتے رہتے۔۔۔ عادات واطوار سے شک گزرتا کہ اپنے ہاں کالا کوا پیدا ہوگیا تو بار کسی ناتواں کے کاندھوں پر نہ جا پڑے یا کسی شیر کی ماں کو الزامِ آشنائی نہ سہنا پڑے! کام کے معاملے میں علی سے الجھ پڑے۔ یہ سیر تھے وہ سوا سیر، علی سے چرب زبانی میں کمی کی وجہ یہ ہی تھی۔ علی کی عمر ہمارے برابر

ہی تھی بس لگتا دو بچوں کا باپ تھا۔ علی کے منہ در منہ جواب سے بس کسر یہ رہ گئی کہ وہ اپنا منہ نوچ لیتے۔۔۔ کہتے تھے تم بہت بولتے ہو۔ علی کہتا ''میں بس جواب دیتا ہوں بولتے تو آپ ہیں۔''

شدید سردی کے دنوں میں بھی سائٹ پر سوئٹر کے بغیر رہتے تھے۔ شدید گمان تھا کہ اللہ نے انھیں اس معاملے میں جانور بنایا ہے۔۔۔ یعنی سیلف ایڈجسٹ ایبل (adjustableself)۔ بقول یوسفی صاحب ''کراچی میں پنڈی سے تین لحاف کم سردی پڑتی ہے''۔ جتنی بھی پڑتی ہے جانور کو اس سے کیا غرض۔۔۔ سردی میں اسٹاف کو تین وقت چائے پینے کی نا صرف تائید کرتے تھے بلکہ آفس کے کھاتے سے پلاتے بھی تھے۔ الگ بات ہے خود سارا دن پیتے رہتے۔۔۔ اسٹاف سے کہتے تھے ''دیکھ لو مجھ جیسا باس نہیں ملے گا۔'' علی نے یک بارگی ہمارے کان میں کہا ''جہنم والوں کو یہ ہی ملے گا۔''

یہ تھے ہمارے پہلے باس۔۔۔ عابد صاحب!

میم سین بٹ

عشق پر زور نہیں ۔۔۔

عشق بڑا خانہ خراب ہوتا ہے جو کوئی اس کا شکار ہو جائے تو اس پر زندگی بھاری ہو کر رہ جاتی ہے

اسی لئے ولی دکنی نے صدیوں قبل کہہ دیا تھا۔۔۔۔۔۔

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

بعض عاشق ابتدائے عشق میں ہی ہاں ہاں کر اٹھتے ہیں غالباً ایسے ہی

عاشقوں کے بارے میں میر تقی میر کہہ گئے ہیں۔۔۔۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

سیانے کہتے ہیں کہ عشق زبردستی نہیں ہوتا اور جب انسان ایک بار اس میں ملوث ہوجائے تو پھر عشق کے نشے سے چھٹکارا ممکن نہیں رہتا شاید مرزا غالب ٹھیک ہی کہہ گئے ہیں۔۔۔۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

کچھ لوگوں کو عشق کا بھوت اس بری طرح چمٹ جاتا ہے کہ وہ ناکارہ ہو کر رہ جاتے ہیں اور دین و دنیا میں سے کسی کے کام کے نہیں رہتے ایسے عشق پیشہ نکمے لوگوں کے بارے میں بھی غالب کا کہنا ہے کہ۔۔۔۔

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

بعض لوگوں کا عشق بڑھ کر جنوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے ان کا اپنا سکون تو برباد ہوتا ہی ہے دوسروں کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں ان وحشی عاشقوں کی وجہ سے محبوب کی بدنامی ہونے لگتی ہے مگر یہ ڈھیٹ عاشق محبوب کی بدنامی کو بھی اس کی شہرت قرار دیدیتے ہیں بقول غالبؔ۔۔۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

عاشق بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں اکثر یہی چاہتے ہیں کہ محبوب صرف ان تک محدود رہے اور انکے کسی رقیب کو لفٹ نہ کرائے لیکن ہرجائی محبوب کے کچھ عاشق فراخدل بھی ہوتے ہیں اور اس معاملے میں غالب کے ہمخیال بلکہ روشن خیال ہوتے ہیں۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

عشق کوئی آسان راستہ نہیں ہے پاؤں ہی نہیں دل و جگر بھی چھلنی ہو کر رہ جاتے ہیں جگر مراد آبادی تو اسے آگ کا دریا قرار دیتے ہیں۔۔۔

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا جان لیجئے

اک آگ کا دریا ہے اور تیر کے جانا ہے

عشق کی کوئی انتہا نہیں ہوتی مگر عاشق اس کی بھی انتہا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں علامہ اقبال نے اس حوالے سے کہا تھا۔۔۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

اگر کوئی عشق کے امتحان میں پڑ جائے تو اسے جلد کامیابی نہیں ملتی بار بار ناکامی سے بہت سے عاشق دل چھوڑ جاتے ہیں حالانکہ انہیں عشق کے چکر میں پرنے سے پہلے یہ بات ذہن مین رکھنی چاہیے بقول علامہ اقبال۔۔۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

عقلمند لوگ عشق ومحبت کے چکر میں نہیں پڑتے وہ اس معاملے میں دامن بچا کر رکھتے ہیں اور اگر ان کی عقل پر پتھر پڑ جائیں تو وہ اس کھیل میں ملوث ہو جاتے ہیں اسرار ناروی المعروف ابن صفی کا ایک شعر ہے۔۔۔

تم نے دیکھا دل کے ہاتھوں کتنے ہم مجبور ہوئے
چلتی پھرتی چھاؤں کی خاطر عقل سے کوسوں دور ہوئے

ظہیر کاشمیری نے بھی عشق کے عہد بیکاری کے حوالے سے شعر کہا تھا۔۔۔

چھت کی کڑیاں، شہر کی گلیاں گنتے گنتے عمر تمام ہوئی
عشق کے عہدِ بے کاری میں کتنا اچھا کام ملا

لیلیٰ مجنوں اور ہیر رانجھا کی عشقیہ داستانوں میں پتا نہیں کتنی حقیقت اور کتنا افسانہ پایا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ عشق خانہ خراب نے بہت سے گھر جلائے اور لاتعداد زندگیوں کے چراغ بجھائے ہیں اس کے ساتھ ساتھ عشق نے بہت سے گھر بسائے اور بڑے نامور شاعر بنائے ہیں اردو کا کلاسیکی اور جدید ادب عشقیہ شاعری سے بھرا پڑا ہے، محبت کے حوالے سے ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے بقول شاعر۔۔۔۔

محبت کرنے والوں کے عجب کھیل دیکھے
نتیجہ جب بھی نکلا عاشق فیل دیکھے

زمانے کے ساتھ ساتھ عشق کے انداز بھی خاصے بدل گئے ہیں ایک وہ دور تھا کہ بقول مولانا حسرت موہانی۔۔۔

دیکھنا بھی تو اُنہیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

اب ایک یہ دور ہے کہ لوگ عشق کم اور رسوائی کا سامان زیادہ کرتے ہیں خود بھی بدنام ہوتے ہیں اور بیچارے ''حسن'' کا ازدواجی مستقبل بھی خطرے میں ڈال دیتے ہیں بلکہ ساتھ ہی اپنے اور محبوب کے اہل خانہ کو بھی معاشرے میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہنے دیتے اس پر مستزاد گھر سے بھاگ کر کورٹ میرج کرنے، رفع حاجت کے بہانے آشنا کے ساتھ فرار اور پھر حدود آرڈیننس کے تحت مقدمے کا اندراج جیسی خبریں عشق کی روح کو مجروح کر کے رکھ دیتی ہیں ہمارے خیال میں اس خرابی کی سب سے بڑی وجہ بیہودہ پنجابی، ہندی، پشتو، اردو اور انگریزی فلمیں ہیں کہ جنہوں نے ہماری نوجوان نسل کے دماغ خراب کر کے رکھ دیئے ہیں اور وہ آدم بو حوا بو پکارتے پھرتے ہیں، اس محبت کے بارے میں صوفی تبسم کہہ گئے ہیں۔۔۔

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی، انجام بھی رسوائی

الطاف حسین حالی بھی اپنی شاعری پڑھنے والوں کو عشق خانہ خراب کے نقصانات سے ڈراتے رہے ہیں ان کا ایک شعر ہے۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر پہ سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

انٹرنیٹ کی سہولت نے عشق ومحبت کو نیا رخ دیدیا ہے چیٹنگ خطوط کتابت نے چھٹی رساں کی محتاجی ختم کردی ہے اب انٹرنیٹ یا موبائل فون کے ذریعے محبوب کے ساتھ پرائیوٹ معاملات پر براہ راست کھل کر تبادلہ خیال کر لیا جاتا ہے، یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ عشق انسان کو بوڑھا نہیں ہونے دیتا اس کا مطلب غالباً یہ ہے کہ عشق کرنے والے کا دل سدا جوان رہتا ہے ورنہ ہم نے تو کئی عشق پیشہ ایسے بھی دیکھے ہیں جو اس روگ میں مبتلا ہو کر جوانی میں

ہی بوڑھے بابے بن جاتے ہیں یہ نوجوان سر کے معاملے میں فارغ البال نہ بھی ہو گئے ہوں تو ان کے بال پہلے کھچڑی اور پھر جلد ہی برف بن جاتے ہیں یہ لوگ عشق میں اس قدر دو بے رہتے ہیں کہ انہیں سر کے سفید بالوں کو خضاب لگا کر چھپانے کا بھی ہوش نہیں رہتا بقول عباس تابش۔۔۔

شکل تو شکل مجھے نام بھی اب یاد نہیں
ہائے وہ لوگ وہ اعصاب پہ چھائے ہوئے لوگ

بعض لوگوں کو عشق کرنے کا کم اور اس کا ڈھنڈورا پیٹنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے اے جی جوش نے غالباً ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا تھا۔۔۔

اک ذرا تم سے شناسائی ہوئی
شہر بھر میں میری رسوائی ہوئی

اے جی جوش شاعر کم اور سومو پہلوان زیادہ لگتے تھے شاعری کے اکھاڑے میں بڑی تاخیر سے اترے تھے اور اس دیر آید کو درست آید قرار دیتے تھے لوگوں کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے جس عمر میں آکر شاعری شروع کی تھی انسان کے تو رومانی جذبات ہی مردہ ہو چکے ہوتے ہیں پس ثابت ہوا کہ عشقیہ شاعری نے انہیں بوڑھا نہیں ہونے دیا اور ان کا دل آج بھی جوان ہے۔

دل ہونا چاہیدا اے جوان
تے عمراں وچ کیہ رکھیا

عشق میں بدنامی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن عاشق لوگ اس کی پرواہ ذرا کم ہی کرتے ہیں البتہ بعض بزرگ شاعر بدنامی سے ڈرتے ہیں اور عشق کر کے بدنام ہونے پر گلہ کرتے ہیں، ابرار حامد کا ایک شعر ہے۔۔۔۔

عشق تو بس کیا ہے اک تجھ سے
ساری دنیا میں رسوا کیونکر ہوں

بعض شاعر عشق کے چکر میں پڑ کر دین اور دنیا کے کام سے بھی جاتے ہیں ایسے ہی کسی ٹھرکی شاعر بابے کو اگر کوئی ہمدرد مشورہ دے کہ بزرگو! آپ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اب عشق، بوتل اور شاعری چھوڑ کر اللہ اللہ کریں تو جواب میں وہ یقیناً یہ شعر پڑھ دینگے۔۔

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

عشق اور شاعروں کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے کیونکہ عشق کیے بغیر رومانی شاعری نہیں ہوسکتی جس نے جتنے زیادہ عشق کیے ہوں وہ خود کو اتنا ہی بڑا شاعر سمجھتا ہے، جوش ملیح آبادی کی سوانح عمری ''یادوں کی بارات'' اس کا واضح ثبوت ہے ان کے علاوہ بھی بڑے بڑے شاعروں نے عشق لڑائے ہیں، مولانا حسرت موہانی جیسے کامریڈ ادیب، شاعر، صحافی اور سیاستدان عاشقی کے زمانے میں چپکے چپکے رات دن آنسو بہاتے رہے ہیں، احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے دل بھی کیوپڈ کے تیر کا نشانہ بن چکے ہیں اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب آتش جواں تھا، احمد ندیم قاسمی تو اپنی دیہاتی محبوبہ کو پانے میں ناکام رہے تھے البتہ ڈاکٹر وزیر آغا بعدازاں موچی دروازہ لاہور کی صفیہ مرزا کو شریک حیات بنانے میں کامیاب ہوگئے تھے، احمد ندیم قاسمی کی طرح خواجہ پرویز کا عشق بھی ناکام ہوگیا تھا جس پر انہوں نے یہ مشہور فلمی گیت تخلیق کیا تھا۔۔۔۔۔

دلِ ویراں ہے، تری یاد ہے، تنہائی ہے
زندگی درد کی بانہوں میں سمٹ آئی ہے

خواجہ پرویز کی طرح اے حمید کا پہلا عشق بھی ناکام ہوگیا تھا جس پر انہوں نے ''منزل منزل'' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانہ لکھا تھا جسے ادب لطیف نے ۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا ان کی اگر اپنی پہلی محبوبہ سے شادی ہو جاتی تو وہ افسانہ و ناول نگار نہ ہوتے، گوالمنڈی میں دودھ دہی، سری پائے یا ہریسے کی دکان چلا رہے ہوتے، محبت میں کامیاب یا ناکام ہونے والے سب ادیبوں، شاعروں کو ایک روز دنیا چھوڑ کر جانا پڑتا ہے اور ان کی جگہ نئے عاشق ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں بقول طفیل ہوشیارپوری۔۔۔

محبت کرنے والے کم نہ ہوں گے
تری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

محبت کی شادی کرنے میں کامیاب ہونے جانے والے معروف ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں میں ڈاکٹر وزیر آغا اور اے حمید کے علاوہ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، ڈاکٹر شفیق الرحمان، کرنل مجید ملک، کرنل فیض احمد فیض، صاحبزادہ محمود الظفر، سید عابد علی عابد، سید امتیاز علی تاج، حجاب اسماعیل، مصطفےٰ زیدی، احمد راہی شہرت بخاری، ساقی فاروقی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، یوسف کامران، کشور ناہید، جون ایلیا، زاہدہ حنا، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر حنیف فوق، ڈاکٹر سید معین الرحمان، ڈاکٹر طارق عزیز، سحر انصاری، شائستہ حبیب، پروین عاطف، بشریٰ رحمان، نثار عزیز بٹ، اصغر بٹ، اصغر ندیم سید، دلدار پرویز بھٹی، انور مسعود اور اعتبار ساجد بھی شامل ہیں ان میں سے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، فیض احمد فیض، حنیف فوق کی بیگمات غیر ملکی تھیں جبکہ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کلاس فیلو، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور شگفتہ چوہدری، اصغر ندیم سید اور فرزانہ میاں مرحومہ استاد شاگرد وہ جبکہ بشریٰ رحمان اور ان کے شوہر میاں عبدالرحمان ہمسائے تھے، عشق نہ پوچھے ذات برادری کے عین مطابق ان ادبی جوڑیوں کی آپس میں برادری الگ الگ تھی۔

بہت سے مشہور ادیبوں، شاعروں نے عشق میں ناکامی یا دیگر وجوہات کے باعث مجرد زندگی گزاری یا گزار رہے ہیں ان کنوارے ادیبوں، شاعروں میں میراجی، عاشق بٹالوی، شوکت ہاشمی، احمد ظفر، خاقان خاور، قمر یورش، الطاف فاطمہ، حسینہ معین، جاوید آفتاب، عامر فراز، ازہر منیر، ڈاکٹر شاہدہ دلاور شاہ وغیرہ کے نام شامل ہیں، استاد امام دین، آغا حشر کاشمیری، ایم اسلم اور استاد دامن وغیرہ نے اہلیہ کی وفات جبکہ مجید امجد، صفدر میر، ساغر صدیقی، جون ایلیا، زاہدہ حنا اور غضنفر علی ندیم وغیرہ نے علیحدگی کے بعد دوبارہ شادی نہ کرائی تھی البتہ منیر نیازی، اصغر ندیم سید اور فخر زمان نے پہلی بیوی کے انتقال پر جلد دوسری شادی کرلی تھی، علیحدگی اختیار کرنے اور دوسری شادی نہ کرنے والے بعض ادیب، شاعر، دانشور پچھتاتے تو ضرور ہوں گے تاہم کچھ دانشور بال بچوں کی پرورش میں مصروف ہوکر غم بھول گئے ہونگے بقول شاعر۔۔

ترک تعلق کیسے ہوا تھا اب تو کچھ یاد نہیں
دل نے صدمہ کیسے سہا تھا اب تو کچھ یاد نہیں

شفیق زادہ ایس احمد

میری ڈائری میری سہیلی

ایک خاتونِ خانہ کی ڈائری

دسمبر ۲۰۱۵ء کی کوئی تاریخ

میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں چھوٹی سی تبدیلی کسی بڑے بھونچال کا سرچشمہ بھی ثابت ہوسکتی ہے، کم از کم میری چھوٹی سینوکری نے تو یہی ثابت کیا ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہی ایک اسکول کو جوائن کیا ہے۔ مگر اس مختصر عرصے میں ہی روز روز کی جھک جھک سے طبیعت اتنی تنگ آگئی تھی کہ کچھ نہ پوچھو۔ پہلے تو ایمان سے ٹھاٹ سے نیند پوری کیا کرتی تھی، دو چار گھنٹے اوپر بھی ہو جائیں تو بھی پروا نہیں ہوتی۔ پھر اپنی مرضی سے اُٹھ کر ماسی میڈیا سے پورے گھر کا کام کروا کر اطمینان سے 'ہم ٹی وی' پر ممنوع موضوعات پر بولڈ ڈرامے بنا روک ٹوک دیکھا کرتی۔ شام کو بھی جب بچے اسکول ورک، ہوم ورک، پروجیکٹ اور فیس بک پر غیبت وغلو وغیرہ میں لگے رہتے تھے تو میں اسی دوران جلدی سے جم بھی ہو آتی تھی۔ آٹھ سوا آٹھ بجے بچوں کو کھانا کھلا کر، ڈانٹ پلا کر، سلا کر خود بھی میاں کے ساتھ تھوڑا بہت زہر مار کرلیا کرتی۔ اب نہ کھاؤں تو ان کا منہ بن جاتا اور کھاؤں تو فگر بگڑ جانے کی فکر۔ ان 'میاؤں' کی 'پٹ' بھی اپنی اور پٹ بھی، کچھ ان کا کچھ اپنا خیال رکھ کر ازدواجیات کو سہن کرنا پڑتا۔ یقین مانو، بھاری نہ ہو جاؤں کے چکر میں منہ میٹھا کیے بھی زمانے گذر جاتے، بس ان کی لبوں کی مٹھاس ہی سے کام چل جاتا، یعنی تعریف کے وہ ڈیڑھ اکثر بول جو کبھی کبھی صحرا میں بارش کی طرح ٹپک پڑتے، میٹھے کی ہڑک پورا کر دیتے۔ کھانا ختم کر کے میز صاف کرتے اور برتن سمیٹتے سمٹاتے ہی میاں جی کو اُنگھکیلیاں اور مجھے اونگھ کا دورہ پڑنے لگتا، تو جیسے تیسے کام ختم کر کے میں بھی سونے لیٹ جاتی۔ پھر کیا تھا، گھنٹہ ڈیڑھ میں نہ نہ ہاں ہاں کرتے کم بخت نیند آ ہی جاتی اور گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ گھوڑے بیچکر جو سوتے تو صبح آنکھ بھی آرام سے کھل جایا کرتی تھی۔ ہائے کیا دن تھے، اُف!

مگر جب سے یہ شوقیہ نوکری کا طوق گلے میں لٹکایا ہے، تب سے یہ حال ہے کہ چار بجے تھکن سے چور لڑکھڑاتے گھر میں داخل ہوتی ہوں تو سب سے پہلے بچوں کی چیں چیں، چخ چخ سننے کو ملتی ہے جو شام ڈھلے تک جاری رہتی ہے۔ ان سے جان چھوٹتی ہے تو میاں کی سرگوشیاں بھیجے کا ملیدہ بنانا شروع کر دیتی ہیں جو رات تک بھن بھن کرتے رہتے (پتہ نہیں شادی سے پہلے کن بھینسوں کے آگے بین بجایا کرتے تھے)۔ سچ کہا تھا ہماری چندا چچی نے کہ اکلوتے مرد سے شادی نہیں کرنی چاہئے ورنہ تمام زندگی آیا بن کر پالنا پڑتا ہے۔ ہمارے والے تو پالنے میں بھی منہ پھلائے رہتے ہیں جب تک کہ منہ میں ان کا پسندیدہ پکوان نہ گھسیڑ دوں، رال ٹپکتی ہی رہتی ہے۔ ندیدے پن کی بھی انتہا ہے، اونہہ!۔ ماسی

پرچی

سویڈن میں کوئی کام ''پرچی'' کے بغیر نہیں ہوتا۔ ہسپتالوں، بنکوں، اور حکومتی دفاتر سے لے کر حجام کی دکان تک کہیں بھی چلے جائیں، پرچی کے بغیر کوئی خدمت حاصل کرنا، تقریباً ناممکن ہے۔ بس داخل ہوتے ہی دائیں بائیں لگی مشین سے پرچی نکالیں اور اِس پر لکھے نمبر کا انتظار کریں۔ پرچی کے ایسے استعمال کو مرزا عبدالودود بیگ دیکھتے تو ضرور تلملا اُٹھتے:

''کیسے نادان لوگ ہیں۔ پرچی کو انصاف قائم کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ارے، اِس لئے تھوڑا ہی ہوتی ہے پرچی!''

ابنِ منیب

میڈیا نے بھی شام کو کام پر آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے 'میرے بوائے فرینڈ کو پسند نہیں کہ جب وہ گھر آئے تو میں موجود نہ ہوں'۔ کمینی کہیں کی! کسی نے زیادہ پیسے دیے ہوں گے تو اسی طرف پھسل گئی ہوگی۔ اب تو عالم یہ کہ چار بجے گھر میں گھسنے کے بعد، صفائی شروع کرتی ہوں اور ساتھ ہی شام کے کھانے کی تیاری بھی چل رہی ہوتی ہے۔ بچوں کے قضیے نمٹانا بھی میرا ہی کام ہے، میں تو فیصلہ صادر کر دیتی ہوں، معزز عدالت کی طرح، عملدرامد ہو یا کچھ برامد نہ ہو، بھاڑ میں جائے، اس سے زیادہ انصاف کی تحریک میرے اندر نہیں ہے۔ میں کونسا کسی بحالی تحریک میں بھگا کر لائی گئی ہوں۔ اس گھر میں باقاعدہ بیاہ کر برامد کیا گیا ہے مجھے، وہ بھی کسی این آر او کے بغیر، تو بھلا میں کیوں اوقات سے بڑھ کر بڑھک مار کر اپنا بیڑہ غرق کروں۔ ویسے بچوں کو بھی اب بڑا ہو جانا چاہئے، کب تک باپ کی طرح بچّہ بنے رہیں گے۔ خیر، ہاں تو میں یہ تو بتانا بھول ہی گئی کہ کھانا کھلانے کے وقت کمر تختہ ہو رہی ہوتی ہے۔ چار سیزرین کے بعد پاؤں بھاری تو کیا سُن ہونے کے تصور سے بھی کانپ جاتی ہوں، مگر یہ آسان سی بات اِن کے بھیجے میں کون پہنچائے۔ عشاء تک تمام کام کاج سے فارغ ہو جاتی ہوں، بلکہ یہ کہو کہ ایک مختصر سا وقفہ ملتا ہے تو وظیفہ پڑھنا جو شروع کرتی ہوں تو تسبیح ہاتھ میں پکڑے پکڑے یہی بستر پکڑ لیتی ہوں۔ اس طرح تمام طرح کے (وظائف) و معمولات سے فراغت کے بعد کوئی بارہ بجے جو بے خبر سوتی ہوں تو یہ بھی نہیں پتہ چلتا کہ آج کل یہ صرف نیٹ پر ہی چیٹنگ کر رہے ہیں یا آفس میں چھوڑے موبائل سے صرف 'ایس ایم ایس اور وہاٹس ایپ' پر ہی گذارہ ہے، اونہہ! میری بلا سے (لیکن پھر بھی؟ معلوم تو ہونا چاہئے)۔ ادھر اسکول کے بین الاقوامی بچے؟ اف توبہ، اتنے خاندانی کہ کسی شریف آدمی کو اپنے بچوں کی تربیت کرنی پڑے تو، ان سے بڑھ کر کوئی اور مثال نہیں ہو سکتی۔ یعنی، بس ان تمام حرکات سے اجتناب کرایا جائے جو یہ بچے کرتے ہیں، تربیت خود بہ خود ہو جائیگی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کسی سانچے میں ڈال کر ان جیسے گدھوں کو مرغا بنا دوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر گدھوں کو مرغا بنا دوں تو بار برداری کون کرے گا۔ اس سیڑھ کر یہ نقصان کے وقت پڑھنے پر ہمارے سیاست دان، باپ کسے بنائیں گے۔

آج بہت دنوں کے بعد شمسہ کا فون آیا تھا۔ میں اس وقت باتھ روم میں ہارپک لگا رہی تھی، فون پاں پاں کرتے کرتے جب تھکنے لگا تو میں نے کال ریسیو کی اور ہانپتی سانسوں میں ہیلو ہیلو کہا۔ میری ہولائی ہوئی ہیلو سن کر اس عپوچھا 'اتنی دیر بعد فون پک کیا، خیریت تو ہے'۔ اس کے لہجے میں شرارت اور کمینہ پن ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے کہا 'اس وقت بہت بزی ہوں'۔ اس نے شاید مزاقاً یا طنزیہ سوال کیا 'کیوں؟ کیا میاں نے چھٹی کی ہے'۔ جھوٹ تو میں بولتی نہیں، سب جانتے ہیں، صاف جواب دیا کہ 'جی نہیں، وہ آج ہی تو کام پر گئے ہیں، سوچا میں بھی دوسرے کام نبٹا لوں، کیا خبر لنچ پر پھر آدھمکیں۔ وہ بہت کمینی ہے، کہنے لگی 'کرموں کا بھوگ بھگت رہی ہو؟'۔ میری ہنسی چھوٹ گئی 'بھوگ نہیں بُھوت'۔

اچھا بھئی اب مزید نہیں لکھا جاتا، بہت نیند آرہی ہے، انہوں نے باتھ روم کی لائٹ تو گُل کر دی ہے، اب کچھ ہی دیر میں کمرے میں بھی 'اندھیر' ہونے والا ہے، ہاہاہا۔ ششششش!! چُپ

ڈیئر ڈائری باقی باتیں کل، سایونارا

سکندر حیات بابا

مولبیوں کی اقسام

محترم ومحترم قارئین ،خوش قسمتی ،بد قسمتی ،یا پھر اتفاق سے اگر آپ میری یہ تحریر پڑھ رہے ہیں اور آپ نے اسے پڑھنے کا فیصلہ عنوان دیکھ کر کیا ہے،تو یقیناً آپ محبت ،ہمدردی یا پھر ''دھلائی'' کے لائق ہیں ،کیوں کہ مولوی سے دلچسپی مولوی کو ہی ہو سکتی ہے یا پھر کسی مولبی کو یا مولبیوں کے ڈسے ہوئے کو، مولوی تو یقیناً آپ جانتے ہی ہوں گے وہ شخص جو مسائل دین سے واقف ہو پڑھا لکھا،فقیہہ،اور فاضل آدمی، یہ محبت کے لائق ہوتا ہے،جبکہ مولبی اس شخص کو کہتے ہیں جو اَن پڑھ جاہل یا پھر پڑھا لکھا جاہل ،مسائل دین سے ناواقف اور مکمل طور پر ہی ''فاضل'' ہو،اسے ''دُھلائی'' کی اشد ضرورت ہوتی ہے، جبکہ اس کے ڈسے ہوئے قابلِ ہمدردی ہوا کرتے ہیں۔

پچھلے زمانوں میں مولوی کم اور عام لوگ زیادہ ہوتے تھے ،آج کل عام لوگ کم اور مولوی زیادہ ہو گئے ہیں ،دراصل برساتی مینڈکوں کی طرح ہر جگہ پھدکتے مولیانہ شکل کے یہ لوگ مولوی نہیں مولبی ہوا کرتے ہیں ،آپ نے سنا ہی ہوگا ،نیم حکیم خطرہ جان نیم ملا خطرہ ایمان ۔۔۔ یہی وہ ملا ہیں جنھیں ہم مولبی کہتے ہیں۔

جو مولوی ہوتا ہے اس کے اندر انسان اور انسانیت سے محبت رہتی ہے اور جو واقعی انسان ہو، اسے ''مولبی'' سے نفرت ہو جاتی ہے۔حضرت انسان جتنا پرانا ہے مولوی اور مولبی بھی اتنے ہی پرانے ہیں ،بلکہ شاید اس سے بھی پہلے کے جب زمین پر آتش مخلوق کا بسیرا تھا ، وقت کے ساتھ ساتھ '' مولبیانہ انداز'' بھی ارتقائی مراحل سے گزرتا ہوا آج اکیسویں صدی میں نیا روپ اختیار کر گیا ہے ،بلکہ مولبی کا کوئی ایک روپ نہیں ہوتا مولبیانہ روپ اتنے زیادہ ہیں کہ ٹھیک سے تمام کا بیان ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

آج ہم قدیم اور جدید ''مولبیوں'' کی کچھ اقسام بیان کریں گے۔

۱۔ ڈسکو مولبی

ڈسکو مولبی جدید دور کا سب سے بڑا فتنہ ہے،عجیب سا مضحکہ خیز حلیہ،گلے میں دوپٹہ یا ''پٹے'' ٹائپ کا کوئی رنگین رومال، کرتا تو اس اہتمام سے پہنا جاتا ہے گویا اس کے علاوہ باقی تمام لباس حرام ہوں۔ ڈسکو مولوی بڑا ہی نٹ کھٹ واقع ہوتا ہے۔ یہ باجی باجی کہہ کر ''مستورات'' سے کچھ یوں بے تکلفانہ انداز میں خطاب کرتا ہے کہ کئی مستورات ''مستور'' نہیں رہتیں۔

ڈسکو ''مولبی'' نعت گانوں کے انداز میں ایسے جھوم جھوم کر پڑھتا بلکہ گاتا ہے کہ سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا ہے اور سامعین عالمِ وجد میں ''مولبی'' اور ''سندری بائی'' کے درمیان فرق بھول جاتے ہیں۔ پھر وہی کوٹھے کا منظر ہوتا ہے، دولت ہوتی ہے۔فرق ہوتا ہے تو بس اتنا کہ دولت یہاں جن قدموں

میں پڑی ہوتی ہے ان میں گھنگرو نہیں ہوتے۔

۲۔ نجومی مولبی

یہ والے مولبی صاحب خاص کر خواتین میں بہت ہی زیادہ مقبول ہوتے ہیں۔ نوکری کا مسئلہ ہو، چٹ منگنی پٹ بیاہ کی بات ہو، گھریلو ناچاقی کا معاملہ ہو، شوہر دوسری عورت پر فریفتہ ہو یا پھر آپ محبوب کو اپنے قدموں میں چاہیں، نجومی ''مولبی'' صاحب کی خدمات حاضر ہیں، یہ الگ بات کہ اکثر اوقات شوہر کو قبضے میں کرنے کی خواہش رکھنے والی خواتین ان مولبیوں کے قبضے میں چلی جاتی ہیں۔ اِن ''مولبیوں'' نے تمام عبادات خاص کر نمازیں معاف کروا رکھی ہیں اور خود کو مکمل طور پر ''خدمت خلق'' کیلئے وقف کر رکھا ہے۔ نجومی ''مولبی'' کمال کے مکار ہوتے ہیں اور غضب کے کمینے بھی، یہ مکار زیادہ ہوتے ہیں کہ کمینے اس بات کا فیصلہ گیارہ ممالک کی پولیس کو مطلوب ڈان کو پکڑنے کی طرح مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

۳۔ کمرشل مولبی

کمرشل مولبی خاص مواقعوں پر اپنے فن مولبیانہ کے اظہار میں ماہر ہوتا ہے۔ اسے تمام برگزیدہ ہستیوں کی تاریخ پیدائش و تاریخ وفات زبانی یاد ہوتی ہے اور موقع مناسبت کے حساب سے ان کا عرس خوب اہتمام سے منعقد کرتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی مہینہ اس طرح کے کسی واقعے یا سانحے سے محروم ہو تو یہ دور دراز علاقے کا اپنا کوئی ''سائیں مست قلندر بابا'' دریافت کر کے اس کے چہلم عرس کے مواقع پیدا کر لیتا ہے۔ عوام کو ٹوپی پہنانے کے لئے اسے ہری نیلی پیلی کالی یا کسی بھی رنگ کی پگڑی پہننے یا پہنے رکھنے پر کوئی اعتراض نہیں، پگڑیوں کا بیوپار کرتے ان مولبیوں کو حقیقی معنوں میں دین فروش کہا جاسکتا ہے۔

۴۔ میڈیائی مولبی

میڈیائی مولبی میں ایک اچھی اداکارہ کی تمام خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں یعنی یہ میڈیا میں ان رہنے کے گر یا ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ یہ بیک وقت ڈسکو مولبی، کمرشل مولبی اور نجومی مولبیوں کی تمام خصوصیات کا حامل ہوسکتا ہے۔ میڈیائی مولبیوں کی بھی دو اقسام پائی جاتی ہیں۔۔۔ ایک سرکاری اور دوسری قسم غیر سرکاری۔ سرکاری مولبی کا کام حاضرِ وقت حکمران کو خلفائے راشدین کے ہم پلا قرار دینا اور غیر سرکاری مولبی کا کام خود کو وقتِ حاضر کا مجدد الف ثانی ثابت کرنا ہوتا ہے۔ میڈیائی مولبی کا ظاہری حلیہ ''مولیانہ'' ہونا بھی ضروری نہیں۔ یہ کلین شیو یا فرنچ کٹ سٹائل کا حامل بھی ہوسکتا ہے، عموماً ان کے پروگرامز کے نام ''عالم آن لائن''، ''قطب آپ کی خدمت میں حاضر'' ٹائپ کے ہوتے ہیں۔

۵۔ٹھیکیدار مولبی

ٹھیکیدار مولبی سے مراد ہرگز وہ لوگ نہیں جو ٹھیکیداری میں دونمبری کرتے ہیں بلکہ یہ ان لوگوں کا ذکر ''خیر'' ہے جنہوں نے جنت اور دوزخ کے لئے بھرتی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔قلم کی ایک جنبش سے یہ کسی کو بھی کافر قرار دیکر جہنم کا حقدار بنا سکتے ہیں۔ مزید کسی گناہ پر مانگی گئی معافی کو قبول کرنے نہ کرنے کا بھی یہ اختیار رکھتے ہیں۔ٹھیکیدار مولبی ''نذرانہ'' ملنے پرکوا حلال یا پھر حصہ نہ ملنے پر مرغی حرام کرسکتا ہے۔آپ خوش رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیکیدار مولبی کی خوشی کا خیال رکھیے ورنہ دونوں جہاں کی بربادی کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے۔

۶۔مسلکی مولبی

مولبیوں کی یہ قسم ٹھیکیدار مولبیوں کی تمام خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔شیطان کی طرح ان کی زندگی کا بھی صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے شر انگیزی۔۔۔ جمعے کے خطبات پر پابندی عائد کردی جائے یا پھر انہیں کسی قانون کے تحت کردیا جائے تو مسلکی مولبیوں کی جان پر بن سکتی ہے۔ ہفتے کے تمام دن باہمی معاملات میں لوگ اگر ایک دوسرے کے قریب ہو رہے ہوں، ان کے درمیان بھائی چارہ پیدا ہو رہا ہو تو جمعے کے روز یہ محبت کے ایسے تمام جراثیم کا خاتمہ کردیتے ہیں۔دانشمندوں کا کہنا ہے کہ ان کی اس عادتِ بد کی وجہ ان کے پیٹ کی آگ ہے لیکن بعد از مشاہدہ و تحقیق ہم نے جانا کہ یہ آگ وجلن پیٹ کی نہیں بلکہ اس جگہ پر ہوتی ہے جو ناقابل اشاعت و ناقابل بیان ہے۔

مولبیوں کی اور بھی بہت سی اقسام ہیں لیکن چونکہ ہم نے ان مولبیوں اور ان کے چاہنے والوں کے درمیان رہ کر ہی کاروبار ذیست کرنا ہے سو اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اس امید کے ساتھ کہ آپ مذکورہ بالا تمام مولبیوں کے شر سے خود بھی بچے رہیں گے اور دوسروں کو بھی محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔

بیوی میاں حادثے کے بعد ہسپتال میں

زخم گہرے ہیں! ٹانکے لگیں گے!!

کتنا خرچا آئے گا؟

تین ہزار لگیں گے!!

ڈاکٹر جی! ٹانکے ہی لگوانے ہیں! یا کڑھائی بھی کروانی ہوگی!!

ارمان یوسف

یادِ ماضی ثواب ہے یارب

مظفرگڑھ کے اکلوتے فیاض پارک کے کونے میں بیٹھے بیٹھے خدا جانے ایک روز کیا سوجھی کہ نوجوانوں کی نمائندہ ادبی تنظیم کی تشکیل کا خیال آیا اور یوں ''ترین ادبی فاؤنڈیشن'' کی بناڈال دی۔ چیئر مین کا قرعہ راشد ترین کے نام کا نکلا، صدر ہم بن بیٹھے اور کچھ نوجوانوں کو فون پر ہی عہدے بھی دے دئے گئے اور فون پر ہی مرزا غالب کی روح کو گواہ بناتے ہوئے حلف نامے بھی لے لئے گئے۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ مظفر گڑھ میں ''علی بابا'' کے نام سے ایک مقامی ٹی وی چینل اپنے آغاز کے ابتدائی دنوں میں تھا، خدا جانے ٹی وی والوں کو ''چالیس چور'' ملے یا نہ ملے البتہ رضا ٹوانہ، افضل چوہان اور سلیم ہتکانی کے دبستانِ رضا وعباس صادر، اصغر گورمانی کے سانجھ ادبی سنگت کے پلیٹ فارم سے ایک سو چالیس شاعر ضرور مل گئے۔ چونکہ ان کے پاس پروگراموں کی کمی تھی اور ہمیں کوئی دوسرا چینل پوچھتا ہی نہیں تھا، لہذا ہماری میزبانی اور راشد ترین کی صدارت میں ''ترین ادبی فاؤنڈیشن'' کے پہلے ہی مشاعرے کو انہوں نے دن رات چلا چلا کر اس وقت تک بند نہیں کیا جب تک کہ پورا شہر سراپا احتجاج نہیں بن گیا۔ مظفر گڑھ کے ادبی مورخ ظریف احسن تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ماؤں نے سکولوں کے بھگوڑے اور شرارتی بچوں تک کو ہمارے مشاعرے کے ذریعے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا تھا کہ خبردار باز نہ آئے تو ''ارمان'' والا مشاعرہ چلوا دیں گے ایک ہی نشست میں پورا دیکھنا ہی نہیں بلکہ سننا بھی پڑے گا۔ سنا ہے مظفر گڑھ کی آدھی سے زیادہ نئی نسل تو یوں ہی سدھر گئی۔ اب حکومت وقت کی بے حسی بھی ملاحظہ کیجئے ، اعزازات سے تو کیا نوازتے الٹا پابندی لگانے کی سازشیں تیار ہونے لگیں۔ چونکہ نوجوانوں کی نمائندہ تنظیم تھی لہذا پہلے مشاعرے میں صابر انصاری کو بطور مہمانِ خصوصی ملتان سے بلوایا گیا تھا اور انصاری نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ بچپن میں بھی خضاب لگا کر، بچپن کا کرتہ بازوؤں میں اٹکا کر کم از ٹی وی سکرین پر جوان ضرور نظر آیا جا سکتا ہے۔ انہیں مشاعروں میں ملتان سے استاد فدا ملتانی، اسلم ہمدم، مامون طاہر، نبیل طور، اجمل خاموش اور ملک اکبر اٹھنگل آنے لگے اور بدلے میں ہم بھی ملتان کو رونق بخشنے لگے۔ ہمارے رقیب روسیاہ ملک الموت کی ''حرکت' ملاحظہ کیجئے کہ اب کے سیدھا ہمارے دوست ملک اکبر اٹھنگل ہی کو لے اڑا۔ ابھی تو رضا ٹوانہ جیسے شاعرِ بے بدل اور مہربان دوست کا دکھ نہ بھلا پائے تھے کہ ایک اور صدمہ جھیلنا پڑا۔ عزرائیل کو راہِ راست پہ لانے اور اپنے دوستوں سے دور رکھنے کے لئے لگتا ہے غالب و

اقبال کی روحوں کو خط لکھنا ہی پڑیگا۔ ہفتہ بھر قبل ہی ملک اکبر اٹھنگل کی موت کی روح فرسا خبر ملی۔ پرت بہ پرت یادکی تہیں اترنے لگیں۔ منفرد طبیعت اور جداگانہ اندازِ بیاں کے حامل اکبر اٹھنگل کا ہمارے مشاعروں میں بطورِ خاص شرکت کرنا شاعری سے بڑھ کر ایک الگ نشہ سا تھا۔ وہ ہمیشہ ڈائری ساتھ لاتے اور کوشش بھی یہی ہوتی کہ آج کے مشاعرے کو پہلا اور آخری جانتے ہوئے داستانِ غم ایک ہی قسط میں بیان کرتے جائیں۔ گلے میں خراش اور دھیمی آواز ہونے کے ناطے آخری صف والے سامعین تو محض اندازِ بیان سے ہی کام چلاتے ہوئے داد دیا کرتے تھے۔ مہربان اس قدر کہ طبیعت کی ناسازی ہو یا موسموں کی سازش، ایک ہی گزارش پہ کھنچے چلے آتے تھے، اور کہتے: ''ارمان یار میں تاں بس تیڈے واسطے آنداں'' دیکھا جائے تو ان کے اس قول میں ذرا بھی شک کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ جتنی داد انہیں مظفر گڑھ سے ملتی تھی اس سے کہیں زیادہ تو وہ ملتانی گوبھی کے پھولوں سے وصول کر سکتے تھے۔ یوں ادلے کے بدلے ہمارا بھی ملتان آنا جانا شروع ہو گیا۔ ان کے ہاتھ سے لکھی ایسے ہی ایک مشاعرے کی رپورٹ اخبار کے مدیر تک پہنچی جس میں انہوں نے لکھا'' مشہورِ زمانہ شاعر ارمان یوسف ۔۔۔۔'' ادبی صفحے کے انچارج نسیم شاہد نے کہا بھئی باقی تو ٹھیک ہے مگر یہ ارمان کے مشہورِ زمانہ والی لکیر کاٹنا پڑے گی۔ اسی بات پہ اڑ گئے اور کہنے لگے ''کیوں نہیں، وہ ایک مشہورِ زمانہ شاعر ہے اور آپ کو بھی ماننا پڑے گا'' ان کا یہ دعویٰ چونکہ محبت اور شفقت کی بنا پر تھا، لہٰذا اخبار نے بھی جوں کی توں رپورٹ شائع کر دی۔ یہ ان کی شخصیت ہی کا جادو تھا ورنہ اپنے شہر سے باہر ہمیں جاننے والا تیسرا شخص وہ خود ہوں گے۔ دراصل وہ سراپا محبت تھے، ان کی دنیا، ان کی کائنات اور ان کا زمانہ محبتوں کی سرحد سے شروع ہو کر محبتوں کے دیس ہی میں آ کر ختم ہوتا تھا۔ جب ان کی موت کی خبر ملی تو سوچا ایسے یارِ طرح دار کی عارضی جدائی پہ ماتم کرنے کی بجائے اس کی ازلی و ابدی دوستی پہ ناز کرتے ہوئے کیوں نا حسیں یادوں کی ایک شام منائی جائے۔ شہر کی ویران سڑکوں میں اکثر خود ہی تنہائیوں کی شال اوڑھے اگرچہ وہ

حصّہ بقدرِ جثّہ

اکثر اداس ہی پائے جاتے مگر دوستوں کی محفل میں جیسے گلاب سا کھل اٹھتے؛ دامے درمے سخنے سفنے ہر ایک محفل کی رونق، ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک۔ کیا خبر اب بھی موت کی سرحد کے اس پار نئی دنیا کی رونقوں اور اسرار و رموز کو تازہ با تازہ کلام میں ڈھالے ،ایک ڈائری سی ہاتھوں میں اٹھائے، چمکتی آنکھوں میں بچوں کی سی حیرانی لئے غزل ہی گنگنا رہے ہوں۔ یہی سوچ کر اس پورے دور کو یادِ ماضی کا عذاب سمجھ کر دکھ جھیلنے کی بجائے ان کی ہنستی بستی شخصیت کو خراجِ عقیدت اور ایصالِ ثواب کے لئے ان کی محبت و شفقت کی تسبیح کا دانہ دانہ پھیرنے کو جی چاہا۔

ملک اکبر ٹھنگل کے شہر ملتان میں جہاں کئی نامی گرامی شاعروں سے پالا پڑا وہاں طٰہٰ قریشی کے چھوٹے بھائی رضوان قریشی سے بھی ملنا ہوا جو اِن دنوں 'شازلی' تخلص کرتے تھے۔ ان کی شاعری کو بھی ہم نے قیامت ہی کی ایک نشانی گردانتے ہوئے آخرت پہ اور بھی یقین پختہ لیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے طاہر قریشی بھی ''نہر کنارے'' عنوان کی ایک نظم گنگنانے لگے تھے، خدا معلوم ابھی تک نہر کنارے ہی بیٹھے ہیں یا شاعری کے سمندر میں ڈبکی لگا چکے۔ ان کو بھی ہم نے مظفر گڑھ میں منعقدہ مشاعروں کے لئے پھسلایا تو بہت کہ اکبر ٹھنگل آسکتے ہیں تو آپ کیوں نہیں۔ ہر بار یہی کہتے ''بھئی واپس آتے آتے کافی دیر ہو جائے گی اور رات کے اندھیرے میں گاڑی چلانا میرے لئے آسان نہیں۔ دن دن کی کوئی محفل ہو تو اور بات ہے'' دن کو ہم مشاعرہ رکھ نہیں سکتے تھے کہ اس بارے میں رضا ٹوانہ مرحوم کے واضح احکامات نازل ہو چکے تھے: ''دیکھو! 'ش' سے جتنی چیزیں شروع ہوتی ہیں وہ شام کے بعد ہی اچھی لگتی ہیں مثلاً شاعری، شراب، شبِ مہتاب، شبِ وصل و فراق۔۔۔۔'' یہ اور بات کہ ہم بھی ہر بار سر جھکائے یہی عرض کرتے: ''حضور ہمیں تو 'ش' سے شرم ہی آتی ہے وہ بھی شام سویرے'' اب اس قدر واضح احکامات کے باوجود بھی شام سے پہلے پہلے مشاعرہ رکھ کے گنہگار تو نہیں ہو سکتے تھے۔ بزرگ فرماتے ہیں کہ جنت کا حصول اتنا آسان بھی نہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اب اگر حاسدینِ بد کے اکسانے پر کوئی سر پھرا فرشتہ روزِ قیامت یہ سوال کر لے کہ شام سے پہلے مشاعرہ کیوں رکھا تھا؟ تو اس کو کیا جواب دیں گے؟ آپ کی ناز برداریاں کرتے کرتے ہم تو گئے جنت الفردوس سے بھی!

اب تو خود طٰہٰ قریشی بھی صاحبِ کتاب بنے پھرتے ہیں۔ اپنی اس آپ بیتی ''میرا جہاد۔ چک نمبر ۴۴۴ سے بکھنگم پیلس تک'' میں زندگی کی تلخ و شیریں تہوں کے پرت کھولتے کہیں حیرانی سے روشناس کراتے ہیں، کہیں ناممکن کے حصول میں بھی سرخرو نظر آتے ہیں اور ایم بی ای کا اعزاز اپنے نام کرتے ہیں، وطن سے محبت سب جگہ نمایاں ہے۔ حکومتِ وقت کو چاہئے کہ محبت پہ بھی ٹیکس لگا دے، دیکھتے ہی دیکھتے خزانہ بھر جائے گا۔ دل مگر خالم خالی ہو جائیں تو یہ بات اور ہے۔ جن حضرات نے موقع ملنے کے باوجود ابتک یہ کتاب نہیں پڑھی تو ان کے لئے گزارش ہے کہ اپنے علمی و ادبی ذوق پہ ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھ لیں۔ تو بات یہاں پہ آ ختم ہوتی ہے کہ عزیز دوستوں کی میت پہ افسوس کرنے کی بجائے زندہ لاشوں کا ماتم کیا جائے۔ مسائل کے گرداب بھی اپنی جگہ، حالات کے آہنی شکنجے بھی بجا مگر اپنے چاہنے والوں اور دوستوں کے لئے ذرا سا وقت نکال کے نفرتوں کی دیوار پھلانگتے ہوئے وقت کے کورے ہاتھوں میں خوشیوں کے کنگن پہنائے جا سکتے ہیں۔ باغوں میں گاتی کوئل کے ابدی گیت سے اب بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ ضروریات کو کم سے کم کر کے بھی سادہ مگر پر لطف زندگی کے دلچسپ کھلونے سے جی بہلایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ہمدمِ دیرینہ ملک اکبر ٹھنگل کی شاعری سے کوئی شام سجائی جا سکتی ہے۔ اور آخر میں رضا ٹوانہ مرحوم کے دو اشعار، ملک اکبر ٹھنگل مرحوم کے نام!

بچھڑ کے پھر بھی ملیں گے یقین کتنا تھا
یہ ایک خواب تھا لیکن حسین کتنا تھا
مجھ ہی کو دے گیا الزام بے وفائی کا
حسیں تو خیر وہ تھا ہی، ذہین کتنا تھا

ذہین احمق آبادی

پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

دوشیزگان، خواتین اور خواتان کے ضخیم رومانوی، ڈیڑھ دو انچی کے ناول بلا کھٹکے اور تکان ایک ہی نشست میں پھانکنے والوں کو ہماری ''دوتین'' بالشتی تحاریر پڑھتے ہوئے کوفت ہوتی ہے... اور اس سے ہم کوفتہ... حالانکہ دو اور تین تو وہی ''دو''شیزہ اور خوا''تین'' سے درآمدہ ہیں۔۔۔قطع نظر اس سے کہ نام کی دوسری طرف سے کوئی حضرت موصوف زنانہ مسکراہٹ کے ساتھ برآمد ہوں اور شرماتے لجاتے، انگلیاں مروڑتے، پلکیں گراتے اٹھاتے اپنے پرویز ہونے کا اعلان کریں جبکہ پیچھے سے خم ہائے کاکلِ پُر بہار پروین کے ہی محسوس ہوتے ہوں، ایسے ہی لوگوں کیلیے میں نے اوپر''خواتان'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اور آپکو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان خواتان میں کیسے ''بڑے بڑے'' مصنفین شامل رہے ہیں۔ اسی طرح ہر تخلیقی میدان خاص طور پر شاعری اور نثر میں طبع آزمائی کرنے والے اپنے کسی کارنامے کے باعث مشہور ہو جاتے ہیں اور انکے باقی کارنامے انکی وجہ سے مشہور ہو جاتے ہیں...!

ایک دن یونہی محوِ خرام تھا کہ ''ذہین احمق آبادی'' اور ''محترم اوٹ پٹانگ'' سے ملاقات ہوگئی۔۔۔ دونوں برسرِ پیار ارررر پیکار تھے، اور اس بات پر لڑ رہے تھے کہ سردیوں میں سورج کی حدت محسوس کرنے بعد کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''پے گئی اے ٹھنڈ۔۔۔؟'' لیکن دونوں اس بات پر متفق تھے کہ سردیوں میں لحاف سے باہر کیا نکلو، سربستہ مائع بھی سردی کے باعث باہر نکلنے کو بیتاب ہو جاتا ہے۔۔۔کافی نوک جھونک ہوئی مگر سوال حل ہونا تھا نہ ہوا۔۔۔!

محترم بولا۔۔۔''کیا سمجھتا ہے بے۔۔۔ میں اڑتے پروں میں چڑیا گن لیتا ہوں، ایک ہی ہوتی ہے۔۔۔!''

ذہین بھی کہاں پیچھے رہنا والا تھا۔۔۔ مزہ لے کر بولا ''ابے یہ تو کوئی بھی بتا سکتا ہے، میں تو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اڑتی چڑیا کے کتنے پر ہیں۔۔۔دو ہی ہوتے ہیں۔۔۔ہاں!''

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو کڑے تیوروں سے گھورنا شروع کر دیا۔ اس سے پہلے کہ اگلا مرحلہ شروع ہوتا لفاظی کا میں نے بیچ بچاؤ کرایا۔۔۔ ورگرنہ دونوں کو ایک دوسرے سے خدا واسطے کا ''بیر'' ہے جو ایک ''آم'' سی بات ہے کیونکہ اکثر دونوں ایک ہی سیبوں جیسے گال والی پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور رفاقت و رقابت کی پیچیدہ گتھی سلجھانے کو ہم ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ فی الاصل ان میں اور کلینڈر میں فقط ایک ہی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ کلینڈر میں ہر روز ایک ''ڈیٹ'' ہوتی ہے۔

ان کا حصہ من و سلویٰ
اپنی قسمت دور کا جلوہ

اور ہوتا یہ تھا کہ دونوں رقابت نبھاتے رہ جاتے تھے اور کوئی تیسرا آ کر ڈنڈی مار جاتا تھا اور یہ دونوں ایک دوسرے کے سے منھ لے کر رہ جاتے تھے، پھر مل کر خوب خوب کیڑے نکالتے تھے اس میں اور ایسے مطمئن ہو جاتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

محترم کی حالت تو اس وقت دیکھنے والی ہوتی تھی جب محفل میں کسی جاننے والے کی بیگم اس سے اسکی بیگم کی خیریت دریافت کرتی تھی ”بھابھی کیسی ہیں؟“

وہ چونک کر سراسیمہ ہوتا بولتا ”کون سی؟“

مسئولہ حیرانی سے پوچھتی ”اوہ تو کیا آپ نے تا حال شادی ہی نہیں کی؟“

اب کے ذہین ذرا اس کی مدد کرتا اور اسکا پندار مجروح ہونے سے بچاتا ان الفاظ میں کہ ”محترم کا اصل میں مطلب تھا کہ کونسی بھابھی، دراصل اس نے چار چار کر رکھی ہیں نا تو یہی دریافت کر رہا تھا کہ کونسی والی!“

مجھے اس دن کا انتظار ہے جب خواتین بھی مردوں کے ”شانہ بہ شانہ“ ان کے حقوق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے 'کثرتِ ازواج' پر لکھیں گی کیونکہ کثرتِ ازواج کا بالآخر فائدہ عورتوں کو ہی ہوگا اور مردوں کا یہ بنیادی حق ہے۔۔۔ آہاں، مجھے معلوم ہے۔۔۔ احمقوں کی جنت، میں وہاں نہ رہونگا تو اور کون رہے گا!

خیر۔۔۔ موصوفہ کی حیرت دوچند ہو جاتی کیونکہ محترم کی منحنی سی شخصیت اور جسم دیکھ کر یہ باور نہ آتا تھا کہ محترم، ذہین کو احساسِ ممنونیت سے دیکھتا مگر اسے کیا معلوم ہوتا تھا کہ اسکی بات ابھی ختم نہیں ہوئی، ذہین اپنے مزے میں بول رہا ہوتا ”یہاں تک کہ جب اسکی شادی ہوئی تو لڑکیاں یہ گانا گاتے ہوئے پائی گئی تھیں:

دولہے کا سہرا پرانا لگتا ہے

اب کہ محترم ذہین کو کینہ توزی سے دیکھتا اور وہ مزید حیران ہوتی، سوال پوچھتی ”اوہ۔۔۔ تو کیا چاروں شادیاں ایک ہی سہرے میں بھگتائی تھیں؟“

ذہین چٹخارے لیتا بولتا ”دراصل واقعہ یہ ہوا کہ محترم نے کہیں پڑھ لیا تھا کہ کھانے کے دوران جگہ تبدیل کرنے سے شادی ہو جاتی ہے، اس احمق نے ایک ہی کھانے میں چار چار دفعہ جگہ تبدیل کر لی۔۔۔ یہ سمجھا تھا کہ یہ فوری نتائج کیلئے اکسیر ہوگا مگر یہ تو الٹا ہو گیا۔۔۔ اب چار چار اسے بھگت رہی ہیں اور یہ انھیں۔۔۔!“

وہ محترمہ تو فوراً اپنے نصف بہتر کی طرف متوجہ ہو جاتی جو کھانے کے دوران اپنی جگہ کئی دفعہ بدل چکا تھا اور اب کے محترم سے رہا نہ جاتا اور وہ بلا تکلف ذہین کے چہرے پر ایک عدد مکا مصرع طرح کی مانند عرض کر دیتا اور پھر جو باقاعدہ غزل شروع ہوتی تو زمین کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے تھے دونوں بلکہ اکثر بلا بحر ہی قافیے باندھتے تھے جن میں ردیف ہمیشہ مُنھ سے اول فول کا جھول ہوتا تھا۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ آزاد شاعری کرنا شاعری کی ناکامی ہے، یا تو وہ کاہل ہے کہ اپنی پیچیدہ خیالی کو شعر میں نہیں باندھ رہا یا پھر وہ شاعر ہونے کے زعم میں ہے اور اپنے خیالات کو نثر میں باندھنا اپنی توہین سمجھتا ہے۔ آزاد شاعری سے بہتر بندہ نثر ہی لکھ لے، کم از کم مرتجز (مقفہ نثر) تو بن ہی جائے گی۔

شاعری سے ایک اور بات یاد آئی۔۔۔ ایک دفعہ ذہین سے ایک شاعرہ نے باتوں کے دوران کہہ دیا۔

ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جوڑنے اور عملِ جراحی کے بارے میں اب تک ہمارا علم ”فیکے پہلوان“ اور ”بیجے جراح“ کی ان سرگرمیوں تک محدود تھا جن کا مشاہدہ ہم بچپن سے کرتے رہے تھے۔ فیکے پہلوان کا ”ٹھیا“ فتے کے تندور کے عین سامنے تھا جبکہ بیجا جراح بڑے بازار میں ایک دوکان کا مالک تھا، جس کے دروازے پر شیشے لگے ہوئے تھے اور ماتھے پر ایک بڑا سا بورڈ، جس پر جلی حروف میں لکھا تھا ”**پیرس ہیئر کٹنگ سیلون**“ اس بورڈ کے ساتھ ہی ایک چھوٹا بورڈ بھی تھا جس پر یہ عبارت درج تھی ”**یہاں دیگ پکوائی اور ختنوں کا اعلیٰ انتظام ہے۔**“

فیکا پہلوان ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے جوڑنے بٹھانے اور بیجا جراح کچے پھوڑوں کو پکانے اور انہیں چیر دینے کے لئے مشہور تھا۔

جنٹلمین سبحان اللہ از کرنل اشفاق حسین

"مجھے شاعری سے پیار ہے۔"

ذہین نے بھی یہی جملہ دہرا دیا مگر شاعری کے "ی" کو "ہ" سے بدلنے کے بعد۔۔۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، کیونکہ اس کا شوہر پاس ہی کھڑا تھا۔۔۔ پس وہ وہاں سے بے نیل و مرام کے ساتھ ساتھ با نیل و مرہم بھی لوٹا۔

ایک خاتون پچھلی کھڑکی پر بور کر رہی تھیں کہ مرد اتنی ساری عبادات کر کے خواتین سے بازی لے جاتے ہیں اور اُن کا دل کڑھتا رہتا ہے۔۔۔ کہنا بس یہ تھا کہ خواتین کو شوہر کی بات ماننے پر اجر ثبت ہے مگر میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ بیوی کا حکم ماننے سے شوہر کو اجر کیا نجر بھی نہیں ملنے کا۔ عورت کے بچے جو کچھ اچھا کریں گے اُس کا ثواب تو اسے ہی پہنچے گا اچھی تربیت کے عوض۔۔۔ بچوں کا خیال رکھنا کیا ہی بات ہے، پرورش سے بچپن کی ایک بات یاد آ گئی۔۔۔ مجھے شاوَر کے نیچے نہانے کا بہت شوق تھا۔ جب کبھی ماما مجھے بغیر شاور کے غسل خانے میں بھیجتی تھیں تو میں کہتا تھا۔

"ماما! میں نے پشاور میں نہانا تھا!"

ماما آگے سے کہتیں "کچھ نہیں ہوتا، آج اسلام آباد میں ہی نہالو!"

اور اب اپنی حالت تو یہ ہے کہ جہاں میں چاہتا ہوں لوگ مجھے احمق سمجھیں وہاں وہ مجھے ذہین سمجھتے ہیں اور جہاں میں ذہین سمجھا جانا چاہتا ہوں وہاں احمق سمجھتے ہیں۔۔۔ تحاریر میں جہاں حماقت کرتا ہوں وہاں ذہانت کی سند تھما دیتے ہیں اور جہاں ذہانت آمیز بات نکل جائے وہاں ایسے دیکھتے ہیں جیسے حماقت کی ہو کوئی۔ اپنی تحاریر کے بارے میں میرا تو یہ خیال ہے کہ میری پکڑ دو وجوہات کے باعث ہو سکتی ہے۔۔۔ تحریر میں نقطوں اور نکتوں کا بیدریغ استعمال۔

ایک دن ذہین اور محترم گھر آئے۔۔۔ میں بیٹھا ہوا لکھ رہا تھا۔۔۔ لکھتا کیا تھا "خاکے" بنا بنا کر اڑاتا تھا۔۔۔ جہاز بنا کر۔۔۔ کیونکہ تحریر تو کہیں لگتی نہیں تھی۔ وہ دونوں مجھے پکڑ کر لے جانے لگے۔ ہر چند میں نے احتجاج کیا اور معقول ترین جواز پیش کیے مگر کون سنتا تھا۔۔۔ میں پکارتا رہ گیا۔

"مجھے اپنی داستان تو مکمل کر لینے دو۔۔۔ مرکزی کردار کب سے سیڑھیوں تلے دبکا بیٹھا ہے، بیچارے کی کمر رہ گئی ہوگی بلکہ وہ تو نیم غنودہ ہو کر انٹا غفیل ہونے کے قریب ہوگا۔ اس کا انتظار کرتی وہ بیزار ہو ہو چار الفاظ بھیج، کسی اور سے گرہ لگا چکی ہوگی، دوسری طرف اسکاؤنٹ جانے کب سے پرخلوص انداز میں جگالی کرنے میں مشغول ہوگا۔۔۔ بلکہ اس کا تو جبڑا بھی اب کسی قابل نہ رہ گیا ہوگا۔"

مگر انھوں نے سننا تھا نہ سنا۔۔۔ میں پھر چائے کے بہانے چولہے تک آیا۔ واپس گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ کمرے میں الو بول رہے ہیں۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہونگے کہ میں محاورتاً بول رہا ہوں، مگر وہاں حقیقتاً الو ہی بول رہے تھے۔ دونوں کی چیخ چیخ سے دماغ پھٹنے کو تھا۔۔۔ بڑی مشکلوں سے دونوں کو علیحدہ کیا۔۔۔ اس طرح کہ سانپ بھی کشتہ اور لاٹھی بھی شستہ۔۔۔ وہ پرانی پنجابی کہاوت ہے نا کہ:

"ہتھاں دیاں بنیاں دنداں نال کھولنیاں پینیدیاں اے"

یعنی کہ ہاتھوں سے باندھی ہوئی گرہیں دانتوں سے کھولنی پڑتی ہیں اور اگر وہ ازاربند کی رہی ہوں تو اور عذاب۔۔۔ جنابِ غالب شاید ایسے ہی موقع پر فرما گئے:

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

رشتے سے مراد دھرناڑا ہی معلوم ہوتا ہے، انھیں غالباً پنجابی ٹوٹکا معلوم نہ رہا ہوگا ورنہ ایسی بات نہ فرماتے۔۔۔ خیر۔۔۔ ان دونوں کو بڑی مشکل سے ٹالا یہ کہہ کر کہ ابھی نیند کی دیوی مجھے اپنے بستر پر ڈاؤنلوڈ کرنے پر مصر ہے۔ میں بھی پہلو بچانے کی کوشش میں نہیں ہوں، پس اسکالس مجھے وادیِ نوم میں دھکیلے جا رہا ہے اور اسکی زلفوں کی چھاؤں میں میری حماقت غروب ہونے لگی ہے۔۔۔ اس کی گداز بانہیں بھینچنے لگی ہیں اور مجھے لگتا ہے میرا زہر مار کردہ معجون رافعِ احمقیات اپنا اثر کھوتا جا رہا ہے اور اس نوبت سے پہلے مجھے رفوچکر ہو جانا چاہیے۔۔۔ پس ٹاٹا۔۔۔!

کے ایم خالد

ست رنگی نواب بھائی

وہ جولائی کی حبس زدہ صبح اسکول کی اسمبلی میں آج پھر قومی ترانہ پڑھتے ہوئے اپنی سوئی ''پاک سرزمین کا نظام'' پر پھنسا بیٹھا تھا ہیڈ ماسٹر سمیت پورا اسکول ترانے کے احترام میں الرٹ کھڑا تھا جھنڈے کو سیلوٹ کرنے والا اسکاوٹ اسے بار بار ٹھوکا دے رہا تھا لیکن وہ آنکھیں بند کئے ''پاک سر زمین کا نظام'' گائے جا رہا ہے تھا کافی دیر انتظار کے بعد ہیڈ ماسٹر نے پی ٹی ماسٹر کو اشارہ کیا جنھوں نے اسے جا کر جھنجھوڑا تب کہیں جا کر اس نے اگلا مصرعہ پکڑا ''قوتِ اخوتِ عوام'' طالب علموں سمیت سارے اساتذہ یہ دعا کر رہے تھے کہ وہ ترانہ سوئی پھنسائے بغیر پڑھ دے ورنہ پورا ترانہ پڑھے بغیر اس نے اسمبلی کا ڈائس نہیں چھوڑنا تھا۔

اسے بچپن سے ہی صحافی بننے کا بہت شوق تھا اس کی پریکٹس وہ اکثر اپنی ساتھی طالب علموں کو کہانیاں سنا کر کیا کرتا تھا اس کی یہ بے ربط کہانیاں انڈین فلموں کے سوپ ڈراموں کی طرح اتنی طویل ہوتی تھی کہ ایک کہانی اس نے پانچویں میں شروع کی تھی اور آٹھویں تک وہی چل رہی تھی یہ الگ بات تھی کہ اب اسے بھی پتہ نہیں تھا کہ کہانی کہاں سے شروع ہوئی تھی بس اسے کہانی کا عنوان ہی یاد تھا۔ آٹھویں میں اس کی ایک سبزیوں کی وین کو آنے والے حادثے کی رپورٹنگ کو ''بزم ادب'' میں بہت پسند کیا جا رہا تھا۔ ساتھی طالب علم ہنستے ہوئے اسے بار بار آلو کو لگنے والی رگڑوں ،بینگن کو کی جانے والی سفید پٹیوں اور تربوز کا سر پھٹنے کی رپورٹنگ سن رہے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ اتنی پذیرائی، وہ ضرور صحافی بنے گا۔

ایک اخبار کی عارضی ملازمت میں اسے ایک حادثے کی رپورٹنگ کرنے کے لئے بھیجا گیا اس نے اپنی رپورٹ میں زخمیوں کی تعداد بیس اور ہلاکتوں کی تعداد پچیس بتائی ،خبر اسی طرح چھپ گئی دوسرے دن کے اخبارات اس کی ہلاکتوں اور زخمیوں بتائی جانی والی تعداد کی نفی کر رہے تھے ایڈیٹر کے پوچھنے پر اس نے عجیب سی توضیح پیش کی اس نے کہا ''جن کو ایدھی والوں نے اٹھایا ان کو گن کر میں نے میت کے خانے میں لکھ دیا اور جو ۱۱۲۲ کی ایمبولینس والے لے گئے ،وہ میں نے زخمیوں میں شمار کئے''

اس جواب پر ایڈیٹر نے دروازے کی طرف اس کا منہ کر کے شاباش کے طور پر اس کی پیٹھ ''ٹھونکی'' تھی۔

اس نے صحافت کی اعلیٰ ترین خدمات کے لئے بہت سی زبانیں بھی سیکھنے کا سلسلہ شروع کر رکھا اس کی خواہش تھی کہ وہ انٹرنیشنل صحافی بن جائے پرنٹ میڈیا میں کامیابی کے ''جھنڈے

گاڑنے'' کے بعد اس کا اگلا ٹارگٹ الیکٹرونک میڈیا تھا۔اس کی ''سی وی'' کے احترام میں چینل نے اسے آزمائشی نشریات میں ایک لائیو ایونٹ چاندرات کی کوریج دینے کا فیصلہ کیا تھا وہ مائیک ہاتھ میں پکڑے بہت خوش نظر آ رہا تھا۔اس نے ساری زبانیں ذہن میں اکھٹی کر لیں تھیں، یہی موقع تھا اپنی صلاحیتوں کو منوانے کا وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کیمرہ مین کو ساتھ لئے پھر رہا تھا۔کیمرہ مین نے اسے لائیو کا اشارہ دیا تھا، بس رپورٹنگ شروع ہوئی اسے جتنی زبانیں یاد تھیں اس نے ان سب میں پہلے تو پاکستانی قوم کو چاند کی مبارک باد دی اس کے کان میں ڈی ایس این جی وین سے بار بار ''لائن'' پر آنے کا کہا جا رہا تھا اور اس نے اپنی انگلی سے کیمرہ مین کو اشارہ کیا کہ بس ایک زبان رہ گئی ہے۔اتنے میں ڈی ایس این جی وین سے نکل غصے سے ایک شخص نے کہا ''بس کریں جی ہمیں کنٹرول روم کٹ کر چکا ہے''۔

ایک چینل کا مالک اس کی ''سی وی'' غور سے دیکھ رہا تھا۔ مالک شائد امپریس ہو چکا تھا اس نے کہا ''میڈیا میں بہت سے منہ زور دریا بہہ رہے ہیں اس میں ایک ہمارا ایک کمزور سا اڈس بھی ہے، کبھی اس کے بہاؤ میں رکاوٹ نہ بنے گا۔''

اور اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہ جیسے بہت کچھ سمجھ گیا ہے اپنا سر ہلا دیا۔اسے ایک اسٹیشن پر عید پر چلائی جانے والی ٹرین سے آنے والے مسافروں کی کوریج کرنی تھی چونکہ ٹرین بھی تیار کھڑی تھی اور کیمرہ بھی تیار تھا لیکن مسافر اس کے کام بڑی رکاوٹ بن رہے تھے۔اس کے کوسنے، گالیاں ریکارڈ ہوتی رہیں وہ چینل پر تو نہ چل سکیں لیکن سوشل میڈیا اس ریکارڈ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اسی ایک ریکارڈنگ کی بدولت جو ایک فلم کا حصہ بن چکی ہے، اس کی پہچان بنی وہ خوش ہے کہ اس کا صحافتی کیریئر جو داؤ پر لگا ہوتھا، اس کا ''داؤ'' لگ گیا ہے۔

رات اس نے تارے گنتے ہوئے ایک تارے پر ہاتھ رکھے اپنے بیٹے سے کہا ''اوئے اس تارے پر ہاتھ رکھ اور میری بات سن''۔

بیٹے نے اس کے بتائے ہوئے تارے پر ہاتھ رکھا اور کہا ''کیوں ابا۔۔! کتنے تارے اب تک گن چکے ہیں''۔

''ایک لاکھ پچپن ہزار پانچ سو بائیس ، میری یہ رپورٹ جیو گرافک چینل پر تہلکہ مچا دے گی جیو گرافک والوں کو پتہ ہی نہیں میں ان کے لئے کام کر رہا ہوں''۔

''ابا اپنا تارہ پکڑیں، میرا بازو درد کرنے لگا ہے''۔

''اوہ اچھا پوچھنا یہ تھا کیا خیال ہے اس سلیمان خان پر کیس نہ ٹھوک دیں جیسے امجد صابری نے ٹھوکا ہے اس نے بغیر اجازت میرا نام اور میرا کام استعمال کیا ہے کروڑ دو کروڑ تو دے ہی دے گا''۔

''ابا تمہیں پتہ ہے انڈیا کہاں ہے''۔

''ادھر پاکستان میں ہی کہیں ہوگا'' اس نے دنیا کا جغرافیہ نظروں کے سامنے لاتے ہوئے کہا۔

''ابا تیرا اسکوٹر پنکچر ہے اور صبح تو نے بی بی سی کو انٹرویو بھی دینا ہے تیری جیب میں صرف پچاس روپے ہیں اگر دو پنکچر نکل آئے تو ،تو انڈیا میں کیس ٹھوکنے کی بات کر رہا ہے، یہ اپنا تارہ پکڑ ورنہ تیری جیو گرافک والی رپورٹ بھی خراب ہو جائے گی'' اس کے بیٹے نے تارہ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

اس نے تارہ پکڑ فارسی زبان میں گنتی شروع کر دی ''ایک لاکھ پچپن ہزار پانچ سو تیئس''۔

''ابا، یہ فارسی میں کیوں گن رہا ہے؟''

''یہ ستارے ایران والی سائیڈ کے ہیں اس لئے فارسی میں گن رہا ہوں''۔اس نے اپنی انگلی اگلے ستارے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

گوہر رحمٰن گہر، مردان

دو بھگوڑے سر پھوڑے

نا! ''تو گرو (اشفاق احمد جو پیار سے مجھے گوہر کے بجائے گرو کہتا ہے) تم ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ تم اور بھائی جمیل آخر کراچی بھاگے ہی کیوں تھے اور وہ بھی دوران امتحان۔۔۔ چہ خوب، گویا تم لوگوں نے اس بالی عمریا میں کراچی بھاگ کر بڑے اور مالدار آدمی بن کر آنا تھا، کیا بات ہے تمھارے قیانے کی۔۔۔جیسے وہاں دولت درختوں پر ہی تو اُگتی ہو جسے تم ایڑی اونچی کر کے جب چاہو آسانی سے توڑ لیتے اور وہاں پھر جی بھر کے موج میلے کرتے پھرتے'' اشفاق نے میرے ساتھ والے فرنٹ سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے ہنستے ہوئے نتھنوں سے کہا، اور پھر وہی پرانی راگ الاپی مجھ کو چڑانے کے لئے۔

''ہاہاہاہا۔۔۔ہاں ہم وہاں پرستان کی سیر اور اپنے ساتھ پری بدری جمالہ لانے کے چکر میں تھے کیونکہ حسن یوسف ہم لوگوں پر تمام تھا اور کراچی کی سیٹھانیاں ہمارے فراق میں آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہماری منتظر تھیں'' میں نے اشفاق کی رگ شیطنیت اور پھڑکائی۔

تو قارئین مندرجہ بالا مکالمے کا پس منظر جاننے کے کیلیے بیتاب ہو رہے ہوں گے تو آؤ آج تم لوگوں کو اپنے حماقتوں بھرے اس کارنامے سے ڈھکن ہٹا ہی دوں۔

پروفیسر جمیل احمد میرے بچپن کا لنگوٹیاں ہم جماعت اور ہم نشت تھا جو کہ پروفیسرز کے گھر کا بڑا لاڈلا اور نازوں پلا فرزندِ ارجمند اور اشفاق احمد کا بھائی تھا۔ چھٹیوں میں میں اکثر راول پنڈی، اسلام اباد، لاہور مزدوری کرنے جاتا رہتا تھا اس لیے جب ہم جماعت دہم کے آخری امتحانی مرحلے میں تھے تو شائد جمیل کی تیاری نہ ہونے کی وجہ سے اور پروفیسر علی رحمان صاحب کے مطالعے پر دباؤ کی وجہ سے کافی دلبرداشتہ (دلبرداشتہ ایک ہی لفظ ہے، دلبر اور داشتہ کو الگ الگ پڑھنے کی ضرورت نہیں) اور برگشتہ ہوئے اور ایک دن دوران تفریح مجھے کہا ''امی کے پلو سے ہزاروں روپے اُڑا لاؤ، کراچی بھاگ چلیں، وہاں مزدوری کریں گے اور گھر واپس نہیں آئیں گے!''

میں نے لاکھ سمجھایا مگر وہ مصر رہا اور میری نادانی کہ میں اُس کی اس احمقانہ تجویز پر آمادہ ہوگیا۔ خیر، قصہ مختصر یہ کہ ہم نے نوشہرہ سے کراچی کا ٹکٹ کٹایا اور عازمِ سفر ہوئے، اس بات سے بے خبر کہ ہمارے دونوں گھروں میں کیسا کہرام مچ سکتا ہے۔

ہم تین دن مسافت کے بعد جب تھکے ہارے کراچی سٹی

اپنا ہی آدمی

پچھلی بدھ کو یہاں سخت آندھی اور ریت کا شدید طوفان تھا۔ مغرب اور عشاء کے درمیان جب طوفان عروج پر تھا، مجھے سخت بھوک لگ گئی۔ پیٹ میں چوہے کرکٹ کھیل رہے تھے بلکہ کھیل کھیل کے تھک گئے تھے اور ڈنر کے انتظار میں تھے۔ اپنے روم میں تو کچھ نہیں تھا اور نہ ہی مارکیٹ کھلی تھی۔

پاس ہی ایک دوست کا کمرہ تھا۔ چوہوں نے کہا دوست کے کمرے میں ہی چلو۔ میں نے بتایا بھی کہ باہر طوفان ہے مگر یہ کمبخت اپنی ضد پر اڑے رہے۔ چوہوں کے کپتان نے مشورہ دیا کہ کپڑا لپیٹ لو۔ میں نے منہ پہ کپڑا لپیٹا اور سر پر کفن باندھ کے نکل کھڑا ہوا۔ راستے میں میری یہ چوروں والی حالت دیکھ کے کتے میرے پیچھے پڑ گئے۔ مجبوراً چہرے سے کپڑا ہٹانا پڑا اور کتوں کو اپنا تعارف کروایا تو کتوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور جانے دیا۔ دوست کے کمرے میں پہنچا اور وہاں کچھ پیٹ پوجا کی تو چوہوں نے دھرنا ختم کر دیا۔ واپسی کے لیے نکلا تو احتیاط کے طور پر پہلے ہی چہرے سے کپڑا ہٹا لیا لیکن پھر بھی کتوں نے دھاوا بول دیا۔ میں کتوں کو گالیاں نکالتا ہوا واپس دوست کے روم کی طرف بھاگا اور یہ سوچنے لگا اب ان کتے کمینوں کو کیا تکلیف ہوئی ہے۔ دوست کے روم میں پہنچا اور آئینہ دیکھا تو میں نے خود کو ہی نہیں پہچانا۔ ریت کے طوفان کی وجہ سے شکل ہی بگڑی ہوئی تھی۔ میں نے منہ دھویا اور واپس چل پڑا لیکن پھر ان کمینوں نے پھر میرا راستہ روک لیا کیونکہ تب تک کچھ نئے کتے آ چکے تھے، خیر ایک پرانے نے انہیں بتایا کہ اپنا ہی آدمی ہے آتا جاتا رہتا ہے، تب کہیں جا کے انہوں نے مجھے جانے دیا اور میں باخیر و عافیت اپنے روم تک پہنچا۔

ارسلان بلوچ ارسل

سٹیشن پر اترے تو لاڈلے جمیل کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور فلک بوس عمارات کو نظر بھر دیکھ کر ہی اماں بی یاد آ گئی۔ اِدھر میرا حال بھی کچھ کم خراب نہ تھا، ڈر اور خوف کے مارے شلوار گیلی پڑ رہی تھی۔ غالباً رات بارہ بجنے والے تھے اور کراچی یعنی روشنیوں کا شہر بقعۂ نور بنا ہوا۔ ہم حیران و پریشان خوف ڈر اور سراسیمگی میں فیصلہ کرنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ باقی کی رات کہاں گزاری جائے۔ جیب میں کچھ نہ کچھ پیسے تو تھے مگر پینڈو کیا جانے شہروں کی ریت، لہٰذا رات سٹیشن کے احاطے کے ایک کونے میں ہم دو بھگوڑے سر نہوڑے بے یار و مددگار پڑے رہے، نہ کوئی ماویٰ نہ رہبر۔۔۔ تو صاحبو رات جیسے تیسے اونگھتے سوتے گزر ہی گئی۔ ناشتے کی طلب ہوئی تو ایک نمکین چائے کا کپ اور کچھ سڑے ہوئے رس کیک وہ بھی اس زمانے کے ہوش ربا ریٹس پر سٹیشن کے اندر نصیب ہوئے مگر پاپی پیٹ کو تو عین نزع میں بھی بھرے جانے کا لالچ ہوتا ہے۔

جب دن چڑھا تو میری عقل بھی کچھ کچھ ٹھکانے آ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے، سینگ اُٹھا کر کہاں کا رخ کیا جائے۔ اچانک ہمیں ایک راہ سوجھ ہی گئی، جمیل سے کہا ”چلو اکرام کے ہاں قصبہ کالونی چلتے ہیں ون ڈی بس میں۔“

لیکن جمیل احمد کے ہوش ٹھکانے آ چکے تھے اور وہ واپس مردان آنے پر بضد تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اب زادِ راہ اتنا نہیں بچا تھا کہ واپسی ممکن ہو اس لیے کہ کشتیاں بمعہ بے بے کے پلو سے بندھے چرائے ہوئے پیسے زہر مار ناشتے اور ٹکٹوں کی نذر ہو چکے تھے۔ بس اِتنے پیسے بچے تھے کہ بنارس تک پہنچ پاتے۔ وہاں سے مجھے عبدالرحمان کے گھر کا پتہ معلوم تھا اس لیے سیدھے جا پہنچے۔

ارے واہ، وہاں تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے بھاگ جانے کی خبر پہنچ چکی تھی، جہاں میرے بچپن کے لنگوٹیے یار کے باپ نے جو میرے لیے بھی وہی درجہ رکھتے تھے، ہماری خوب خبر لی۔ کان سے پکڑ کر سیدھے لاری اڈے لائے اور مردان کے شہزاد کوچ میں روانہ کیا۔

جب بس مردان کے لیے روانہ ہو گئی تو جمیل اور مجھ میں تو جیسے زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ چوبیس گھنٹے جاں گسل مسافت کے بعد جب مردان اترے ہیں تو خوشی کا عالم یہ تھا کہ جیسے ہم دنیا کے جنت الفردوس میں پہنچ گئے اور جب اپنے پیارے گاؤں لوٹ رہے تھے تو اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ کچھ مت پوچھو کیونکہ فدوی کے بابا

مرحوم و مغفور بڑے سخت گیر قسم کے باپ تھے اور یہی کیفیت جمیل احمد کی بھی تھی کیونکہ پروفیسر صاحب ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتے تھے مگر جب پیاروں نے ہم سفر گزیدہ اور بھوک کے ماروں کو زندہ و حیات دیکھا تو آنسوؤں کے طوفان اُمڈ آئے اور ہمیں کم از کم اس وقت کچھ بھی نہ کہا گیا۔ میرے بابا نے تو مجھے اس طرح گلے سے چمٹ لیا جیسے برسوں کا گمشدہ دوبارہ مل گیا ہو۔ تب مجھے اپنے بابا اور بے بے کی اور خصوصاً منجھلی بہن کی محبت کا پتہ چلا۔ ہائے ہم لوگ بھی کیسے کیسے خزانے چھوڑ کر خاک چاٹنے نکل کھڑے ہوئے تھے۔

اپنی کتھا بیان کرنے کا میرا مقصد صرف یہ تھا کہ اپنے پیشرو کو یہ بتا سکوں کہ گھر سے بلاجہ اور خاص کر کم عمری میں بھاگ جانا کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ ہم تو بہت خوش قسمت تھے کہ اتنی جلدی واپس لوٹے، کسی بردہ فروش اور بیگاری کیمپ کے ہتھے نہ چڑھے۔ آپ لوگ ایسا بالکل نہ کریں لیکن رکیے، کہانی کا اصل مزہ تو اب شروع ہونے والا ہے۔

اللہ تکبر سے بچائے میں دوران طالب علمی خاصا فطین بچہ تھا جبکہ جمیل احمد ذھین تو بہت تھے مگر والد گرامی کے شدید مطالعے پر زور نے اسے پڑھائی سے بدکا سا دیا تھا۔ چونکہ پروفیسر صاحب سرکاری ملازمت کے شعبہ تدریس سے منسلک اُردو کے پروفیسر تھے اس لیے اُنہیں اپنے بچوں تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور اُن کی ان کاوشوں کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں دیا کہ اُن کے تین بیٹے پروفیسر ایک یعنی اشفاق احمد جو کہ اب بھی میرا دوست بلکہ چھوٹے بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہے، میرے ہم پیشہ آرٹ کے استاد ہے جبکہ تین بھائی ابھی ایم ایس سی، بی ایڈ اور جانے کیا کیا ڈگریاں لیے فارغ ہیں لیکن اس شان سے کہ اُن کے اعلیٰ تعلیمی پس منظر کی وجہ سے کوئی بہت ہی خاص ملازمت اُن کی تلاش میں ہے۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔۔۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ ہم دونوں کو اپنے سابقہ ریکارڈ کی بنیاد کچھ پروفیسر صاحب اور میرے قابل احترام استاد مرحوم و مغفور جناب تاج محمد صاحب کی کوششوں کی بدولت جماعت دہم کے بورڈ امتحان میں بٹھایا گیا۔ اگر چہ ہم اپنی حماقت سے یہ بازی ہارنے ہی والے تھے مگر بالآخر بعد از خرابیِ بسیار، ہم دونوں بچہ لوگ میٹرک اچھے نمبروں یعنی اے ون گریڈ میں پاس کرنے میں کامیاب ہو گئے اور تقریباً انیس سو بانوے سے جو تعلق ٹوٹا تو دو ہزار آٹھ میں اشفاق احمد کی شکل میں پروفیسر فیملی سے میرے تعلقات دوبارہ استوار ہوئے، کچھ پرانے اور زیادہ نئے تعلق کی بنیاد پر۔ جب میں نے۔ ڈیوٹی پر جانے کے لیے اپنی پہلی کار خریدی اور میرے ساتھ کچھ اور میرے ہم پیشہ اور قریبی دوست ڈیوٹیوں پر جانے لگے تو علی زمان اور شاہ نواز نے جو کہ میرے کلاس فیلو رہ چکے تھے، اشفاق سے میرا تعارف کروایا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اکٹھے میری گاڑی میں جانے لگے۔

وہ پہلے والا مکالمہ اس کہانی کا یہاں پر ختم ہوتا ہے مگر اب بھی جب میں جمیل اور اشفاق کے ہاں جاتا ہوں اس اُن کے سب بھائی ہم دونوں کے اس کارنامے کا تذکرہ چھیڑ دیتے ہیں اور ہم اُن کے قہقہوں کا تختۂ مشق بن جاتے ہیں حتیٰ کہ جب سارے بھائی کسی عید بقر عید پر اکھٹے ہو جاتے ہیں تو ہماری اس کتھا کا راگ ضرور چھیڑ دیا جاتا ہے اور یوں کہ سارا گھر کشت زعفران بن جاتا ہے۔

صبح اکھٹے سکول جاتے ہوئے اشفاق خوب حظ اٹھا کر ہمارے کارنامہ ہائے عالی کی ساری روداد بیان کر دیتا ہے اور میں بھگوڑا سر نہوڑا خاموشی سے کان لپیٹے ڈرائیو کر رہا ہوتا ہوں جبکہ جمیل بچارا تو ہر مرتبہ توپوں کے سامنے ہوتے ہوئے تختۂ مشق بن جاتا ہے بلکہ اُس کی نصف بہتر بھی اسے چڑانے کے لئے اس واقعے کو بطور ہتھیار استعمال کرتی ہیں اور آپ سے کیا پردہ، کچھ اِسی قسم کا حال آپ کے اس بھائی کا بھی ہے کیونکہ میری بے غم (بیگم) بھی جب شادی غمی میں جمیل کے ہاں جاتی ہیں تو ہمارا خوب کباڑا کیا جاتا ہے اور گھر آ کر میرے کان کچکچا دیتی ہیں۔

اب آپ لوگ ہی بتائیں کہ ہم دو بھگوڑے رانوں میں سر نہوڑے نہ بیٹھیں تو کیا کریں۔

انگریزی اور ہم دیسی

خادم حسین مجاہد

انگلش بیوی کی طرح ہے جس کے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں اور جس کے ساتھ نبھانا بھی مشکل ہے بات صرف زبان کی ہوتی تو خیر تھی لیکن اگر اسے اختیار کریں تو اس کے ساتھ اس کا کلچر بھی آ جاتا ہے جیسے شادی میں سسرالی رشتہ داریاں تحفے میں ملتی ہیں۔اسی وجہ سے اول اول انگریزی کو حرام قرار دیا گیا مگر آہستہ آہستہ یہ خود ہی حلال ہوتی چلی گئی تو مجبوراً علماء نے بھی اسے یوں گوارا کر لیا جیسے حالتِ اضطرار میں شراب، سود اور حرام کی اجازت ہو جاتی ہے۔لیکن اب یہ مجبوری سے بڑھ کر فیشن میں داخل ہوگئی ہے حتیٰ کہ اگر کسی کو انگلش بولنا نہ بھی آتی ہو تو وہ اسے بولنا ضروری سمجھتا ہے جس سے بعض اوقات بڑی دلچسپ صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست کی انگریزی کچھ کمزور ہے لیکن وہ انگلش کلچر کے اتنے دلدادہ ہیں کہ شادی کے آٹھ دس سال گزر جانے کے بعد بھی شادی کی سالگرہ منانے سے باز نہیں آتے، حالانکہ آخری درویش کے بقول دو چار سال بعد تو شادی کی سالگرہ نہیں بلکہ برسی منانی چاہئے۔یہ اپنے مقامی احباب کو اپنے خوشی نما غم یا غم نما خوشی میں شریک کرنے کے ساتھ ساتھ ملکی و غیر ملکی احباب کو بھی بذریعہ ایس ایم ایس اطلاع دے کر دعائیں ضرور وصول کرتے ہیں تا کہ جو حماقت کر بیٹھے ہیں اس پر خوشی خوشی قائم رہیں۔اس سلسلے میں مجھے ایک دفعہ ان کا انگریزی اردو مکس میسج ملا تو میں نے سر پیٹ لیا۔لکھا تھا ''کل میری میرج marriage کی برتھ ڈے birthday ہے آپ کی دعاؤں کا ویٹ weight کروں گا۔''

شادی کی سالگرہ کا ترجمہ جو انہوں نے اینی ورسری کی بجائے برتھ ڈے (یوم پیدائش) سے کیا اس کی صحیح داد تو کوئی انگریز ہی دے سکتا ہے۔ہم تو حیران تھے کہ شادی کی پیدائش کا دن بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک دن شام کی سیر کے دوران ایک شاعر دوست کے صاحبزادے سے ملاقات ہوگئی جو میٹرک کا امتحان دے کر تازہ تازہ فارغ ہوئے تھے اور ہر وقت درست یا غلط انگریزی کے استعمال کرنے کی تاک میں رہتے تھے تا کہ لوگ انہیں پڑھا لکھا سمجھیں۔جب میں نے پوچھا ''کیا ہو رہا ہے برخوردار؟؟؟'' تو جھٹ سے بولے

''Nothing just enjoy yourself''

اس میں مائی سیلف myself کی جگہ یور سیلف yourself استعمال کرنے کی جو حماقت اس نے کی اس کا صحیح لطف تو انگریزی جاننے والے ہی اٹھا سکتے ہیں۔باقی احباب کے لئے اس مقولے کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے'' کچھ نہیں بس آپ کو

داد

سیف الدین سیف بیان کرتے ہیں کہ ایک بار کوئی صاحب آئے اور فیض کو اپنا کلام سنانے لگے۔ انہوں نے اپنی ایک نظم سنائی جس میں ہر تیسرا چوتھا مصرع فیض صاحب ہی کا تھا۔ فیض صاحب انہیں مسلسل داد دیتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کہا ’’فیض صاحب یہ کیا قصہ ہے؟ آدھا کلام تو آپ کا تھا اور آپ واہ واہ کیے جا رہے تھے۔‘‘

مسکرا کر کہنے لگے ’’بھئی کیا کرتا، پہلی بار تو اپنے شعروں پر داد دینے کا موقع ہاتھ آیا تھا۔‘‘

لطف اندوز کر رہا ہوں۔‘‘ اُمید ہے آپ اس فقرے کی بلاغت تک پہنچ گئے ہوں گے۔

ایس ایم ایس اور ای میل کی بدولت انگریزی کی ایک اختصار شدہ شکل وجود میں آ گئی ہے جس میں you کو u, Your کو ur، for کو 4، eye کو i، why کو y، we کو v اور کیونکہ کو qk لکھا جاتا ہے۔

ہمارے ایک دوست اسی وجہ سے انگلش کے پرچے میں فیل ہو گئے کیونکہ وہ ایس ایم ایس بہت کرتے تھے اور پیپر میں بھی ایس ایم ایس والی انگلش ہی لکھ آئے اسی تناظر میں ہم ایک دوست عارف انیس کو 19 آر ایف لکھا کرتے تھے اور وہ بڑا خوش ہوتا تھا۔ انگلش میں تلفظ کا معاملہ بڑا گھمبیر ہے کیونکہ یہ بھی اردو کی طرح بے شمار زبانوں کا ملغوبہ ہے اس لئے اس میں تلفظ کے کوئی لگے بندھے قواعد نہیں مثلاً put میں u پیش کی آواز دے گا اور but میں زبر کی۔ اس کے علاوہ اس میں بھی اردو کی طرح ایک آواز کے لئے ایک سے زائد الفاظ رائج ہیں مثلاً فے کے لیے f اور ph، ش کے لئے sh,۔

ہمارے ایک دوست سکول school کو سچول اور faculty کو فیسلٹی پڑھتے ہیں۔ اب امریکن انگلش میں کچھ آسانی کی کوشش کی جا رہی ہے جس میں photo کو foto اور school کو skool بھی لکھا جا رہا ہے لیکن یہ کوششیں اسی طرح کامیاب نہیں ہو رہیں جیسے ماضی میں اُردو کی ایک آواز کے لئے ایک سے زائد حروف ختم کر کے ایک ہی حرف مخصوص کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی اور ہم آج تک ’’س‘‘ کی آواز کے لئے ص، س ث اور ض کی آواز کے لئے ذ، ض، ظ کے حروف استعمال کرتے اور الجھنے پر مجبور ہیں۔ اگر ایسا ہو جاتا تو کچھ حروف تہجی کم ہونے سے طلبہ کی الجھن تو کم ہوتی۔ ان کے لئے ساکن الفاظ بھی ایک مسئلہ ہیں۔

پرائیویٹ انگلش میڈیم اسکولوں کے ٹیچرز اور ان کے اسٹوڈنٹس کے والدین انگلش میڈیم کے خبط کے باعث آسان ترین اردو کے الفاظ چھوڑ کر مشکل ترین انگریزی الفاظ استعمال کرنے پر مُصر ہیں۔ حالانکہ ان کو والدین آسانی سے ادا کر سکتے ہیں نہ بچے۔ مثلاً وہ شاپنر کا لفظ ہی استعمال کریں گے حالانکہ پنسل تراش، کہیں تو بھی وہ اسی صفائی سے پنسل تراشتا ہے۔ اسی طرح ربڑ کا لفظ ہے جو بچہ ادا ہی نہیں کر سکتا اور دکاندار سے جب وہ مانگتا ہے تو وہ کبھی اسے ریزر پکڑا دیتا ہے اور کبھی کچھ۔۔۔ حالانکہ ربڑ کہنے سے اس کی مٹانے کی صلاحیت میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ اسی طرح پرائمری کے سلیبس میں خصوصاً سائنس میں گورنمنٹ اسکولوں میں بھی اصطلاحات تمام انگلش میں کر دی گئی ہیں جبکہ ان کو بچہ کیسے ادا کرے گا جب استاد بھی ادا نہیں کر سکتا، مثلاً ایکسکریٹری سسٹم جسے نظامِ اخراج کے بجائے لکھا گیا ہے۔ یہ سلیبس کامیاب کرنے کے لئے تو پہلے اساتذہ کو پڑھانا پڑے گا پھر وہ بچوں کو پڑھانے کے قابل ہوں گے بشرطیکہ بڈھے طوطے پڑھ گئے تو۔

انگریزی بنیادی طور پر انگریزوں کی ہی طرح بدتمیز اور بے حیا زبان ہے۔ اس میں آپ اور تم دونوں کے لئے ہی you کا لفظ ہے۔ غیرت کا لفظ سرے سے موجود ہی نہیں۔ گالیاں اور فحش الفاظ کی کثرت ہے۔ اردو میں تو ادب و احترام کے لئے بڑی آسانی سے الفاظ میں تمیز کر لی جائے گی لیکن انگلش میں کسی کو عزت دینے کے لئے بڑا تکلف کر کے "his highness" اور her "highness" کے الفاظ استعمال کئے جائیں اور وہ بھی شاذو نادر کسی شخصیت کے لئے۔ بچوں اور بزرگوں کے لئے ایک جیسے

الفاظ استعمال ہوں گے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ انگلش عربی کی طرح جامع زبان بھی ہے۔لفظ کزن کی ہی مثال لے لیں۔اس ایک لفظ میں اردو کے آٹھ دس طویل و عریض قسم کے رشتے آجائیں گے، بلکہ اگر کوئی رشتہ نہ بھی ہوتو بھی یہی لفظ کام کرتے ہیں۔پھر انگلش چونکہ کھلی ڈھلی زبان ہے اس لئے جو بات آپ اپنی زبان میں کریں تو ڈنڈے سوٹے چل جائیں،وہی انگلش میں کریں تو کوئی برا نہ مانے بلکہ آپ مہذب گنے جائیں گے اور مطلوبہ مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ اظہارِمحبت کا معاملہ ہو یا ڈاکٹر کو علاماتِ مرض بتانے کا،انگریزی ہر جگہ آپ کی مدد کرے گی۔لفظ ریپ کو ہی لیں،آپ اسے خواتین وحضرات کی محفل میں بے دھڑک استعمال کریں کوئی آپ کو ٹوکے گا نہیں لیکن اگر آپ نے کہیں غلطی سے بھی اس کا ترجمہ کردیا تو کئی حضرات کی آنکھیں اور خواتین کے کان سرخ ہوجائیں گے۔اسی طرح اگر کہا جائے کہ فلاں کی لڑکی نے گھر سے بھاگ کر آشنا سے شادی کر لی تو سب تھوتھو کریں گے،لیکن اگر کہا جائے کہ ان کی لڑکی نے کورٹ میرج کر لی تو ان کی ذرا بھی بے عزتی نہ ہوگی بلکہ لوگ لڑکی کی سمجھداری کی اور معاملہ فہمی کی داد دیں گے گویا انگلش بھی پردے کی طرح ہے جو ہم اپنی زبان پر چڑھا کر من مانی کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا ان فن کار لڑکیوں کی طرح جو پردہ کرتی ہیں تو بے پردگی کے لئے اور وہ بھی صرف اپنوں کے سامنے۔

آج کل انگلش ماڈرن ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے اس لئے کئی ہوشیار لوگ اپنے دقیانوسی ناموں پر انگلش کا خول چڑھا کر ماڈرن ہو جاتے ہیں۔وہ لوگ عموماً اپنے دقیانوسی نام کے انگریزی مخفف کے ساتھ کوئی ماڈرن سا نام یا تخلص لگا کر ماڈرن ہو جاتے ہیں،لیکن جب انگلش کا پردہ اٹھایا جائے تو نیچے سے ان کے دقیانوسی نام ننگے ہو جاتے ہیں جیسے ایم ڈی اختر مولا داد اختر نکلیں گے اور ایم ڈی چوہان موج دین چوہان اور اے ڈی سومرو اللہ وسایا سومرو وغیرہ۔

ہمارے ملک میں سرکاری اسکولوں میں نرسری سے مکمل انگلش میڈیم کا آغاز ہوگیا ہے۔انگلش کی تدریس تو عرصے سے جاری ہے،اب تو شاید آئندہ اردو بھی انگلش میں پڑھائی جانے لگے،یوں ممکن ہے اردو واقعی قومی زبان کا درجہ حاصل کر لے جو کہ اب تک نہیں حاصل کر سکی اور اس بات پہ اب ہنسی تو کیا رونا بھی نہیں آتا کہ ہماری قومی زبان تو اردو ہے مگر کاروبارِ مملکت 63 سال سے انگلش میں چل رہا ہے اور وہ بھی اس ملک میں جہاں درست اردو بولنے والے بھی خال خال پائے جاتے ہیں ایک لحاظ سے یہ اچھا بھی ہے کہ حکومت نے اس قومی منافقت کو ختم کرنے کا سوچا ہے،ہم حکومت کو اس پر داد دیتے ہیں اور عوام کے لئے دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ اب انہیں انگریزی کے ساتھ بھی اسی طرح گزارا کرنا پڑے گا جیسے شوہر بیویوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

گورنمنٹ نے جن سرکاری اسکولوں کو انگلش میڈیم کیا ہے وہاں وردی بھی انگلش کر دی ہے ابھی یہ حکم صرف طلبہ تک محدود ہے لیکن کوئی بعید نہیں کہ کل کلاں کو اسے اساتذہ تک وسیع کر دیا جائے،پھر انگلش،سائنس،ریاضی اور کمپیوٹر والے اساتذہ کیلئے پینٹ شرٹ کوٹ ٹائی لازمی ہو گی جس سے صحت مند اساتذہ آزمائش میں بھی پڑ سکتے ہیں عربی و اسلامیات والے اساتذہ کو جبہ و دستار میں آنا ہوگا اردو اور مطالعہ پاکستان والے اساتذہ شلوار قمیض شیروانی اور جناح کیپ استعمال کریں گے،جبکہ زراعت اور پنجابی والے دھوتی کرتے میں دکھائی دیں گے۔سوچنے والی بات یہ ہے اگر انگریزی و سائنس قومی لباس میں نہیں پڑھی جاسکتیں تو انگریزی لباس میں اردو اسلامیات،عربی،پنجابی مطالعہ پاکستان اور زراعت کیسے پڑھی جاسکتی ہے پرائیوٹ اسکولوں کی اندھادھند تقلید میں موسم اور ماحول کا خیال کئے بغیر انگریزی وردی میں طلبہ کو خصوصاً گرمیوں جو حشر ہوگا اس سے معیارِ تعلیم میں جو بہتری آئے گی اس کا علم تو بعد میں ہوگا، سرِدست تو پاکستانیت ہمارے سکولوں سے رخصت ہوگئی ہے اور مصنوعی انگریز بننے کی کوشش میں ہم اُردو سے بھی جائیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اول و آخر دیسی ہیں اور جتنی بھی کوشش کی جائے ہم انگریز نہیں بن سکتے،اور دنیا میں ترقی انہی قوموں نے کی ہے جنہوں نے تعلیم اپنی مادری و قومی زبان میں حاصل کر کے انگلش کو ثانوی حیثیت میں رکھا ہے۔

شوکت علی مظفر

کمپوزر کی غلطی

قطع و برید لمیٹڈ

اخباری دنیا میں کمپوزر وہ مظلوم شخصیت ہے جس کے ہاتھوں کی رفتار سے اخبار چلتا ہے، مگر قدر چپراسی جتنی بھی نہیں ہوتی۔ پرانے زمانے میں کاتب کے مرہونِ منت اخبارات پر الفاظ جگمگاتے تھے اور اُن کی عزت بھی ایڈیٹر سے کم نہ ہوتی تھی بلکہ آج جو اخبار سب سے بڑا کہلاتا ہے، اس کے بانی بھی کتابت کے ماہر تھے اور ایڈیٹری کے علاوہ اخبار کی ترسیل بھی خود کیا کرتے تھے۔

ہر اخبار میں کمپوزرز (برقیاتی کاتب) کے علاوہ سب ایڈیٹر اور پروف ریڈر بھی ہوتے ہیں جن کا کام ہی غلطیاں درست کرنا ہوتا ہے اور تنخواہ بھی اُردو کمپوزر سے زیادہ ہوتی ہے لیکن مزیدار بات یہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی غلطی ہو جائے جس سے قانونی یا لسانی گرفت کا خدشہ پیدا ہو جائے، فرقہ واریت اور سرکولیشن پر چوٹ لگنے کا ڈر پیدا ہو جائے تو تمام ملبہ ''کمپوزر کی غلطی'' کا اشتہار لگا کر نمٹا دیا جاتا ہے اور بے چارہ کمپوزر اس پر احتجاج کا حق بھی نہیں رکھتا کیونکہ کسی بھی اخبار کی ریڑھ کی ہڈی ہونے کے باوجود انہیں ادارہ اپنا سمجھتا ہے اور نہ ہی صحافت سے ان کا تعلق ہوتا ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے؟ یہ کمپوزرز فارمی مرغیوں کی مانند ہوتے ہیں جن پر چھری آسانی سے پھیری جا سکتی ہے۔

نوٹ:۔ تمام کمپوزرز سے آخری جملے کیلئے انتہائی معذرت کہ ''کمپوزنگ کی غلطی'' سے ایسا لکھا گیا۔

کمپوزنگ کا کرتب

کالج کے پیپر ہو چکے تھے، فراغت کے دن تھے۔ پاکستان چوک ایک دوست مصطفیٰ غازی کے آفس جانا ہوا جن کے والد مجاہد صاحب نوائے وقت کراچی کے سینئر ایڈیٹران میں سے ہیں۔ غازی نے اچانک پوچھا ''کمپوزنگ کی جاب کرو گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا ''یہ کیا بلا ہوتی ہے؟''

غازی نے کمپیوٹر پر اِن پیج کا سوفٹ ویئر کھول کر بتایا، یہ بلا ہوتی ہے۔ دو گھنٹے کی کلاس لی اور اگلے دن ایک ہفتہ وار اخبار میں جاب پر تھا اور اس سے اگلے دو ہفتوں میں اُردو کمپوزنگ پر ہاتھ بیٹھ گیا۔ کیسے نہ بیٹھتا، جماعت نہم میں ٹائپنگ کا کورس شروع کیا تھا جو اُدھورا رہ گیا لیکن ٹائپ رائٹر سے کمپیوٹر کی بورڈ کے سفر تک آسانی ہو گئی۔

بہر حال دو تین ہفتہ وار اخبارات اور مختلف ماہناموں سے ہوتا ہوا، ایک روزنامہ تک پہنچ ہی گیا۔

ایک دن اخبار میں کوئی غیر ملکی وفد دورے پر آیا تو ایک دفتری نمائندے نے میرا تعارف کرواتے ہوئے بتایا"یہ ہمارا سب سے کم عمر کارکن ہے، لیکن اسپیڈ سب سے زیادہ ہے۔" پھر نمائندے نے میری طرف رُخ کیا" چلو شوکت، اب ہمارے معزز مہمانوں کو کمپوزنگ کا کرتب کر کے دکھاؤ۔"

وقت بدل گیا، لیکن کمپوزنگ کا کرتب نہ بدلا

اخبار سے نیوز چینل پر آ گیا۔ دس برسوں میں کمپوزنگ سے رائٹنگ کا سفر بڑی محنت سے طے کیا، مگر کمپوزنگ نے میری رائٹنگ میں آسانیاں پیدا کیں اور نیوز چینل میں جاب کیلئے بھی ایک اضافی ہنر ثابت ہوئی۔

ایک دن آسکر ایوارڈ یافتہ خاتون ڈائریکٹر کے پروگرام کی ریکارڈنگ کیلئے کچھ اسکرپٹ ٹائپ کرنا تھا۔ اسٹوڈیو کافی دور تھا لہٰذا محترمہ کی برگر بچوں پر مشتمل ٹیم آفس میں موجود تھی اور اسکرپٹ کمپوزنگ کے ساتھ مغز ماری جاری تھی۔ میں چھٹی کر کے دوسرے چینل جا چکا تھا، وہاں پہنچ کر یاد آیا کہ کچھ ضروری چیزیں پہلے چینل میں رہ گئی ہیں لہٰذا رات گئے آنا پڑا۔ برگر لڑکے لڑکیوں کی ٹیم مشن پر جتی ہوئی تھی۔ میں نے سامان اُٹھایا اور جانے ہی لگا تھا کہ منیجر وسیم صاحب کی آمد ہوئی اور انہوں نے مجھے دیکھ کر کہا، شکر ہے کہ آ گئے، یہ کچھ اسکرپٹ تو ٹائپ کر دو۔

"سوری۔۔۔ میں کمپوزر نہیں، رائٹر ہوں۔۔۔ آپ کوئی کمپوزر اریج کر لیں۔"

میں نے بے رخی سے کہا اور جانے لگا تو منیجر نے دوستانہ انداز میں کہا"معلوم ہے مجھے کہ رائٹر ہو، لیکن کام انتہائی ایمرجنسی کا ہے، اور یہ ٹیم پہلے ہی چار چھ گھنٹے ضائع کر چکی ہے۔"

میں نے ایک نظر سب کو دیکھا اور سب برگرز نے مجھے حقارت سے۔ لیکن اگلے آدھے گھنٹے میں جب میں اسکرپٹ کمپوزنگ فائنل کر کے اٹھا تو سب سر سر کر رہے تھے اور مجھے اخباری نمائندے کی کرتب والی بات یاد آ رہی تھی کہ آج پھر کمپوزنگ کا کرتب دکھا کر ہی داد سمیٹنی پڑی۔ بعد میں بہت سے برگرز کا اِن چیج اُستاد بننا پڑا۔ اور فخر ہے کہ اُردو نے رسوا نہ کیا مجھے۔

کمپوزر سے بڑا اُردو کا کوئی محسن نہیں!

جہاں اُردو کمپوزرز کے ہاتھوں کی تیزی ضروری ہے، وہیں دماغی پھرتی بھی لازمی درکار ہوتی ہے۔ ایسی ایسی نادر تحریروں سے پالا پڑتا ہے کہ اچھا بھلا اُردو دان سر پکڑ کر بیٹھ جائے کہ کالم نگار، ادیب اور مصنف نے کیا لکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن جس طرح ڈاکٹر کے نسخے کو کمپاؤنڈر آسانی سے پڑھ لیتا ہے اسی طرح ایک منجھا ہوا کمپوزر سرسری نظر ڈال کر بتا دیتا ہے کہ یہ جو کیڑا سا کاغذ پر رینگتا دکھائی دے رہا ہے، اسے "سیاسی رنگینیاں" کہتے ہیں اور یہ جو"بخار بھری نظروں سے دیکھنا" لگ رہا ہے، ادیب نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھنا لکھا ہے۔ کمپوزر کی حاضری دماغی نہ ہو تو اچھا خاصا نامزد اُمیدوار" نامرد اُمیدوار" بن سکتا۔ انتخابی نشان"شیر" سے"تیر" ہوسکتا ہے۔ محرم سے مجرم بنانا بھی کمپوزر کے بائیں ہاتھ کا کھیل اور دغا دینے والے کو دعا دینے والی ہستی میں تبدیل کرنا دائیں ہاتھ کی کاریگری۔ غرض یہ کہ کمپوزر سے بڑا اُردو کا کوئی اور محسن نہیں ہوسکتا۔

مجھے فخر ہے کہ بڑے بڑے ناول نگاروں، ڈرامہ نویسوں، ادیبوں، کالم نگاروں کی ہینڈ رائٹنگ دیکھنے کا موقع مل چکا ہے۔ بعض تو اتنا اچھا لکھتے ہیں جیسے وہ ناول کی بجائے محبوبہ کو خط لکھ رہے ہوں، اتنی نفاست اور محبت کہ بس بندہ تحریر کی بجائے لکھائی میں کھویا رہے۔ اور کچھ ایسے لکھتے ہیں جیسے کمپوزر سے ازلی دشمنی نکال رہے ہو، ایسی تحریر کہ لفظوں کو سمجھنے، سمجھ کر لکھنے میں دماغ کی ساری بتیاں جلانی پڑتی ہیں، تب کہیں جا کر ہوتا ہے چمن میں دیدہ وَر پیدا۔

نئے کمپوزر بھرتی کرنے کیلئے میں عموماً انہیں کالم نگار و عالمی حالات پر تبصرہ نگار پروفیسر شمیم اختر کی ہینڈ رائٹنگ تھمایا کرتا تھا، جو اِس میں پاس ہوگیا سمجھو وہ اچھا کمپوزر ہے۔ تھوڑی سی دِقت ناول نگار اشتیاق احمد کی رائٹنگ سمجھنے میں ہوتی تھی لیکن ایک بار سمجھ آ گئی تو سمجھو پھر حلوہ تھا لیکن ایک اور نامور ناول نگار نے مجھے زچ کر دیا تھا، میں نے ہار مان لی تھی۔ دو پیراگراف پورے دن میں کمپوز کیے

> ایک بار جوش صاحب اور جگر مراد آبادی تانگے میں سفر کر رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی کے بعد جگر نے کہا ''یا اللہ!'' جوش شوخی سے بولے ''کیا آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟''
> جگر نے برجستہ کہا ''لاحول ولا! خدا کو یاد کیا، شیطان بیچ میں آ گیا۔''

اور کس طرح کیے کہ اُردو لغت سے لفظ کھنگالتا اور کاغذ پر لکھے لفظ سے ملانے کی کوشش کرتا اور جو سمجھ آتا وہ ٹائپ کرتا لیکن شام ڈھلے ہمت ٹوٹ گئی اور پھر ہاتھ اٹھا لیے کہ خدا جانے یا طارق اسماعیل ساگر جانے کہ کیا لکھا ہے؟؟ البتہ سندھی ادب کے نامور مصنف، بچوں کی کہانیوں کے لکھاری اور پی ٹی وی پروڈیوسر غلام مصطفیٰ سولنگی تو اس طرح لکھتے ہیں کہ اُردو ڈائجسٹ کے مدیر کے بقول ''لفظ کسی چمٹی سے اٹھا کر بڑے اہتمام سے سجا سجا کر کاغذ پر رکھے گئے ہوں۔''

بے چین کمپوزر

جس روزنامہ اخبار میں مجھے باقاعدہ کمپوزر اور پیج میکر کی نوکری ملی تھی وہاں مجھ سے زیادہ تیز رفتار کمپوزر کا نام مجھے یاد نہیں لیکن وہ خود اچھی طرح یاد ہے۔ الجھے بال، بکھری ہوئی داڑھی، پیلی پیلی آنکھیں اور انتہائی گہری مسکراہٹ۔ سگریٹ اتنی پیتا کہ ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ اسی کام کیلئے پیدا ہوا ہے، لیکن جو کام میں 10 منٹ میں کرتا، وہ ایک منٹ میں کر گزرتا۔ بہت کوشش کی رفتار میں اسے پیچھے چھوڑ دوں لیکن وہ کمپوزرز میں جناتی صلاحیت کا مالک تھا اور اِدارے نے شاید اسی وجہ سے اسے نوکری پر برداشت کیا ہوا تھا کیونکہ واحد وہی تھا جو کھلے عام سگریٹ نوشی کرتا۔ میں نے چین اسموکر سے لے کر بے چین اسموکر تک دیکھ رکھے ہیں لیکن یہ واحد بے چین کمپوزر تھا جو اپنی سیٹ پر پورے دن میں ایک گھنٹہ نظر آتا اور دھواں دھار طریقے کام نمٹا کر باقی سات گھنٹے راہداری میں چہل قدمی کر کے سگریٹ پی کر دھویں کے مرغولے اُڑاتا۔ خدا جانے، اب کہاں ہوگا؟؟

معصوم کمپوزر، چالاک رائٹر

میں کام میں مگن تھا کہ اچانک ڈپارٹ سے آواز سنائی دی ''بھائی، ان پیج سکھا دو گے؟ مجھے کمپوزر بننا ہے۔'' میں نے پلٹ کر دیکھا، انتہائی معصوم سا لڑکا نظر آیا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی انکار کی گنجائش نہ نکلی، حامی بھر لی۔

اخبار کے دفتر میں یہ کس کے توسط سے پہنچا معلوم نہیں، لیکن اسے مفت خدمات کا شوق تھا۔ چند دن بعد کمپوزنگ سیکھا تو کچھ عرصے بعد گرافکس ڈیزائنر بھی بن گیا۔ میں ادارتی صفحے تک محدود رہا لیکن اس نے رنگین صفحے پر ترقی کر کے مجھ سے زیادہ تنخواہ حاصل کرنا شروع کر دی۔

کمپوزنگ جاب کے دران ہی میں لکھنے کا سلسلہ شروع کر چکا تھا۔ کہانی لکھتے وقت عموماً میں اِرد گرد کے لوگوں کے نام رکھ لیتا ہوں لہٰذا ایک کہانی میں اس کا نام منفی کردار کے طور پر استعمال کر لیا۔ شاید یہ بات اس نے دل پر لے لی اور کمپوزنگ استاد سمجھ کر تو زبانی کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا البتہ غصہ میں ایک کہانی اس نے بھی لکھ ماری اور منفی کردار میں میرا نام استعمال کر لیا۔

یوں ایک معصوم سا کمپوزر، چالاک رائٹر کے روپ میں اُبھرا۔ آج جمال عبداللہ عثمان، جو ہم پہ گزری، غیرت نہ بچیں، لہو رنگ داستان اور اپنا گھر بچایئے جیسی مقبول عام کتابوں کا مصنف ہے جبکہ ایک اُردو ویب سائٹ بھی اس کی محنت سے دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ جیتے رہو جمال۔۔

کی بورڈ کی جنگ

جس طرح گاڑی ایک ہاتھ میں ٹھیک رہتی ہے، اسی طرح کمپوزر کا کی بورڈ بھی ایک ہاتھ میں رہے تو اچھا چلتا ہے۔ بعض کمپوزرز تو اپنا کی بورڈ ساتھ لیے گھومتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ نیوز کمپوزرز عموماً میگزین کمپوزر کو کسی کھاتے میں نہیں لاتے، اس میں بے چارے نیوز کمپوزرز کا بھی قصور نہیں۔ روزانہ جنگ جدل، خون خرابے، لوٹ مار اور دنگا فساد کی خبریں کمپوز کر کے ان کا دماغ بھی اسی طرح کے خیالات کی آماجگاہ بن چکا ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی جو روزنامے کے ابتدائی دو سال تک مجھے ایک کی بورڈ کیلئے رات والے پیج میکر سے سرد جنگ کرنا پڑی۔ میں صبح آ کر اپنے کمپیوٹر پر کی بورڈ لگاتا تو موصوف رات میں اسے نکال کر اپنے کمپیوٹر میں فٹ کر لیتے۔ اُس نے مجھے بڑے سخت پیغامات

بھجوائے کہ میں اپنی اس حرکت سے باز آجاؤں لیکن وہ پٹھان تھا تو میں بھی میانوالی ہونے کے ناطے ڈبل پٹھان بن گیا اور جوابی پیغامات بھجوائے کہ وہ نہیں سدھرتا تو میں بھی کی بورڈ کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بالآخر دو سال بعد انور کمال سے سامنا ہوا، میری طرح کا ہی دبلا پتلا لیکن روایتی پٹھانوں کی طرح رنگ روپ کا نکھرا۔ مل بیٹھ کر طے کیا گیا ہم اپنا اپنا کام کرنے کے بعد چھٹی سے پہلے کی بورڈ آنے والے کیلئے لگا کر جایا کریں گے۔ بعد میں انور کمال سے قومی اخبار بلڈنگ میں کافی ملاقاتیں رہیں، وہ اخبار میں وہی پیج میکنگ کی جاب کرر ہا تھا اور میں اسی بلڈنگ میں قائم نیوز چینل میں رائٹر بن کر آچکا تھا۔

نیک کمپوزر، جھگڑالو انچارج

اخبار میں صفحات کا اضافہ ہوا تو اسٹاف کا اضافہ بھی ضروری ہوگیا۔ تین نئے کمپوزروں سے واسطہ پڑا۔ عاصم صدیقی، عافف گز در اور مُلا حسن۔ عاصم شرمیلا، حسن پہلوان نما اور عافف نیک سیرت، نرم خوانسان۔ صبح کی شفٹ کا کمپیوٹر انچارج بنانے کیلئے عافف کو چنا گیا، مجھے اعتراض بھی نہ تھا کہ کون سا تنخواہ زیادہ ملنی تھی البتہ سر دردی زیادہ تھی اور اسی وجہ سے نرم خو، نیک سیرت عافف مختلف صفحات کے مدیران سے لڑتا جھگڑتا دکھائی دینے لگا۔ باقی ہم مزے کرتے، وہ حقوق کی جنگ لڑتا۔ ہم سب میں کمپوزنگ کی مقابلے بازی بھی ہوتی رہتی۔ عافف اور میں نے رفتار کا مقابلہ کیا اور کئی بار کیا لیکن میچ برابر ہو جایا کرتا ایک آدھ بار وہ جیتا تو اگلی مرتبہ میں نے اسے پچھاڑ دیا۔ عافف نے ہی ایک دن مذاق میں کہا، چلو شوکت دونوں بی اے کر لیتے ہیں، پھر مشرف کے طے کردہ معیار کے مطابق سیاست میں حصہ لے سکیں گے۔ میں نے بھی مذاق ہی مذاق میں حامی بھر لی اور عافف نے کراچی یونیورسٹی کے فارم بھر لیے۔ یوں ہم بی اے میں ہم جماعت بھی ہوگئے اور پاس بھی ہوگئے۔ میں کمپوزنگ کی نوکری چھوڑ کر دوسرے روزنامہ اخبار میں ''ادارتی انچارج'' بن گیا اور اسی دوران عافف کے انتقال کی خبر ملی۔ دل بجھ سا گیا، اتنا اچھا کمپوزر اور اس سے بڑھ کر بہترین دوست یوں عین جوانی میں خدا کو پیارا ہوگیا۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

Good کمپوزر

صبح کی شفٹ میں کمپیوٹر ڈپارٹ کا ماحول بڑا ہی پرسکون، ادبی اور سلجھا ہوا تھا۔ تمیز کی گفتگو ہوتی اور کوئی مہمان آتا تو سمجھتا سب ہی فرشتے بیٹھے ہیں۔ پھر اچانک سے ہلچل مچ گئی، فرشتوں کو شیطان بنانے کا ٹھیکہ صابر بھائی کو مل گیا۔ وہ بڑے اخبار سے آئے اور قہقہوں اور ذومعنی گفتگو کا آغاز ہوگیا۔ ''گڈ'' اُن کا تکیہ کلام تھا۔ آپ کو سیٹ بھی میرے برابر میں ملی اس لیے زیادہ اثرات مجھ پر پڑنے لگے۔ بلا سوچے سمجھے اُن کے منہ سے گڈ از خود خارج ہو جایا کرتا۔ ایک بار کسی کی کال آئی انہوں نے سنتے ہی گڈ کہا اور فون کاٹ دیا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا تو بتایا ''ایک رشتہ دار کا انتقال ہوگیا ہے۔'' اس پر باقی سب کی ہنسی نکل گئی کہ جہاں اناللہ پڑھنا ہو صابر بھائی وہاں بھی گڈ کہہ دیتے ہیں۔ ہم سب کنواروں میں آپ ہی شادی شدہ تھے اور دوسری شادی کی خواہش بڑی شدت سے رکھتے۔ کچھ عرصے بعد وہ نوکری چھوڑ گئے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پروفیسر سلیم مغل کے مشورے سے میں نے ایم اے ماس کمیونیکشن میں داخلہ لے لیا۔ وہاں میرے کلاس فیلو صابر بھائی نکلے۔ دوسری شادی کی خواہش جوں کی توں تھی اس لیے کلاس فیلوز لڑکیوں کیلئے نوٹس کمپوزنگ کی مفت خدمات کیلئے پیش پیش رہتے۔ لڑکوں سے البتہ منہ مانگے دام وصول کرتے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اپنی فیسوں کا خرچہ بھی کلاس فیلوز کے نوٹس کمپوزنگ سے پورا کیا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایم اے بھی ہوگیا، لیکن دوسری شادی نہ ہو سکی۔ آج کل بھی سب سے بڑے اخبار میں ہیں اور کمپوزنگ ہی کر رہے ہیں۔۔ گڈ صابر بھائی!

ایسی کمپوزنگ سے ہم باز آئے

اخبار کی نوکری (الیکٹرونک میڈیا بھی) اور موبائل فون پر ہونے والی دوستیاں زیادہ قابل بھروسہ نہیں ہوتیں۔ اس لیے اخباری ملازمین ہمیشہ سے دو دو نوکریوں میں لگے رہتے ہیں، ایک فُل ٹائم والی اور دوسری پارٹ ٹائم۔ تاکہ ایک جائے تو دوسری سے خرچہ پانی چلتا رہے۔ میں بھی اخبار میں کمپوزنگ کے دوران ایک

دو ماہنامے ساتھ ساتھ چلاتا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے سابقہ ایڈیٹر نے کسی اور صاحب کے حوالے کردیا کہ اُن سے ملو، انہیں کسی نیک سیرت کمپوزر کی ضرورت ہے۔ میں جاملا، معاملات طے ہوئے، دو گھنٹے روزانہ کی بات ہوئی اور اگلے دن سے میں نوکری پر تھا۔ وہ بزرگ ایک نامور کالم نگار و تجزیہ نویس تھے اور ایک ماہنامہ اپنے گھر سے بنا کر چھاپنے کے خواہش مند تھے۔ اوپر رہائش تھی اور نیچے پورا گھر اسی کام کیلئے مخصوص کردیا۔

پہلے ہی دن مجھے جو کمپیوٹر دیا، انتہائی تھکا ہوا، کی بورڈ ایسا کہ کسی ہتھوڑی سے تو اس کے بٹن دبا کر ٹھوکے جاسکتے تھے لیکن انگلیوں سے لفظوں کو ترتیب دینا ناممکن تھا۔ اور پھر گرافکس کے ذریعے پیج میکنگ تو دور کی بات تھی۔ مسئلہ بیان کیا تو انہوں نے دوسرے کمرے میں رکھا کمپیوٹر دکھا کر کہا" یہ میری بیٹی کا کمپیوٹر ہے، اسے چیک کرو، اگر اس پر کام ہوسکے تو۔"

میں نے چیک کیا، گزارہ کیا جاسکتا تھا۔ انہوں نے بہت سا مواد کمپوزنگ کیلئے دیا اور وہ چائے لانے کا کہہ کر چلے گئے لیکن خود نہ آئے البتہ چائے کے ساتھ چائے بنانے والی خود بھی آگئی۔ مجھے اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا دیکھ کر چونکی اور کچھ خاص فولڈر تک رسائی سے منع کردیا۔ کام چلتا رہا، چائے آتی رہی اور محترمہ مجھ میں غیر ضروری دلچسپی لینے لگی۔ تین ماہ چائے پانی میں کٹ گئے لیکن تنخواہ کا نام ونشان نہ تھا۔ پیسوں کا سن کر انکل جی کو سانپ سونگھ جاتا، وہ تو پیسے نکالنے کے موڈ میں نہ تھے، لیکن بیٹی اپنا آپ فدا کرنے پر تلی بیٹھی تھی اور مجھے اس وقت پیسوں کی زیادہ ضرورت تھی۔ لہٰذا ایسی کمپوزنگ سے ہم باز آئے، یہ نوکری چھوڑ کر کسی اور جگہ ملازمت اختیار کرلی۔ تجزیہ نویس انکل پر میرے تین ماہ کے پیسے اور مجھ پر اُس محترمہ کی خاموش محبت اب تک اُدھار ہے۔

صنف نازک کمپوزر

جس طرح فائر بریگیڈ کے شعبے میں خواتین کو نوکریاں نہیں ملتیں کہ اُن کا کام آگ لگانا ہوتا ہے، بجھانا نہیں۔ اسی طرح کمپوزنگ کے شعبے میں بھی میں نے آج تک کوئی پروفیشنل کمپوزر صنف نازک نہیں دیکھی۔ اس کی وجہ یہ شاید یہ ہوسکتی ہے کہ اخباری نوکری میں ایک تو اوقات بڑے سخت ہوا کرتے ہیں اور پھر کمپوزنگ کے دوران بندے کو اپنی اوقات بھی یاد رہتی ہے۔ صنف نازک کمپوزرز کی نایابی میں ایک وجہ ناخنوں کی پرورشِ لازمیہ بھی رکاوٹ ہوسکتی ہے کیونکہ تیز رفتاری کے باعث کی بورڈ کی جان کو لالے پڑ سکتے ہیں یا پھر ناخنوں کی تراش خراش میں تبدیلی آسکتی ہے۔ کچھ جگہوں پر کوشش بھی کی گئی، دن کے اوقات میں ایسی لڑکیوں کو موقع دیا جانا چاہئے جو اس فیلڈ میں قسمت آزمائی کرنا چاہتی ہوں لیکن نہ تو خوردبین سے کوئی مل سکی اور نہ دوربین لگا کر کسی کو تلاش کیا جاسکا۔ لہٰذا طے کرلیا گیا کہ کمپوزنگ کی فیلڈ بھی خالصتاً مردانہ ہے۔

کمپوزنگ میں شاگردہ شریف

ایک ہفت روزہ اخبار "ساعت" میں شام کی نوکری چل رہی تھی۔ وہاں کے آرٹ ڈیزائنر (نام یاد نہیں) نے ایک دن کہا کہ ایک لڑکی کو اُردو کمپوزنگ سیکھنی ہے، چل کر سکھا دینا۔ میں نے عرض کی کہ ابھی تو میں خود طفل مکتب ہوں، رفتار بھی اتنی زیادہ نہیں۔ میری بات سن کر وہ مسکرائے اور کہا، جتنا کچھ تم جانتے ہو، اس لڑکی کیلئے اتنا بھی بہت ہوگا۔ پرانی رفاقت نبھانے کی خاطر جانا پڑا، نارتھ کراچی کا علاقہ تھا شاید۔ ایک فلیٹ میں وہ محترمہ بڑی خوش اسلوبی سے ملیں اور پندرہ منٹ کی کلاس میں ہی فین ہوگئیں۔ پی ٹی سی ایل کا دور دورہ تھا، وہ روز فون کرنے لگیں اور یوں مواصلاتی کلاس شروع ہوگئی لیکن آرٹ ڈیزائنر ہفتے بعد ہی مجھ پر تپ گئے کہ میری اچھی دوست چھین لی ہے، گھر جاتا ہوں تو لفٹ نہیں، فون پر وقت نہیں۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں حیران کہ" کا، کی، کے" اور" چا، چوں، چے" کے سوا کوئی بات نہ ہوتی اور جناب کس غلطی فہمی میں مبتلا ہوچکے ہیں۔ بہرحال مشاورت سے طے کیا گیا کہ میں پہلے آرٹ ڈیزائنر کو سکھاؤں، پھر وہ رات میں جاکر موصوفہ کو سکھائیں اور میں کسی بھی طریقے سے شاگردہ کی پہنچ سے دور رہوں۔ اب بھی نیوز چینل کے کسی نہ کسی فلور سے کوئی محترمہ کال کرتی ہیں کہ ان پیج پر فلاں فلاں مسئلہ کس طرح حل ہوگا تو پہلی مواصلاتی شاگردہ کا چہرہ اور آرٹ ڈیزائنر کا غصہ یاد آجاتا ہے۔

فہد خان

یونیورسٹی کا اخبار

سوچیے اگر کبھی یو ای ٹی میں اخبار چھپنا شروع ہو جائے تو اس میں کیسی خبریں چھپیں گی؟ کیسے اعلانات شایع ہوں گے اور کیسے کیسے اشتہارات اس کی زینت بڑھائیں گے؟ تصور کی آنکھ سے دیکھیے: بہت سی ایسی خبریں ہوں گی جن میں رئیسِ جامعہ کی تعریف کی گئی ہو گی۔ روایتی نشست سنبھالنے اور چھوڑنے پر اشتہارات، ملازمین اتحاد کی خبریں۔۔لیکن اس سب کے علاوہ اس میں کیا کیا ہو سکتا ہے؟

خبریں۔۔سرخیاں۔۔شہ سرخیاں

۱) قبرستان یو ای ٹی کی تزئین و آرائش کا مطالبہ!

اصلاحی جماعت یو ای ٹی کے امیر شیخ غریب الدین نے یونی ورسٹی کی انتظامیہ سے مطالبہ کیا ہے کہ قبرستان یو ای ٹی کی بحالی کی جائے، ہمارے نمائندے اکبر احمد سے بات چیت کرتے ہوئے شیخ نے فرمایا کہ قبرستان کے آباد ہونے سے طلبأ کے دل میں خشیتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو گا۔ ہر دم قبریں نظروں میں گھومنے کی وجہ سے بس اڈے پر خواتین کو سی آف کرنے والے طلبأ کی تعداد میں خاطر خواہ کمی کا امکان ہے۔اس کے علاوہ آئی بی ایم کے خوش نصیب ویلھوں میں عموماً او مس سلینہ میں خصوصاً اصلاح کا جذبہ پیدا ہونے کا پورا پورا خدشہ ہے۔۔اس پر ایک طالب علم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: بلھیا اساں مرنا ناہیں۔۔گور پیا کوئی ہور!

۲) آرٹی صاحب کا چھاپہ

یو ای ٹی لاہور کے فارز ہال میں رات کے وقت، ''علی الصبح'' آرٹی صاحب نے ایک کمرے میں چھاپہ مار کر سگریٹ شیشہ اور دیگر ممنوعہ سامان برآمد کر لیا۔ چھاپے کا پتا چلنے پر نیل کے ساحل تا بخاکِ کاشغر سے تعلق رکھنے والے طلبأ نے قوتِ اخوتِ عوام کا مظاہرہ کرتے ہوئے آرٹی سے بدلہ لینے کی کوشش کی۔جس کے بعد آرٹی صاحب منظرِ عام سے غائب ہو گئے۔ طلبأ نے آرٹی صاحب کے الزامات رو کر دیے۔ایک سوڈانی طالب علم نے کہا: ''واغا دا آرتی، لاحول ولا۔۔ انا طالب مسلم۔۔ دخان لا ممنوع۔۔'' طلبأ نے الزام لگایا کہ آرٹی صاحب نے دفتر میں ''نصف مال'' جمع کروایا ہے۔ بار بار رابطے پر بھی آرٹی صاحب نے فون نہیں اٹھایا جبکہ ان کا کمرہ بدستور بند ہے۔ایک طالب علم کا کہنا ہے کہ اب وہ تین دن بعد ہی میسر ہوں گے کیوں کہ ''گمشدہ نصف مال'' تین یوم کے لیے کافی ہے۔

۳) ایک فلاحی کام

وی سی صاحب نے سول اور مکینیکل ڈیپارٹمنٹ کی سی ایس ڈیپارٹمنٹ کے باہر بھٹکتی آتماؤں کی بے چینی کا نوٹس لیتے ہوئے سی ایس ڈیپارٹمنٹ کے باہر بنچ نصب کروادیں ہیں۔ وی سی نے طلبأ کے دوجے ڈیپارٹمنٹ میں دلچسپی کو دل سے سراہا ہے۔ طلبأ نے ایسے اقدامات کی توثیق کی ہے۔ چند طلبأ کا کہنا تھا کہ اگر بنچوں کی پشت کی بجائے رخ اگر سی ایس ڈیپارٹمنٹ کی طرف ہوتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔

۴) لٹریری سوسائٹی کا عظیم کارنامہ

ہمیشہ کی طرح اپنے بزرگوں کا ریکارڈ توڑتے ہوئے لٹریری سوسائٹی کے شاہینوں نے سمسٹریکل سپلی کمپی ٹیشن میں پانچ سپلیاں بہت بڑے مارجن سے لے کر بیسٹ سوسائٹی کا خطاب حاصل کرلیا ہے۔ اس موقع پر چیف کوآرڈینیٹر بزرگو ں کو یاد کرتے کرتے آنکھیں ''نم ناک'' کر بیٹھے۔ انھوں نے اس کامیابی کا سہرا جنرل سیکرٹری ہاموں صاحب پر ڈالا۔ جنھوں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: مجھے بچپن سے سہرا پہننے کا شوق تھا۔ خیراب ''دوں'' نہ سہی تو یوں سہی!''

۵) ادھارا گلے چوک سے

سپوٹس کیفے کے ڈائرکٹر چاچا بھولا نے کھاتے پر کھانا بند کرنے کا اعلان کردیا۔ انھوں نے کہا ہے کہ وہ بھولے ہیں، کھوتے نہیں ہیں۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ لوگ کھاتے میں کھاتے کھاتے، انہیں کھوتا سمجھ کر کھاتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے پیسے بھی کھا جاتے تھے۔ بعض لوگ دو دو دفعہ کھانا کھانے لگے تھے چاچے نے ایسے لوگوں کو عبرت ناک قبض ہونے کی بددعا بھی دی ہے۔

اشتہارات

۱) چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے!

عابد کریانہ سٹور۔ ایل اینڈ ایم، مالبرو، پلس، جملہ اقسام کی خوشبودار اور بدبودار سگریٹ دستیاب ہیں۔ چرخی گیٹ سے ۳ سیکنڈ کی مسافت پر۔ گیٹ بند ہونے پر بھی سروس ''چالو'' رہتی ہے۔

۲) غوثیہ فاسٹ فوڈ

شوارما۔ پیزا۔ زنگر۔ چلیبر

یو ای ٹی کے گیٹ نمبر پانچ سے چند سو قدم کے فاصلے پر۔۔۔ غوثیہ فاسٹ فوڈ

ہماری سروس رات بارہ بجے کے بعد بھی میسر ہوتی ہے۔

ہمارا پکایا ہوا پیزا کھانا عام انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے کرس گیل جیسے ہونٹ، بلعم باعور جیسا منہ، اور ڈائنوسار جیسا معدہ درکار ہے۔

ڈیٹنگ کے لیے چھت پر بیٹھنے کا بھی انتظام ہے۔

(نوٹ۔ چھت پر کیمرہ بھی لگا ہوا ہے۔ اپنی ذمہ داری پر سلسلہ جنبانی و حیوانی کے لیے دست دراز کریں!)

۳) تبدیلی نام

میں نے اپنا نام وٹو سے بدل کر ایلوس پریسلے رکھ لیا ہے۔ آئندہ مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے۔ نادرہ کے ریکارڈ اور میری ایم بی اے، آئی بی ایم ڈیپارٹمنٹ یو ای ٹی لاہور کی ڈگری پر نام بھی تبدیل کیا جائے۔ کسی کو اعتراض ہو تو سات دن میں رابطہ کرے۔ سات دن بعد عقیقہ اور رسمِ ''گل تراشی'' کے بعد

میر تقی میرؔ جب دلی کو چھوڑ کر لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کرنے کرایہ بھی پاس نہ تھا، ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے، تھوڑی دور آگے چل چل کر اس شخص نے کچھ بات کی۔ یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ رہے۔ کچھ دیر کے بعد پھر اس نے بات کی۔ میرؔ صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے ''صاحب قبلہ! آپ نے کرایہ دیا ہے، بے شک گاڑی میں بیٹھئے، مگر باتوں سے کیا تعلق؟''
اس نے کہا ''حضرت، کیا مضائقہ ہے؟ راہ کا شغل ہے، باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔''
میرؔ صاحب بگڑ کر بولے ''خیر، آپ کا شغل ہے، میری زبان خراب ہوتی ہے۔''

ایک محفل میں کچھ شاعر بیخود دہلوی اور سائل دہلوی کا ذکر کر رہے تھے۔ ایک شاعر نے شعر سنائے جس میں دونوں کے تخلص نظم تھے۔ وہاں حیدر دہلوی بھی موجود تھے۔ شعر سن کر کہنے لگے "اس شعر میں سائل اور بیخود تخلص صرف نام معلوم ہوتے ہیں۔ کمال تو یہ تھا کہ شعر میں تخلص بھی نظم ہو اور محض نام معلوم نہ ہو۔"

کسی نے کہا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

حیدر نے وہیں برجستہ یہ شعر کہہ کر سب کو حیران کر دیا۔

پڑا ہوں میکدے کے در پر اس انداز سے حیدر
کوئی سمجھا کہ بے خود ہے کوئی سمجھا کہ سائل ہے

ہرگز ہرگز نام تبدیل نہ کیا جائے گا۔

ایلوس پریسلے ولد بوٹا سنگھ۔۔ چیچو کی ملیاں

۴) پھلا نگنے والا خبر دار!!!

حبیب بنک، انجینئرنگ یونی ورسٹی برانچ کے دونوں دروازے کسی کے باپ کے نہ ہیں۔ شارٹ کٹ مارنے والے حضرات اپنی اپنی وصیتیں تیار رکھیں۔ ہم نے بلڈوزر نالم کا نیا سیکورٹی گارڈ ہائر کیا ہے۔

۵) انتباہ

جن صاحب نے کمرہ نمبر ۴۱۲ خالد ہال سے ایک عدد سیفٹی ریزر چوری کیا ہے وہ چپ چاپ واپس دے جائیں۔ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ریزر کبھی بھی ڈاڑھی کاٹنے میں استعمال نہ ہوا تھا!

۶) مشتری ہوشیار باش

بعض لڑکیوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ ایس ایس سی میں اپنے ڈربے میں ہی انڈے دیا کریں۔ ورکنگ باؤنڈری پار کر کے علاقہِ غیر میں ڈیرہ جمانے والیوں سے آڑے ہاتھوں نمٹا جائے گا، ہاں ڈربے میں جگہ نہ ہونے پر منیجر کا کمرہ حاضر ہے۔

منیجر ایس ایس سی یو ای ٹی لاہور

۷) پیاری پیاری میٹھی میٹھی کا کیو!

رات کو یوں بن ٹھن کر جنت روڈ پر گھومنے سے تمہیں ہرگز حوروں کا رتبہ نصیب نہیں ہونے والا۔ البتہ تمہارے تعاقب میں پھرنے والے بندر ضرور مسخ ہو کر لنگور ہو جائیں گے۔ اس سے قبل بھی تمہارے ایسے ہی اعمال کی بدولت جی ایس ایس سی کے باہر درخت پر بجلی گری تھی۔ عذاب الٰہی تاک میں ہے۔

نوٹ: جو یہ اعلان دو کاکیوں کو سنائے گا اسے فائنلز میں اے گریڈ ملے گا۔ اور ساری لیبز بھی اچھی ہوں گی۔ ایک لڑکے نے اسے نظر انداز کر دیا اس کے کمرے کا فیوز اڑ گیا۔

۸) ایک اعلان

ایک افسوس ناک بات سامنے آئی ہے کہ مسجد کے باتھ روم میں بعض لڑکے لڑکیوں کے فون نمبر لکھ آتے ہیں۔ یہ وہی لڑکے ہیں جو کمرہِ امتحان میں کچھ لکھے بغیر خالی شیٹ پکڑا آتے ہیں۔ تفتیش پر ان میں سے اکثر نمبر لڑکوں کے ہی نکلے ہیں۔ ایک تو نمبر لکھنا ہی غلط ہے، دوجا اگر نمبر لکھنا ہی ہے تو براہِ مہربانی صحیح نمبر لکھو۔

ایک خیر خواہ

۹) خوشخبری

پاکیزہ حضرات کے پہننے کے لیے گھوڑوں کی آنکھوں کے گرد پہنانے والے چمڑے کے ٹکڑے دستیاب ہیں۔ غضِ بصر کے لیے ہر طرح سے مفید! جوڑی خریدنے والے کو خصوصی رعایت۔

۱۰) چیلنج

آلو والے پراٹھے دستیاب ہیں۔۔ یہ صرف حاسدوں کا پروپیگنڈا ہے کہ ہمارے آلو والے پراٹھوں میں آلو کی ملاوٹ کی جاتی ہے۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے آلو والے پراٹھوں میں ہرگز ہرگز آلو استعمال نہیں کیے جاتے۔ ہمارے پراٹھوں میں آلو ثابت کرنے والے کو دس ہزار روپے نقد انعام

۱۱) یو ای ٹی انٹرنیٹ سروسز

ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارے نیٹ کی سپیڈ اور مصباح کا سکور ریٹ ایک سا ہے!

یو ای ٹی انٹرنیٹ سروس۔۔۔۔ ابھی بھی نہیں کبھی بھی نہیں

چند نمونے کے کالم

”آپ کے نفسیاتی وسماجی مسائل“

۱) جناب میں بہت پریشان ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہاسٹل میں سب مجھ سے سامان مانگ تانگ کر لے جاتے ہیں۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ ماں قسم اس وقت ایک چڈی میں ملبوس یہ خط لکھ رہا ہوں کہ نہانے کے بعد تولیا لپیٹے باہر آیا تو روم میٹ میرا لباس پہن کر چلا گیا تھا۔ میرا دل رونے کو چاہ رہا ہے۔ میں کیا کروں مجھے مشورہ دیجیے۔

جواب: محترم آپ نے اپنے اوپر دوسروں کی دل آزاری نہ کرنے کی چڈی ایویں ای چڑھا رکھی ہے۔ فوراً سے بھی قبل یہ چڈی اتار پھینکیے۔ اور ایک لمحہ سوچے بنا ساتھ والے کمرے میں جا کر ہمسائے کا سب سے اعلیٰ سوٹ مانگئے، اس کے برابر کے کمرے سے ٹائی ادھار لیں اور اگلے کمرے سے کینوس شوز۔۔۔ کسی دوسرے کے کمرے میں جا کر اس کے واش روم میں نہائیے۔۔ یہ کہہ کر کہ میرے واش روم میں پانی نہیں آ رہا اور اس نہاتے سے شیمپو صرف سر پر ہی نہ ملیے۔۔۔ بلکہ۔۔۔۔۔۔ صابن کی جگہ شیمپو استعمال کیجیے۔ اور پھر ایس ایس سی جا کر سموسے نوش فرمایئے جس کی چٹنی دانستہ سوٹ پر گرایئے۔۔ اور بلا معذرت وہ سوٹ واپس کیجیے۔۔ آپ کو دلی سکون ملے گا۔

۲) میرے یہاں کا نیٹ بہت سلو چلتا ہے۔ میں کرکٹ کا شیدائی ہوں مگر اس کمزور انٹرنیٹ کی وجہ سے صرف Cricinfo.com پر پٹی میں چڑھتے رنز اور اترتی وکٹیں شمار کرتا رہتا ہوں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ میرا سکور ہر دفعہ بعد میں بڑھتا ہے، اس سے پہلے ہی ساتھ والے کمرے سے چوکے، چھکے پر نعرے مارنے شروع کر دیے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ ان کی چیخ سے پہلے میری چیخ نکلے۔۔ مگر ابھی تک میرا خواب پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا۔ وہ لوگ تھری جی پر نیٹ چلاتے ہین جو کہ میں افورڈ نہیں کر سکتا۔ میرا ایک دوست آج کل مجھے انقلاب پر مبنی کتابیں پڑھنے کو دے رہا ہے۔ جیسے سرخ انقلاب۔۔۔ درانتی۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ جنھیں پڑھ کر میں پولتاری بنتا جا رہا ہوں۔ مجھے ان سرمایہ داروں سے نفرت ہونے لگی ہے جو اپنے سے پہلے کسی غریب کو چیخ مارنے کا موقع بھی نہیں دیتے! اب دیکھیے آگے ورلڈ کپ آ رہا ہے۔۔ اگر ورلڈ کپ کے دوران بھی یہ سب اسی طرح چلتا رہا تو یا تو میں خود دھماکہ کر ڈالوں گا یا پھر خود کشی! براہِ کرم کوئی ایسا طریقہ بتایئے کہ پہلے میری ہی چیخ نکلے۔

جواب: محترم۔۔ آپ کی کرکٹ سے دیوانگی دیکھ کر ہمیں اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آ گیا۔۔۔ ارے! واہ۔ ورلڈ کپ کے لیے اس سال ہم نے ۱۲ انچ سکرین کی حاملہ ایل سی ڈی لینے کا ارادہ کیا ہوا ہے۔ آپ یہاں آ کر میچ دیکھ لیا کیجیے گا۔ ان شاءاللہ اکٹھے میچ دیکھ کر اکٹھے ہی چیخ ماریں گے۔ اور اگر آپ کو کوئی اعتراض ہو تو ہم چند سیکنڈ یہ سوچ کر اپنی چیخ دبا لیں گے کہ آپ کی حسرتیں پوری ہو سکیں۔ بس ایل سی ڈی کی آدھی قیمت مبلغ ۲۱۰۰۰ روپے جمع کروا دیں۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا!

۳) میں جب بھی آئی بی ایم کے سامنے سے گزرتا ہوں تو وہاں بیٹھی کچھ خواتین مجھے دیکھ کر مسکرانے لگتی ہیں۔۔ اس پر میرا من ان سے جا کر بات کرنے کو چاہتا ہے مگر جا نہیں پاتا۔ مجھے کوئی

میں نے سنا ہے یہ sorry اور Nice بہن بھائی ہیں اور دونوں نے ہی بہت قربانیاں دی ہیں۔ لوگ بڑی سے بڑی غلطی کرتے ہیں اور الزام بچارے sorry پہ ڈال دیتے ہیں اور بچاری nice مرحومہ کی قربانیاں بھی کچھ کم نہیں۔ کئی چاہے جتنا بھی اچھا کام کر لے، انعام میں nice اپنی جان گنوا بیٹھتی ہے اور انھیں بہن بھائی کے دکھ میں برابر کے شریک ان کے کزن kutta صاب بھی ہیں۔ اکثر غصہ میں ان کو بلی چڑھایا جاتا ہے۔ راہ چلتے کسی نے لڑکی کو چھیڑ دیا، جواب میں kuttay صاب کی شامت آ گئی، کتے تیرے گھر ماں بہن نہیں۔ بھلا بچارے کتے کا کیا قصور ہے یہاں اپنے دکھوں کا اظہار کرتے ہوئے 30-dec-2014 کو لانگ مارچ کا اعلان کیا ہے اور آپ سب کو بھرپور شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔

ارسلان بلوچ ارسل

طلائی کشتہِ ہمت عطا کیجیے۔

جواب: آپ نے آئی بی ایم کی لڑکیوں کو خواتین کہہ کر ہماری حسِ لطیف کو خودکش دھماکے سے مجروح کر ڈالا ہے!

اصولاً تو آپ کو جواب دینا ہی نہیں چاہیے تھا مگر پھر بھی۔۔۔:

بھائی لڑکیوں کے مسکرانے سے کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہو جایا کیجیے۔ سب سے پہلے یہ چیک کیا کریں کہ کہیں آپ کا ناڑا تو نہیں لٹک رہا؟ اگر آپ نے کسی قسم کی شلوار زیب تن نہیں کر رکھی بلکہ پینٹ پہنی ہے تو کہیں پینٹ میں آزادیِ اظہارِ رائے کے نام پر کوئی روشن دان کھلا تو نہیں؟ یا پھر یہ بھی تو ہو سکتا ہے صبح شیو کرتے ہوئے آپ نے اپنے تھوبڑے کی داہنی طرف تو صاف کر ڈالی مگر بائیں بھول گئے؟

اگر ان سب میں سے کوئی بات درست نہیں تب بھی مجھے یقین ہے کہ ان کے ہنسنے کا سبب آپ کی کوئی چول ہی ہے۔ سب سے پہلے اس چول کو تلاش کریں اور اور اس کا علاج کریں۔ امید ہے ان کی بتیسیاں بند ہو جائیں گی۔

''آج کا دن کیسا گزرے گا؟''

اگر آپ الیکٹریکل کے طالب علم ہیں تو آپ کو آج چند ٹھیلا لڑکیوں کی باتوں پر روتے دل کے ساتھ مسکرانا پڑے گا۔

مکینیکل اور سول کے لڑکوں کو حسبِ معمول سی ایس اور آر کی ڈیپارٹمنٹ کا چکر لگانا ہی ہوگا۔ لالہ زار میں نشستیں سنبھالنا بھی آج کے معمول میں شامل ہے۔ ہاں البتہ آپ کو کھانے کے لیے آج بھی سپورٹس کیفے کی سرخ لوبیا ہی میسر ہوگی۔

آپ کا شعبہ سی آر پی ہے۔ آج بھی آپ دل کی بات زبان پر نہیں لا سکیں گے اور وہ آپ کو دیکھتے ہی بھائی کہہ کر پکارے گی۔ جواباً آپ کو بھی اسے سسٹر کہہ کر پکارنا پڑے گا۔

آپ آئی بی ایم میں پڑھتی ہیں۔ (پڑھنا محاورتاً۔ وگرنہ ایک سروے کے مطابق تمام یو ای ٹی اینز اس بات پر متفق ہیں کہ آئی بی ایم میں پڑھائی نہیں ہوتی۔۔) آج بھی آپ کو میک اپ کرتے ہوئے بھاگ کر یونی آنا پڑے گا اور آپ ناشتہ نہیں کر

جواز

ایک مشاعرے میں ہر شاعر کھڑے ہو کر اپنا کلام سنا رہا تھا۔ فراق صاحب کی باری آئی تو وہ بیٹھے رہے اور مائیک ان کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ مجمع سے ایک شور بلند ہوا ''کھڑے ہو کر پڑھئے۔۔۔ کھڑے ہو کر پڑھیے۔''

جب شور ذرا تھما تو فراقؔ صاحب نے بہت معصومیت کے ساتھ مائیک پر اعلان کیا ''میرے پاجامے کا ڈورا ٹوٹا ہوا ہے۔ (ایک قہقہہ پڑا) کیا آپ اب بھی بضد ہیں کہ میں کھڑے ہو کر پڑھوں؟''

مشاعرہ قہقہوں میں ڈوب گیا۔

پائیں گی۔ اور آج آپ کو وہی لڑکا پیزا کھلائے گا جس سے آپ نے پچھلے ہفتے اسائنمنٹ بنوائی تھی۔ آج بھی اسد آپ کو نظر انداز کر کے مہ پارہ کے ساتھ مصروف رہے گا۔

آپ ہاسٹل میں رہتے ہیں۔ آج حسبِ معمول آپ ۸:۰۰ بجے بیدار ہوں گے اور ناشتہ کر کے ۷:۳۰ منٹ پر کلاس میں پہنچ جائیں گے۔ آپ کنگھی نہیں کر سکے کیوں کہ وہ کل ہمسایہ لے گیا تھا اور آپ کا شیمپو بھی آپ کا روم میٹ روح افزا سمجھ کر پی گیا ہے۔ آپ کو آئی بی ایم کے سامنے پہنچ کر احساس ہوگا کہ آپ کی پینٹ کی زپ کھلی ہوئی ہے۔ مگر آپ اسے بند نہیں کریں گے۔ میس میں روٹی ملنا دشوار ہے البتہ سالن فوراً مل جائے گا۔ آج مفت کی سگریٹ نہیں ملے گی۔ بلکہ مطالبہ کرنے پر بے عزتی کا بھی خاصا امکان ہے۔ رات کو آپ کے پیٹ اور دیگر حصے میں مروڑ اٹھے گا جسے دور کرنے کے لیے آپ جنت روڈ پر واک کریں گے۔

تصور کے گھوڑے کو بریک لگاتے ہوئے زمین پر واپس آتے ہیں۔ جب تین سال سے ایک ونہ چھپ سکا تو اخبار نکالنے کی ہمت بلاکس کے والد گرامی میں ہے۔ (بزبانِ شائستہ!)

حسیب احمد حسیب

اجی کون تسلیم کرتا ہے کہ اسکی زندگانی کی گھڑیاں کم سے کم ہوتی چلی جارہی ہیں اور وقت آخر قریب آتا چلا جارہا ہے معاملہ تو یہ ہے کہ چاہے وہ بوڑھا ہو کہ جوان مرد ہو کہ عورت ہر دل کی ایک ہی صدا ہوتی ہے۔

بھلا میں چھوڑ دوں یہیں
ہے موت اس قدر قریں
مجھے نہ آئے گا یقیں

☆

نہیں نہیں ابھی نہیں
ابھی تو میں جوان ہوں

برصغیر پاک وہند کی دو بڑی بیماریوں میں سے ایک بیماری عمر کا غم اور دوسری بیماری نسل کا غم ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ جب ہم یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید پچھلی صدیوں میں تمام سادات صوبہ بہار میں نقل مکانی کر گئے تھے اور اسی دور میں ہم پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ قریش کے بارہ قبیلے نہیں تھے بلکہ ایک قبیلہ اور بھی تھا کہ جو بلد عرب سے گمشدہ ہو کر سرزمین ہند میں آباد ہو گیا اس قبیلے کا اصل نام "بنو قصاب" تھا آج لوگ اسے قریشی اور فصیح اردو میں "کریسی" کہتے ہیں۔۔۔اجی چھوڑیے اس نسلی احساس کمتری کا تذکرہ کہاں سے آگیا ہم تو گفتگو فرما رہے تھے زندگانی کی گھڑیوں کی چوری کی۔۔۔کہتے ہیں عورت سے اسکی عمر اور مرد سے اسکی تنخواہ پوچھنا بداخلاقی ہے اور ہم اکثر اس بداخلاقی سے بچتے ہیں کیونکہ اس کے بعد اگلے کے اخلاق خراب ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔۔۔دھچکا آپ کو اس وقت لگتا ہے کہ جب بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے آپ کا تعارف کسی دوسرے سے یہ کہہ کر کروائیں۔۔۔اجی ہم تو اُن کی گودوں میں کھیلے ہوئے ہیں ۔۔۔جھوٹ بولنے والے پر خدا کی لعنت۔

ایک روز ایک مدقوق سفید ریش بابے نے انتہائی تیقن کے ساتھ ہمیں انکل کہہ کر پکارا تو ہم گھر آکر دیر تک آئینے میں اپنی صورت دیکھتے رہے اور سوچتے رہے کہ ”آئینہ جھوٹ بولتا ہے یا پھر ہماری آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں۔“

گزشتہ شب جب ہمارے ایک دوست شاہد میاں فرمانے لگے کہ میاں میں تو تمہیں بچپن سے دیکھ رہا ہوں تو ہم نے آگے سے پوچھ لیا" ہمارے بچپن سے یا تمھارے بچپن سے "تو وہ ہم سے اکھڑ گئے اور بچپن کے تعلقات کے حوالے سے کچھ ایسے انکشافات فرمانے لگے کہ ہمیں اپنی دوستی اور انکی اخلاقیات دونوں ہی مشکوک دکھائی دینے لگیں، وہ تو میں سگریٹ کا عادی ہو گیا ہوں

زبید بھائی خود بھی کوئی کام کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ بچار کے عادی ہیں مگر پھر بھی کبھی کبھی مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ عقلمند آدمی جتنا ٹائم کسی کام کے بارے میں سوچ بچار پر صرف کرتا ہے، اتنی ہی دیر میں بے عقل آدمی دو چار کام مکمل کر کے سگریٹ سُلگا رہا ہوتا ہے۔

اعظم نصر

وگرنہ میری عمر ہی کیا ہے، اجی مجھے تو فکروں نے بوڑھا کر دیا۔''

میں بچپن ہی سے بھری دوپہر میں آوارہ پھرنے کا عادی تھا میرے بال تو نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ تو ایسے بھی ہیں کہ اپنا شناختی کارڈ اپنے بچوں کی بلوغت کے وقت بنواتے ہیں اور پھر اپنی کم عمری پر اتراتے ہیں۔۔۔ عجیب بات ہے کہ ہم اپنے بہت سے دوستوں اور خاندانی ہم عصروں سے عمر میں بہت آگے نکل گئے جبکہ بڑے بتلاتے ہیں تم تو ساتھ کے ہو۔

ہاں شاید ہم کسی اور عصر میں زندہ ہیں اور وہ کسی اور زمانے میں جی رہے ہیں۔ یہ معاملہ تو ایسا معاملہ ہے کہ ابو الاثر حفیظؔ جالندھری بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کہہ ڈالی۔

نہ مے میں کچھ کمی رہے
قدح سے ہمدمی رہے
نشست یہ جمی رہے
یہی ہما ہمی رہے
وہ راگ چھیڑ مطربا
طرَب فزا، الَم رُبا
اثر صدائے ساز کا
جگر میں آگ دے لگا
ہر ایک لب پہ ہو صدا
نہ ہاتھ روک ساقیا

☆

پلائے جا پلائے جا
ابھی تو میں جوان ہوں

نجانے کس ظالم نے یہ نظم گواتے وقت ملکہ پکھراج کے ساتھ طاہرہ سید کو بٹھا دیا اور وہ

''ابھی تو میں جوان ہوں''

''ابھی تو میں جوان ہوں''

کی تکرار کے باوجود قصہ پارینہ دکھائی دیتی رہیں۔۔۔ سنا ہے پچھلے زمانے میں وہ نوجوان خواتین کہ جو شادیاں ہونے سے رہ جاتیں اپنی عمر چھپاتیں اور وہ بابے کہ جو بنیں بیاہتے بڑھاپے کی دہلیز تک جا پہنچتے اپنی زندگی کی گھڑیوں میں ڈنڈی مارتے، لیکن کیا کیجئے

ہر بو الہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

فلمی اداکاروں کی عمر چوری تو کمال کی تھی کہ انکا کمال ہی اس میں تھا بڑی بڑی عمروں کے بابے اور قبر میں پیر لٹکا؟ بیٹھی بیبیاں جس انداز میں سرسوں کے کھیتوں میں محو رقص ہوتے اجی اس کے کیا کہنے۔

عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی
الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں
ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں
تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر
کوئی اِدھر کوئی اُدھر
ابھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر
تمھارا نقطۂ نظر
درست ہے تو ہو مگر

''ابھی تو میں جوان ہوں''

عقل بڑی چالاک ہے اور ہمیشہ دل کو اپنا تابع کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی ہے لیکن یہ وہ معاملہ ہے کہ جس میں عقل و دل کا باہمی اشتراک ہے بلکہ یوں کہیں کہ اس عمر چوری کے جرم میں دونوں شریک ہیں تو کچھ غلط بھی نہ ہوگا۔

''دل ہے کہ مانتا نہیں''

اور

عقل چالاک ہے کہ بہانے تراشتی ہے

جاتی ہوئی جوانی سے ہر کوئی یہ کہتا دکھائی دیتا ہے، اے میری محبوب جوانی۔

آج جانے کی ضد نہ کرو
یونہی پہلو میں بیٹھی رہو
ہائے! مر جائیں گے ہم تو لُٹ جائیں گے
ایسی باتیں کیا نہ کرو
تم ہی سوچو ذرا کیوں نہ روکیں تمہیں
جان جاتی ہے جب اُٹھ کے جاتے ہو تم
تم کو اپنی قسم جانِ جاں بات اتنی میری مان لو
آج جانے کی ضد نہ کرو

مگر جناب جوانی تو دیوانی ہوتی ہے کہ کب کہاں کسی کی مانتی ہے اور بڑھاپا کب آ جاتا ہے یہ کسے معلوم ہو پاتا ہے۔ آپ کچھ بھی کر لیجئے۔ ہیر کلر اور میک اپ کی تہوں میں سچائی چھپائے نہ چھپے ہے۔ یہ شناختی کارڈ میں لکھوائی گئی جھوٹی عمر چہرے پر پڑی جھریوں کی چادر کو کیسے جھٹلا سکے گی۔

اجی جانے والی جوانی ان حیلوں بہانوں سے لوٹ کر نہیں آ سکے گی۔ اب تو بس ہر دوسری عورت کو آنٹی اور ہر دوسرے مرد کو انکل کہ کر دل بہلائیں اور سانسوں کی مالا پر ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کی تسبیح پڑھتے چلے جائیں۔

بحریہ والے

خود تو بھاری بھرکم ہیں وزن میں نہیں مصرعے
بہر سے ہیں بے بہرہ پھر بھی شعر کہتے ہیں

اب زبان میں دیکھیں کیسا آگیا بحرا
کہتے ہیں زمیں والے "بحریہ" میں رہتے ہیں

سید مظہر عباس رضوی

بحر میں

شاعرِ نظمِ معریٰ کچھ تو کر پاسِ ادب
دھوم ہے تیری سخن آرائی کی ہر شہر میں

لہر میں جیسے سمندر کے ہے اک موسیقیت
"بحریہ" میں تو کم از کم شعر کہہ دے بحر میں

سید مظہر عباس رضوی

مشاعراتی شاعر کے لئے

مسخرہ پن کیش کر اور عیش کر
چاہئیں گر تجھ کو پیسے شعر کہہ

جن کو سن سن کر پڑیں بل پیٹ میں
اب لطیفے پڑھ کے ایسے شعر کہہ

سید مظہر عباس رضوی

غور کریں

ایک فہرست ہے لہراتی ہوئی طول طویل
کس کو چھوڑیں کسے لیں فیصلہ کس طور کریں

ہم اگر عرض کریں گے تو شکائت ہوگی
"آپ ہی اپنی دواؤں پہ ذرا غور کریں"

سید مظہر عباس رضوی

نرس

ایک ہاہاکار ہے دیکھو جدھر
وارڈ سارا ہو گیا زیر و زبر

چیختی ہے نرس مردوں کی طرح
کیا کرے ہے نام میں موجود ''نر''

سید مظہر عباس رضوی

سیلفی

کل غیر کے جو ساتھ بنائی تھی آپ نے
ہر چند فیس بک پہ وہ سیلفی سجایئے

لیکن جو ریزہ ریزہ ہوا ہے ہمارا دل
اُس پر بھی اپنے ہاتھ سے ایلفی لگایئے

خالد محمود

گھر داماد

یقیناً کا اُس کا ہے، اُسی کو زیب دیتا ہے
مگر دنیا کی رسموں کو وہ اکثر توڑ دیتا ہے

وہ گھر داماد ہو کر بھی انا کا پاس رکھتا ہے
کہ جھاڑُو تو لگا دیتا ہے، پوچا چھوڑ دیتا ہے

خالد محمود

برائلر

کس درجہ کمالات مشینوں نے کیے ہیں
انڈے نکل آئے، کبھی بچے نکل آئے

بچپن میں جو کھاتے تھے بہت پیار کی قسمیں
ہونے پہ جواں دونوں ہی مرغے نکل آئے

خالد محمود

ننگے پاؤں

لے کر چپل، چور چلا جو سرعت سے
بھاگے اُس کے پیچھے پیچھے ننگے پاؤں

چوری ہوئی پاپوش نئی، مسجد سے پھول!
barefooted یعنی آئے ننگے پاؤں

تنویر پھول

سامان بھی گیا۔۔۔

مُلّا ہیں، کر کے بیٹھے ہیں وہ چار شادیاں
اُن کا پڑوس چھوڑ کے ہمسائیاں گئیں

مرغے کے پیچھے جاتی ہیں جس طرح مرغیاں
تایا کے پیچھے پیچھے سبھی تائیاں گئیں

تنویر پھول

بھول جا

اِک یار میرے کان میں کہتا ہے یہ سدا
پتی سے تیری، دیکھ! جگر ہیرے کا کٹا

تو ہے جری ، دلاور و باحوصلہ بہت
تجھ سے یہ کہہ رہا ہوں کہ تن ویر! بھول جا!

تنویر پھولؔ

ملک وملت کے امیں

حال اپنا کیا بتائیں قوم کے یہ مذہیں !
کوئی سکہ ، کوئی پائی، کچھ پراپرٹی نہیں

ملک میں دولت تھی جتنی، پارسل باہر ہوئی
کھا گئے سب لُوٹ کر یہ ملک وملت کے امیں

تنویر پھولؔ

کیسے لگے؟

یار میرے !تم تو کھاتے ہو سدا تکّہ کباب
آج دستر خوان پر آلو مٹر کیسے لگے؟

رہ گیا پنجرہ کھلا، بولو ذرا مٹھّے میاں!
کھا گئی بلی اُسے، طوطے کے پر کیسے لگے

تنویر پھولؔ

تازہ غزل

سارے اخبارات میں چھپتی رہی تازہ غزل
پورے ستر سال ابا نے پڑھی تازہ غزل

تازگی میں ایک فیصد بھی کمی آئی نہیں
دس برس سے پڑھتا ہوں میں بھی وہی تازہ غزل

احمد علوی

حسرتِ ناتمام

ہماری عمر کے ہر ایک شوہر کی تمنا ہے
پلٹ آئیں سہانے دن بڑھاپہ بھی سنبھل جائے

نیا سسٹم کوئی ایجاد ہو ایسا زمانے میں
پرانی والی بیوی سے نئی بیوی بدل جائے

احمد علوی

افسوس

وہ ہو گئے ہیں بیوی کی خدمات پہ معمور
قاضی سے جو نکاح کے دو بول پڑھ گئے

تاریخ میں وہ نام ہوئے زندہ و جاوید
گھوڑی پہ جو چڑھے نہیں سولی پہ چڑھ گئے

احمد علوی

مجھے دے دو!

ہمیشہ مجھ سے کہتا ہے یہ رمضانی مجھے دیدو
تم اپنی بے وقوفی اور نادانی مجھے دیدو

نظر بیوی پہ جاتی ہے کوئی جب گنگناتا ہے
"تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دیدو"

احمد علوی

پیاری بیوی

موٹی ہو کہ پتلی ہو، ہلکی ہو کہ بھاری ہو
بیوی وہ ہماری یا بیوی وہ تمہاری ہو

ہر عمر کے شوہر کا علویؔ ہے یہی کہنا
بیوی وہی پیاری جو اللہ کو پیاری ہو

احمد علوی

بلائے آسمانی

نہیں محفوظ کوئی بھی ہے شوقِ شوہری جس کو
یہ آفت سب پہ آئی ہے یہ آفت سب پہ آنی ہے

سنا یہ ہے بنا کرتے ہیں جوڑے آسمانوں پر
تو یہ سمجھیں کہ ہر بیوی بلائے آسمانی ہے

احمد علوی

ہوشیار چور

مسرور تھا کہ ہو گئی پوری مری مراد
کل چور گھر میں گھس گئے دروازہ توڑ کے

علویؔ تمام چور تھے کس درجہ ہوشیار
سامان سارا لے گئے بیوی کو چھوڑ کے

احمد علوی

تازہ غزل

ہنستی ہے تو اب بھی دل میں رونق سی ہو جاتی ہے
گلشن گلشن اس کے آگے سب کچھ ماند تو اب بھی ہے

عمر کے کچھ اثرات ہیں ورنہ اور تو کوئی بات نہیں
پورا چاند رہی نہ شائد آدھا چاند تو اب بھی ہے

اعظم قیصر

ہوش باش

نہ کر غرور اسی پانچ سال پر اپنے
کہ اقتدار کا تختہ الٹ بھی سکتا ہے

جو آج شیر و شکر ہیں وہ کل کے دشمن تھے
یہ اتحاد ہے نازک سا بٹ بھی سکتا ہے

گوہر رحمان گہر

ہاتھ کنگن کو آرسی کیا

کچھ زن مرید مل گئے، ہوٹل میں طے ہوا
کھانا وہی کھلائے گا شوہر جو شیر ہے

اتنے میں سب کی بیویاں بھی آگئیں وہاں
کہنے لگیں کہ لاؤ جی! اب کس کی دیر ہے؟

ہاشم علی خان ہمدم

تکڑم

یہ جڑواں بیگمات کا جنگی کمال ہے
تینوں میں تال میل کا ہونا محال ہے

بے جوڑ سا یہ خانگی تکڑم بطور خاص
سہ لخت ہائیکو کی مناسب مثال ہے

ڈاکٹر عزیز فیصل

گرفتاری

چلایا گرفتاری سے پہلے کوئی گنجا
پولیس جو لے جانے لگی اُس کو جکڑ کر

وِگ ہاتھ میں رہ جائے گی سمجھو تو خدارا
گاڑی میں نہ ٹھونسو مجھے بالوں سے پکڑ کر

جواد حسن جواد

انگلش سوٹ

اُس کے جب ٹوپیس انگلش سوٹ کی تعریف کی
کیا بلیک اس کا کلر، فیشن بھی ہے کس ڈھنگ کا

بولا وہ خاطر تواضع ہی نہ کر ڈالے پلس
کوٹ میرا بھی وکیلوں سا ہے کالے رنگ کا

جواد حسن جواد

شکار

جو بھی کہنا ہے وہ اپنے خون سے لکھ بھیجنا
مجھ کو روکا ہے زبانی حالِ دل سے یار نے

خون کی یوں تو کمی ہو جائے گی یہ سوچ کر
جاتا ہوں بندوق سے پھر آج کوے مارنے

جواد حسن جواد

ایکٹنگ

ایک میں ہوں آپ کی ایکٹنگ کا دل سے معترف
ہر جگہ تعریف کرتا ہوں بلا خوف و خطر

ایک بیگم ہے جب اُس سے حالِ مجبوری کہو
جھٹ سے کہتی ہے کہ لا تنخواہ اداکاری نہ کر

جواد حسن جواد

اِس حمام میں

طمع کس کی ہے ہے خفتہ ہے اب تک
نظر کس کی ہے جو کانی نہیں ہے

کرپشن سب کی ظاہر ہو چکی ہے
یہ ٹوپی اب سلیمانی نہیں ہے

نوید ظفر کیانی

سرزنش

شریفوں کے نہیں ہوتے ہیں یہ پچھن
کہے دیتا ہوں تجھ سے گالیاں نہ دے

میں تیرے کان جڑ سے کھینچ ڈالوں گا
ابے اُلو کے پٹھے گالیاں نہ دے

نوید ظفر کیانی

فکرِ عافیت

گھر سے باہر خُوب پنگے کیجئے
گھر میں فکرِ عافیت ہی ٹھیک ہے

ذکر بیگم کا اگر مقصود ہے
ہجو میں تجریدیت ہی ٹھیک ہے

نوید ظفر کیانی

نسخہ

دِل کی تسکین بھی ہو جاتی ہے معدے کی طرح
چائے کے ساتھ اگر بات بنانا سیکھے

کامیابی اُسی بیوی کا مقدر ہو گی
خود کو جو ملکۂ جذبات بنانا سیکھے

نوید ظفر کیانی

چھٹی حِس

ظفر آج بیوی پہ ہونے لگا
میاں جی کے غصے کا مورال اَپ

ضرور آج دفتر میں موصوف نے
لڑائی ہے لیڈی سٹینو سے گپ

نوید ظفر کیانی

پی آر

ایک شاعر مجھ سے فرمانے لگے
شعر گوئی آپ پر جچتی نہیں

آپ کو شاعر کوئی کیسے کہے
آپ کی پبلک ریلیشن ہی نہیں

نوید ظفر کیانی

عامر راہداری

ایک تھا بادشاہ

سُنا ہے کسی ملک پر ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا. بادشاہ بہت رحمدل تھا (پرانے وقتوں میں بادشاہ یا تو رحمدل ہوتے تھے یا پھر ظالم، موجودہ بادشاہوں کی طرح دوغلے نہیں ہوتے تھے) وہ بادشاہ بھی اپنے سے پہلے کے بادشاہوں کی طرح ''موروثی مردانہ کمزوری'' کا شکار تھا اس لیے محل میں اولاد نام کی کسی چیز کا گزر نہیں ہوا تھا، بادشاہ اس چکر میں کوئی پندرہ عدد شادیاں اور بیس کے قریب لونڈیاں بھی برداشت کر رہا تھا۔ باقی سلطنت میں چین ہی چین تھا امن اتنا شدید تھا کہ دو افراد ایک ہی جگہ سے بغیر لڑے مرے پانی پی لیتے تھے۔ بادشاہ اتنی خوبصورت رعایا اور اتنے خوشگوار حالات کے باوجود اولاد نہ ہونے کے سبب اکثر پریشان رہتا تھا، اس پریشانی میں کئی وزیروں کو بھی اس راز میں شامل کر چکا تھا۔ ایک وزیر نے تو بادشاہ کی قربت کی خاطر یہ تک کہہ دیا کہ ''میں ٹرائی کروں''؟؟

لیکن چونکہ بادشاہ رحمدل تھا اس لیے اس نے اس وزیر کو کھلے دل سے معاف کر دیا۔

اولاد کی پریشانی میں بادشاہ سلامت لاکھوں اشرفیاں تو صرف پیروں فقیروں اور عامل بابوں کو بھی دے چکے تھے۔ جب پیروں اور عاملوں سے بھی کچھ نہ بن پایا تو تنگ آ کر چند وزیروں کو ''مشن وال چاکنگ'' پہ بھیج دیا۔ وزیر سارا دن ملک کی مختلف دیواروں پہ لکھے حکیموں کے پتے نوٹ کرتے اور شام کو وہ تمام حکیم بادشاہ کے دربار میں موجود ہوتے، بلکہ اکثر حکیموں نے تو ڈیرے بھی وہیں محل میں ڈال لیے تھے، بادشاہ پچھلے چند ماہ میں کئی اقسام کی پھکیاں پھانک چکا تھا۔ آخر ایک دن خدا کی رحمت کا نزول ہوا اور کسی حکیم کی پھکی کام دکھا گئی۔ بادشاہ نے یہ خبر سنتے ہی غریبوں میں مٹھائیاں تقسیم کیں اور پورے ملک میں جشن کا اہتمام کیا گیا، چند ماہ بعد بادشاہ کی گود ہری، میرا مطلب ہے ملکہ کی گود ہری بھری ہو گئی اور خدا نے ملکہ کو چاند جیسی بیٹی سے نوازا، (ٹپیکل بادشاہ ہوتا تو شاید ملکہ کے ساتھ حکیم کو بھی بیٹی پیدا کرنے کے جرم پر ملک بدر کر دیتا) بادشاہ اور ملکہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا ملک بھر میں اشرفیاں بانٹی گئیں۔ راوی اب مکمل چین ہی چین لکھنے لگا، وقت گزرتا رہا شہزادی بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی میں قدم رنجا فرما رہی تھیں۔ شہزادی بھی پرانے دور کی شہزادیوں کی طرح نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ اس پر بھی اسی طرح کئی جن اور دیو دل و جان سے عاشق تھے۔ آخر وہی ہوا جس کا بادشاہ کو ڈر تھا ایک دن

شہزادی اپنے کمرے میں نہیں تھی بادشاہ اور ملکہ کی تو جان نکل گئی۔ پانچ منٹ کے اندر پورے ملک کے اندر ہائی الرٹ ہوگیا۔ دربار عالیہ میں کہرام بپا ہوا تھا، محافظ جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف سرگرم ہوگئے وزیر وہی کام کرنے لگے جو ہمارے آج کل کے وزیر کرتے ہیں یعنی بادشاہ کو مشورے دینا، شہزادی کو کمرے سے غائب ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے کچھ اتا پتا نہیں چل پا رہا تھا بادشاہ کو کوئی اور حل نہ سوجھا تو اس نے قصبوں، شہروں اور دیہاتوں میں اعلانات کروادیے کہ جو شہزادی کو ڈھونڈ لائے گا شہزادی کی شادی اسی سے کی جائے گی۔ کئی نوجوان رسیاں کسیاں سنبھالے شہزادے بننے نکل پڑے، اُنہی میں ایک شہزادہ بخت نگر بھی تھا جو قریبی ریاست کے شہنشاہ کا بیٹا تھا اور اپنی بوریت دور کرنے بادشاہ کے ہاں سرکاری دورے پر آیا ہوا تھا سو اس نے بھی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ بخت نگر بہت ذہین شہزادہ تھا اس نے باقی جوشیلے نوجوانوں کی طرح نہ تو گھوڑا تیار کیا اور نہ ہی تیر کمان وغیرہ، اور سوچنے لگا کہ یہ کون سے جن کی شرارت ہوسکتی ہے اور شہزادی کو کیسے واپس لایا جاسکتا ہے۔ تمام نوجوان جنگلوں جنگلوں گھوم رہے تھے اور شہزادہ بخت نگر گہری سوچ میں مصروف تھا۔ وزیر حیرت سے شہزادے بخت نگر کو دیکھے جا رہے تھے کہ کیسا امیدوار ہے جو شہزادی کو ڈھونڈنے کی بجائے بس سوچے جا رہا ہے۔ شہزادی کو غائب ہوئے ایک گھنٹہ ہوگیا تھا جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا بادشاہ کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ کئی عامل پیر منتروں میں مصروف ہو چکے تھے۔ بادشاہ کو کہیں بھی چین نہیں نصیب ہو پا رہا تھا، شہزادہ بخت کسی گہری سوچ میں غرق ہو چکا تھا اچانک وزیروں اور بادشاہ نے شہزادے کو مسکراتے اور اپنی جانب آتے دیکھا

''ظلِ الٰہی جان کی امان پاوں تو ایک عرض کروں؟؟'' شہزادے نے نہایت شائستگی سے جھکتے ہوئے کہا۔

''بولو شہزادے ہم کسی کی جان نہیں لیتے تم ہماری رحمدلی سے واقف ہو'' بادشاہ سلامت نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

''کیا مجھے محل میں جانے کی اجازت ہے؟؟'' شہزادے نے التجائیہ لہجے میں درخواست کی۔

''محل کا گیٹ شہزادے کے لیے کھولا جائے'' بادشاہ نے وزیر کو حکمنامہ جاری کیا۔

شہزادہ اکیلا اندر کی جانب بڑھ گیا بادشاہ و وزیر شہزادے کی اس عجیب سی حرکت سے حیران پریشان تھے. اچانک محل سے شور بلند ہوا،

''شہزادی مل گئی''

''رانی مل گئی''

بادشاہ نے اندر دوڑ لگادی وزیر بھی بادشاہ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ بادشاہ سیدھا شہزادی کے کمرے میں داخل ہوا اندر شہزادے بخت نگر اور شہزادی کو ایک ساتھ دیکھ کر اس کی جان میں جان میں آئی اور اس نے بڑھ کر شہزادی کو سینے سے لگالیا، ملکہ عالیہ بھی اتنی دیر میں کمرے میں پہنچ گئی تھیں۔

''رانی بٹیا آپ کہاں تھیں کس دیو نے آپ کو اغوا کیا تھا؟؟'' بادشاہ سلامت نے شہزادی کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اغواء؟؟'' شہزادی نے استعجاب سے اُن کی بات دھرائی۔

''ہاں رانی بٹیا کون تھا وہ نامعقول جن جس نے سلطنت میں کھلبلی مچادی'' ملکہ نے بےچینی سے دریافت کیا۔

''ابا حضور یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں مجھے تو کسی نے اغوا نہیں کیا تھا!'' شہزادی نے جواباً حیرت کا اظہار کیا۔

''تو بیٹا آپ کہاں تھیں پچھلے دو گھنٹوں سے؟؟'' بادشاہ نے پوچھا۔

''ابا حضور ہم تو واش روم میں سلیفیاں بنا رہے تھے اچھی نہیں بن رہی تھی اس لیے وقت ذرا زیادہ لگ گیا تھا۔'' شہزادی نے معصومیت سے کہا۔

بادشاہ کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ شہزادے نے مسکرا کر بادشاہ کی جانب دیکھا، بادشاہ بھی ہلکے سے مسکرا دیا اور شہزادی کی شادی فوراً اُس ذہین شہزادے بخت نگر سے کرنے کا اعلان کر دیا اور یوں سب حسبِ معمول ہنسی خوشی رہنے لگے۔

آل اِن ون

غلطی کوئی بھی کرتا ہے، بھگوان معاف کر دیتا ہے،معاف تو انسان بھی کر دیتا ہے،لیکن غلطی کبھی معاف نہیں کرتی، بڑے بابو۔۔۔!'' راکیش نے آفس سے باہر نکلتے وقت بڑے بابو کو سمجھایا۔

''پر میں کیا غلطی کر رہا ہوں راکیش۔۔۔؟'' بڑے بابو نے راکیش سے پوچھا۔

''شادی نہ کر کے بہت بڑی غلطی کر رہے ہو بڑے بابو۔''

راکیش کہہ کر اپنے راستے مُڑ گیا اور بڑے بابو سوچتے ہوئے اپنے گھر آ گئے۔

بڑے بابو پہاڑ پر جمی برف کی مانند ٹھنڈے تھے، بالکل یخ،اور میٹھے بھی،کبھی کبھی لوگوں کے طنز،سورج کی گرم شعاعوں کی مانند چبھتے بھی اُن کو۔وہ حالات کے تحت تھوڑا بہت اگر پگھل بھی جاتے ، مگر رہتے پھر بھی میٹھے پانی کی مانند۔اونچائی سے گرتے، پتھروں سے ٹکراتے،دھول سے گزرتے، پر رہتے میٹھے کے میٹھے اور ٹھنڈے بھی۔لوگوں کی باتیں ہواؤں کی مانند اُن سے ٹکرا کر گزر جاتیں،اُن کو لگتا بھی کہ کوئی اندر سے گزر گیا ہے اُن کے لیکن وہ جمے رہتے اپنی جگہ۔اُن کے دل میں تھوڑی بہت گندگی آ بھی جاتی، پر پل دو پل کے لیے۔

ماں باپ کے اکیلے تھے بڑے بابو۔پہاڑوں کی آگ سینے میں دبائے چپ چاپ زندگی گزار رہے تھے،بنا والدین کے۔اُن کے گھر میں ایک کتا،ایک توتا،اور دو چار مرغیاں مرغے تھے۔

صبح ہوئی، فراغت کے بعد کھانا بنایا، خود کھایا، جانوروں کو کھلایا، تالا لگایا اور نکل گئے آفس کے لیے۔آفس سے چھوٹے، ہوٹل سے کھانا لیا، گھر آئے، کھایا کھلایا اور سو رہے۔بس یہی تھا معمول اُن کی زندگی کا۔

اتوار کی تعطیل میں دو کام اہم تھے اُن کے۔بازار سے سامان لانا اور مکان کی صفائی۔دیگر تعطیلات میں دوستوں کے یہاں بھی نکل جاتے تھے کبھی کبھار، پر اپنے یہاں آنے کا موقع کم ہی دیتے تھے دوسروں کو۔

ایک دیوالی اُن کے یہاں جانے کا اتفاق ہوا میرا۔اُن کے دیے وقت کے مطابق پہنچ کر جب گھنٹی بجائی تو اُن کا حلیہ دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آئی۔اُن کے ایک ہاتھ میں کف گیر اور دوسرا بیسن میں لتھڑا تھا، ماتھے پر پسینے کی بوندوں کے ساتھ ہلدی کے داغ تھے۔تہبند اور بنیائن پر بھی بیسن نے دست خط کر رکھے تھے اچھی طرح، جہاں تہاں۔

''بڑے بابو۔۔۔! یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے آپ نے؟''

مَیں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

''اماں کیا بتاؤں یار! پکوڑے بنا رہا تھا۔ مرغا پاس کھڑا تھا۔ بلّی آ دھمکی کہیں سے۔ مرغا ہلدی مرچیں اُڑاتا ہوا نکل گیا، آنکھوں میں مرچیں بھر گئیں، بہت دھویا، دیکھو۔۔۔! اَب بھی آنکھیں سُرخ ہیں نا؟''

''ہاں، ہیں۔'' میں کہتا ہوا اندر چلا گیا۔ اُن کے ساتھ کھانا بنوایا، کھایا پیا، چلا آیا۔

''یہ مرغ مسلم کیسے بنایا جاتا ہے راکیش بابو؟'' ایک روز آفس میں بڑے بابو نے راکیش کو فائل دیتے ہوئے دریافت کیا۔

''ایک ساتھ دو غلطیاں کر رہے ہو بڑے بابو!'' راکیش نے ان کی جانب عجب انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''غلطیاں؟ کون سی غلطیاں؟؟''

''ایک تو فرید کی فائل مجھ کو دے رہے ہو اور دوسرے مرغ مسلم بنانے کا طریقہ کسی خان ساماں کے بجائے مجھ سے پوچھ رہے ہو۔'' راکیش نے جواب دیا، اور بڑے بابو شرمندہ ہو کر فرید کی جانب مڑ گئے۔

''بڑے بابو! میری مانو تو ایک کام کرو!!'' فرید نے فائل لیتے ہوئے بڑے بابو سے کہا۔

''وہ کیا؟'' بڑے بابو نے پوچھا۔

''شادی کر لو!'' فرید نے مشورہ دیا۔

''اجی کیا ضرورت ہے شادی کی۔۔۔؟'' بڑے بابو بے ساختہ سب کی جانب نظر ڈالتے ہوئے بھڑک گئے۔

''ضرورت تو ہے شادی کی۔ بیوی ہوتی تو مرغ مسلم کے بارے میں دریافت نہ کرتے۔''

''وہ تو ٹی۔وی۔ پر دیکھ لوں گا۔''

''ٹی۔وی۔ پر دیکھ لینے سے مرغ مسلم نہیں بن جاتا بڑے بابو، بنانا پڑتا ہے۔'' فرید نے سمجھایا۔

''سنا ہے کھانا بنانے کی مشین آ گئی ہے مارکٹ میں۔ اُس میں جس وقت کا جو بھی چاہو فیڈ کر دو۔ وقت پر گرما گرم کھانا تیار

> **زبید** بھائی بتا رہے تھے کہ سیاستدانوں نے تو اِن دِنوں میں ایک دوسرے کے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے، پتہ نہیں کیوں، ہمیں یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔
>
> اعظم نصر

ملے گا۔'' بڑے بابو فائل دے کر اپنی سیٹ پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئے۔

''کھانا بنانے کے علاوہ اور بھی بہت سے کام ہیں گھر میں بڑے بابو!'' فرید نے سمجھایا۔

''ہاں ہیں، لیکن اَب سارے کام مشینوں سے ہو جاتے ہیں فرید!'' بڑے بابو نے ٹال دیا

''کیا کیا کام کرواؤ گے مشینوں سے بڑے بابو۔۔۔؟'' فرید نے انگلیاں نچاتے ہوئے ان کا پیچھا کیا۔

''پہلا کام وقت پر سو کر اُٹھنا، جس وقت کا بھی الارم لگا دو، اُسی وقت اُٹھائے گی مشین، ایک منٹ اِدھر نہ اُدھر۔ اسی طرح اور بھی مشینیں ہیں جیسے پانی گرم کرنے کی مشین، مسالا پیسنے کی مشین، کپڑے دھونے کی مشین، لگتا ہے ٹی۔وی۔ پر اِسکائی شاپ نہیں دیکھتے آپ؟'' بڑے بابو نے جیسے بازی مار لی۔

''دیکھتا ہوں جناب، لیکن یہ تو بتاؤ! کیا بچّے بنانے کی مشین بھی بنائی ہے اِسکائی شاپ نے؟'' فرید نے پھر اُنگلیاں نچاتے ہوئے نیا پتّا پھینکا۔

''نہیں بنائی ہے تو بنالی جائے گی ایک نہ ایک دن۔ ایک سے ایک سائنس داں پڑے ہیں دنیا میں۔''

''تو انتظار کرو بڑے بابو!''

''وہ تو کروں گا ہی۔'' بڑے بابو نے فائل کر دیا۔

☆☆☆

''اَبے فرید....!'' ایک روز بڑے بابو نے دفتر میں آتے ہی بہ آوازِ بلند فرید کو مخاطب کیا۔

''کہیے بڑے بابو!''

''اَب ایجاد ہو گئی ہے وہ مشین۔''

''مشین! کون سی مشین؟''

میرے کاروباری حالات کو دیکھتے ہوئے میرا درزی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ صاب۔۔۔شرٹ میں پاکٹ کی ضرورت ہے یا رہنے دوں؟

اعظم نصر

''وہی نا۔۔۔! بچے بنانے والی، اَب ٹیسٹ ٹیوب میں تیار ہونے لگے ہیں بچے۔ پڑھا نہیں اخبار میں؟''

''پڑھا تو ہے! پر یہ تو بتاؤ۔۔۔! لا کب رہے ہو، وہ مشین؟'' فرید نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اَبے فرید! تو جانتا نہیں، آج کے دور میں اتنی زیادہ مشینیں خریدنا ہے کب میرے بس کا؟ مَیں تو صرف ایک کلرک ٹھہرا، وہ بھی بوڑھا۔'' بڑے بابو نے اپنے بڑھاپے کا رونا روتے ہوئے افسردگی ظاہر کی۔

''پھر کرو گے کیا؟''

''سوچتا ہوں جب یہ ساری مشینیں ایک ساتھ ایک ہی مشین میں آجائیں گی یعنی کہ آل اِن وَن، تب ہی خرید سکوں گا مَیں تو۔''

''نہ دادا مریں گے اور نہ بٹیں گی بدھیاں۔''

'' بٹیں گی بدھیاں ،ضرور بٹیں گی ۔تم دیکھ لینا۔دادا کو تو مرنا ہی پڑے گا، ایک نہ ایک دِن۔'' بڑے بابو کی آنکھوں میں امید کی چمک صاف دکھائی دے رہی تھی۔

''مجھے لگتا ہے، دادا سے پہلے تم ہی چلے جاؤ گے، آل اِن وَن کے ارمان میں۔'' فرید نے لاپروائی سے کہتے ہوئے قصہ تمام کر دیا۔

''لگتا تو یہی ہے فرید!'' بڑے بابو افسردہ ہو گئے۔

☆☆☆

''دادا مر گئے۔'' بڑے بابو دفتر آکر اُچھل پڑے خوشی سے۔ لوگ سمجھے کہ دادا واقعی چلے گئے اُن کے۔

''دادا مر گئے؟'' راکیش نے اُن کو خوش دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''ہاں دادا مر گئے، اَب بدھیاں بٹیں گی، یعنی کہ آل اِن وَن، آگئی مارکٹ میں۔'' بڑے بابو خوشی سے جھوم کر بولے۔

''تو لے آؤ نا!''

''جا تو رہا ہوں لینے اتوار کو نوئیڈا۔تم سب بھی چلو نا مرے ساتھ....!'' بڑے بابو نے التجا کی۔

☆☆☆

سوموار کو بڑے بابو آفس آئے تو حلیہ ہی بدلا ہوا تھا اُن کا۔بال کالے، کریم کلر کا سوٹ، کالا بوٹ، بوٹ کی بل بائی، سوٹ پر سرخ ٹائی، چھوٹی مہری کی پینٹ، اُس پر سیکسو سینٹ، نیا رومال، مستانی چال۔آتے ہی نمستے مارا، کسی کی سمجھ میں نہ آیا ماجرا سارا۔

''کیا آل اِن وَن، لے آئے بڑے بابو!'' مَیں نے دریافت کیا۔

''رات ہی تو لایا ہوں، تم دیکھ نہیں رہے ہو مجھ کو، آج۔''

''وہ کیا؟''

''یہ پریس لگا خوش بودار ٹن ٹاٹا سوٹ، چمچماتا بوٹ، لال رومال، کالے بال، ٹناٹن حال، مستانی چال، اُسی مشین کی تو دین ہے نا؟'' بڑے بابو نے آنکھیں مٹکائیں۔

''ہاں؟'' مَیں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! فٹافٹ کام کرتی ہے، میری آل اِن وَن۔۔۔''

''تو کب دکھاؤ گے اپنی آل اِن وَن؟'' راکیش نے پوچھا۔

''آج ہی آجاؤ شام کو!'' بڑے بابو نے کہا، ہم سب نے ہامی بھر لی اور بڑے بابو ہاف ٹائم کی چھٹی لے کر نکل گئے آفس سے۔ہم لوگوں نے اُن کے دِیے ہوئے وقت کے مطابق پہنچ کر مکان کی گھنٹی بجادی، اور بڑے بابو نے ہم سب کو اندر بلا لیا۔

''کہاں ہے آپ کی آل اِن وَن؟'' مَیں نے بڑے بابو سے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے دریافت کیا۔

''وہ دیکھو! آپ لوگوں کے لیے کھانا تیار کر رہی ہے، میری آل اِن وَن۔'' بڑے بابو نے اُس جانب اشارہ کیا، جہاں سرخ کپڑوں میں لپٹی ایک دوشیزہ کھانا بنانے میں مصروف تھی۔

ابنِ منیب

حرامخور

حرامخور شہر میں داخل ہو چکا تھا۔
کب اور کیسے ہُوا، اِس بارے میں اتفاق نہیں تھا۔

اتفاق اِس بارے میں بھی نہیں تھا کہ اُس کی اصل شکل و ہیئت کیا ہے۔

کہ وہ شہر میں داخل ہو چکا تھا اِس کی پہلی واضح خبر تب ملی جب بخار کی دوا پینے والے بہت سے بچے جاں بحق ہو گئے اور تفتیشی ٹیم نے بتایا کہ حرامخور نے دوا میں ملاوٹ کر دی تھی۔

اس کے بعد کے پے در پے واقعات نے لوگوں کو حرامخور کی موجودگی کا مکمل یقین دلا دیا۔

چند ہی روز میں شہر کا نیا پُل زمین پر آ گرا۔ کسی نے کہا کہ حرامخور نے سیمنٹ میں ملاوٹ کر دی، اور کسی نے کہا کہ اُس نے پُل سے سریا چوری کر لیا۔ دونوں صورتوں میں سب کو یقین تھا کہ یہ کام حرامخور کا ہی ہے۔

تیسرا بڑا واقعہ تب پیش آیا جب طوفانی بارشوں نے قریبی علاقوں میں گندم کی کھڑی فصلیں تباہ کر دیں۔ حرامخور نے راتوں رات فلور ملوں اور دکانوں سے آٹے کی زیادہ تر بوریاں غائب کر دیں۔ جو چند بچیں وہ لوگوں کو بڑی مشکل سے دگنی تگنی قیمت پر ہاتھ آئیں۔

اِس کے بعد تو ہر طرف کہرام مچ گیا۔ حرامخور شہر کے چپے چپے میں اپنے آسیبی وجود کے ساتھ سرایت کر گیا۔ تھانوں میں مجرموں کی جگہ معصوموں کے نام ظاہر ہونے لگے اور بڑے بڑے سرکاری دفاتر، ہسپتالوں اور سکولوں میں افسروں ڈاکٹروں اور اساتذہ کو حرامخور نے کام سے روک دیا۔

لوگ تنگ آ کر شہر کی جامع مسجد کی جانب دوڑے اور بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ایک انتہائی ضعیف بزرگ بمشکل اٹھے اور اٹھ کر محراب کی دائیں جانب ٹنگی آیت کی طرف اشارہ کیا:

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ

اشارہ دیکھ کر جن کو بات پہلے سمجھ آئی وہ پہلے اور جن کو بعد میں سمجھ آئی وہ بعد میں باہر کی جانب دوڑے اور آیت کے بیسیوں چھوٹے بڑے تعویذ بنوا کر اپنے گھروں دکانوں اور بچوں کے گلوں میں لٹکا دیے۔ کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ بزرگ کا اشارہ آیت کے پیغام کی طرف تھا۔

راشد اشرف

خودکش

ویگن کے اڈے پر وہ خاموش ایک طرف بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں ایک تھیلا اور اس میں کھانے کا کچھ خشک سامان۔ سرخ وسفید رنگت، چہرے پر تازہ تازہ اگتے بال اور جسم پر ایک سادہ سا قمیض شلوار۔ قمیض کی اندرونی جیب میں ایک پرانا سا موبائل فون جو اسے خصوصی طور پر استاد صاحب نے چلتے وقت دیا تھا۔ اسے سنبھال کر رکھنا اور کسی کو مت بتانا کہ تمہارے پاس ایسی کوئی چیز ہے۔۔ وہاں تربیتی کیمپ میں اسے سب استاد صاحب کہتے تھے، وہ بھی جو اس سے عمر میں بڑے تھے۔ چہرے مہرے سے وہ ایک جہاندیدہ شخص دکھائی دیتا تھا، پچاس کے پیٹے میں بھی اصل عمر سے کم ہی لگتا تھا۔۔۔ اس کی بھی ایک کہانی تھی۔۔ وہاں ہر شخص کی ایک نہ ایک دلدوز کہانی تھی لیکن اب وہ تمام کے تمام یہ کہانیاں اپنے سینے میں ہی چھپا کر رکھنے پر مجبور تھے کہ وہاں انہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔۔ کب نجانے کس کی باری آجائے اور اسے روانہ ہونا پڑے اور وہ اپنے ساتھیوں کو بروز قیامت ملنے کا وعدہ کر کے چلتا بنے۔۔ ایک بڑے سے کمرے میں کسی مقامی فنکار کو بلوا کر خصوصی طور پر چند تصاویر بنوائی گئیں تھیں۔ سبزے سے بھرپور باغات، ہر طرف ہریالی ہی ہریالی، درمیان میں کہیں دودھ کی نہر بہتی دکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اسے ذہن میں بٹھا لو، یہی تمہارا آخری گھر ہے جہاں تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔ استاد صاحب نے ایک روز اسے کئی دوسرے نوجوانوں کے ہمراہ آگاہ کیا تھا اور اس کی نظر آخر تک انہی باغات پر جمی رہی تھی جبکہ دوسرے کب کے وہاں سے منتشر ہو چکے تھے۔ ہریالی اسے بہت پسند تھی، وہ اس پر جان چھڑکتا تھا۔ اگر یہاں رہنا ہے تو میں تو بہت خوش قسمت ہوں۔ اس نے خود سے کہا تھا۔

استاد صاحب اسے حتمی روانگی سے قبل امیر المومنین کے پاس لے آئے تھے جو ایک تخت پر بیٹھے تسبیح پھر رہے تھے۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔" جاؤ بیٹا، اللہ کے حوالے۔ اور ایک لمحے کو اس کا دل بھر آیا، وہ امیر المومنین کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا تھا اور ان کی کہی ایک ایک بات پر اسے اندھا اعتقاد تھا۔ استاد صاحب تو پھر اکثر تربیت کے دوران سخت لہجہ اختیار کر لیتے تھے لیکن امیر صاحب۔۔ کیا معلوم وہ بھی وہیں مل جائیں جہاں میں نے ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

ویگن کے ہارن کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ اپنا

ایک دوست نے بتایا کہ وہ کسی سواری کے انتظار میں اپنے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ اُنہوں نے ایک ٹیکسی رکوائی۔ اُس وقت وہ بہت جلدی میں تھے لیکن جب ٹیکسی اُن کے آگے آکر رُکی تو وہ اُس میں نہیں بیٹھے۔ اُس کے پیچھے لکھا ہوا تھا ''کیا آپ نے اللہ سے ملاقات کی تیاری کرلی ہے؟''

بعض گاڑیوں کے پیغام بہت معنی خیز ہوتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ہم سکوٹر چلاتے تھے۔ ہمیں ایک روز ٹرک نے سائڈ سے ہلکی سی ٹکر ماری۔ ہم نے سڑک پر گرتے ہی آگے نکل جانے والے ٹرک پر ایک قہر آلود نظر ڈالی۔ لکھا تھا ''اچھا دوست پھر ملیں گے۔'' یعنی آج کے لئے اِتنا ہی کافی ہے کہ صرف تمھارے کپڑے خراب ہوئے اور معمولی خراشیں آئیں، بقیہ ''مرمت'' اگلی ملاقات پر!

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

تھیلا سنبھالتا ہوا اٹھ گیا۔ سامنے ایک پولیس والا مونچھوں پر تاؤ دے رہا تھا لیکن اسے دیکھ کر وہ پرسکون ہی رہا۔ اس کے سامنے سے گزرتے وقت اس کے ذہن میں روکے جانے کی صورت میں ممکنہ جوابات گھوم گئے جنہیں استاد صاحب نے اسے اچھی طرح ذہن نشین کروادیا تھا۔ حکومت نے ایک بار خودکش حملہ آور کی پہچان کی نشانیاں بتا کر الٹا انہیں مزید چوکنا کردیا تھا۔ اب وہ اپنا چہرہ اور جسم کی سکنات کو پرسکون رکھتے ہیں، پھٹنے سے قبل منہ ہی منہ میں کسی قسم کا کوئی ورد نہیں کررہے ہوتے، کپڑے بھی عام انداز کے پہنتے ہیں اور رات کو اطمنان سے سونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں سرخ بھی نہیں ہوتیں۔

ویگن نے اسے شہر کے ایک مضافاتی علاقے میں اتار دیا تھا جہاں سے وہ ایک جانب پیدل چل پڑا۔ بیس منٹ کی مسافت کے بعد ایک تنگ سی گلی میں اس نے ایک دروازے پر دستک دی، دروازہ کھولنے والا ایک باریش شخص تھا۔ شناختی جملوں کے تبادلے کے بعد اسے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا۔ ایک چھوٹے سے صحن سے گزار کر وہ ایک مختصر سے کمرے میں داخل ہوئے۔ تم بالکل محفوظ ہو یہاں۔ باریش شخص نے اسے اطمینان دلایا۔ کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

وہ سامنے غسل خانہ ہے، یہ نیند کی گولی ضرور کھالینا، رات کو آرام سے سونا، کوئی چیز چاہیے ہو تو مجھے آواز دے دینا لیکن کمرے سے باہر مت نکلنا، صبح جلدی اٹھنا ہے۔ باریش شخص نے اسے تنبیہ کی۔ اس کے منہ میں بڑا سا نوالہ تھا اس لیے وہ محض سر ہلا کر رہ گیا۔ کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر وہ چلا گیا تھا اور خودکش حملہ آور چارپائی پر نیم دراز ہوگیا۔

باہر گلی میں کوئی بانسری بجاتا گزرا تھا۔۔۔ کچھ ہی دیر میں وہ کچھ پرانی تلخ یادوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔ ماں، باپ، بہن بھائی، سبھی تو تھے۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ لیکن ایک دھماکے نے یک دم اس کی دنیا اجاڑ دی تھی۔ دھماکے قبل کسی طیارے کی پرواز کی جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ لوگ ایسی آوازوں کے اب عادی ہوگئے تھے اور ایسے موقعوں پر گھر کے اندر ہی رہنے کو ترجیح دینے لگے تھے۔ لیکن اس بار کمپیوٹر کے سافٹ ویئر میں کوئی غلطی ہوگئی تھی یا پھر زمینی حدف پر الیکٹرونک چپ رکھنے والے ایجنٹ سے کوئی چوک۔۔۔ لیکن اس کا نتیجہ اس کے گھر والوں کی اچانک اور دلدوز موت کی شکل میں نکلا تھا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھا، قریب واقع درختوں کے نیچے بانسری ہی تو بجا رہا تھا۔

گھنے درختوں کے سائے تلے بیٹھ کر بانسری بجانا اس کی زندگی کی سب سے بڑی عیاشی تھی۔ اس کی پسندیدہ ہریالی اور اس ماحول میں بیٹھ کر نئے نئے شوق کی مشق۔۔۔ اس شوق پر کئی بار وہ اپنے باپ سے پٹ چکا تھا، ایسے موقعوں پر اس کی بہن اس کی مدد کو آتی تھی: بابا! بجانے دو نا اگر اسے اچھا لگتا ہے۔۔۔ جواب میں اسے کافی دیر تک باپ کی صلواتیں سنی پڑتی تھیں۔ دھماکے کی آواز اس قدر شدید تھی کہ بانسری اس کے منہ سے نکل کر دور جا پڑی اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ منہ میں بھر جانے والی مٹی نکالتا ہوا دیوانہ وار گھر کی جانب دوڑ پڑا تھا لیکن اس وقت تک سب کچھ ختم ہوچکا تھا۔ تربیتی کیمپ میں وہ کسی کے توسط سے پہنچا تھا جہاں اس جیسے اور

بھی کئی نوجوان تھے ۔سب کی کہانی ایک دوسرے سے ملتی جلتی تھی۔سونے سے پہلے وہ نیند کی گولی کھانا نہیں بھولا تھا۔

علی الصبح اسے نماز کے لیے اٹھایا گیا۔باریش شخص نے اسے ناشتے کے لیے پوچھا:کوئی خاص چیز کھانے کا دل کر رہا ہو تو بتاؤ! ہم سب سے پوچھتے ہیں۔اور جواب میں اس نے گھی لگی روٹی اور قہوے کی فرمائش کی تھی، باریش شخص مسکرا کر چلا گیا اور کچھ ہی دیر میں ناشتے کے ہمراہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوا۔

ناشتے کے بعد چاہو تو کچھ دیر آرام کرلو، پھر نہا کر تیار رہنا، میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ آؤں گا۔۔وہ یہ ہدایات دے کر چلا گیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد باریش شخص اس کے جسم پر بارود سے بھری جرسی باندھ رہا تھا۔چھوٹے چھوٹے خانوں میں بارود بھرا تھا اور وہ بڑی مہارت سے اس کے جسم پر اسے نصب کر رہا تھا۔درمیان میں وہ اسے آہستہ سے ہدایات بھی دے رہا تھا: ہلنا مت، اب گھوم جاؤ، داہنا ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔اور وہ خاموشی سے اس کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔یوں بھی اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، تربیتی کیمپ میں اپنے سامنے وہ ایسا ہوتے کئی بار دیکھ چکا تھا۔شروع شروع میں تو ایک بار چھپ کر یہ سب دیکھتے وقت استاد صاحب نے اسے ڈانٹ بھی دیا تھا لیکن وہاں سے گزرتے ہوئے امیر المومنین نے مشفقانہ لہجے میں انہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔مت روکو اسے، ایک دن تو اسے بھی یہ کرنا ہے۔

اب تم بالکل تیار ہو۔۔باریش شخص نے اس پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہا: تمہیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا، بس اس جگہ پہنچ کر لوگوں میں گھل مل جانا، اور ان کے عین درمیان پہنچ کر ہاتھ اٹھا کر زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگانا، اس کے بعد چند ہی لمحوں میں تمہیں شہادت نصیب ہو جائے گی اور تم اپنی اس پسندیدہ جگہ پہنچ جاؤ گے جہاں تمہیں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

جرسی بڑی مہارت سے نصب کی جا چکی تھی، باریش شخص اپنے کام میں ماہر تھا۔ایک موقع پر اس نے اسے فخر سے بتایا کہ اس کی تربیت امیر المومنین کے ہاتھوں ہوئی ہے۔۔کام مکمل

لاتوں کے بھوت

موٹر سائیکل چلانے سے پہلے اگر موٹر سائیکل اسٹینڈ اُٹھانا بھول جائیں تو کوئی بڑا حادثہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ پہلا سبق تھا جو موٹر سائیکل چلانا سیکھتے ہوئے ملا۔ ۲۰ سال ہوگئے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے آج تک موٹر سائیکل اسٹینڈ کی وجہ سے کوئی حادثہ نہیں ہوا اور نہ ہی ایسا کبھی سُنا۔ وجہ؟ آپ اسٹینڈ اُٹھائے بغیر موٹر سائیکل چلا کر دیکھ لیں، دوسرے ہی لمحے آواز آئے گی ''سٹینڈ چیک لو۔'' اگر آپ دس منٹ تک اسٹینڈ اُٹھائے بغیر موٹر سائیکل چلائیں تو کم از کم ایسی بیس آوازیں تو ضرور سُنیں گے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ زندگی کے اور معاملات بھی تو ہیں جو قومی اور معاشرتی حادثات کا سبب ہیں۔ ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، رشوت خوری وغیرہ مگر زیادہ تر معاملات میں ہمارا رویہ یہی ہوتا ہے ''سانوں کی''۔ ہم اِن معاملات کو موٹر سائیکل اسٹینڈ کی طرح کیوں نہیں لیتے۔ میں نہیں کہتا کہ اس طرح روکنے ٹوکنے سے یہ جرائم ختم ہو جائیں گے مگر اِن میں کچھ کمی تو ہو ہی سکتی ہے۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے مگر آپ کوشش تو کر کے دیکھیں۔ لاتوں کے بھوت ہوتے ہی کتنے ہیں۔

اعظم نصر

کر کے اس نے اسے کھڑے ہونے کو کہا تھا اور چاروں طرف سے مکمل جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلایا۔"وزن زیادہ تو نہیں"؟

''ٹھیک ہے۔۔۔'' اس نے آہستگی سے کہا۔۔۔حالانکہ وزن زیادہ تو تھا ہی۔وہ بے چینی محسوس کر رہا تھا اور سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔اس نے اس سے قبل کسی جرسی والے کو اس طرح بے چین نہیں دیکھا تھا جیسی بے چینی وہ اس وقت محسوس کر رہا تھا لیکن اس کا اظہار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

''زیادہ ہلنا جلنا مت، لیٹنا بالکل نہیں، ایک جگہ بیٹھے رہو، کچھ ہی دیر میں ہمیں روانہ ہونا ہے''۔۔۔باریش شخص یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ایک گھنٹے بعد اس

نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آواز لگائی: چلو، اٹھو، احتیاط سے۔ اور وہ باریش شخص کی ہمراہی میں گھر کے صحن سے گزرتا، وہاں بکھری مختلف چیزوں پر نظر ڈالتا باہر نکل آیا۔ گھر کے باہر ایک ویگن کھڑی تھی۔ یہ ایک عام سی گاڑی تھی جو عموماً اسکول کے بچوں کو لانے اور لے جانے کے کام آتی ہے۔ باریش شخص نے اسے آہستہ سے فی امان اللہ کہا۔ منزل پر وہ اس کے ساتھ نہیں جائے گا، یہ بات وہ اسے گھر سے نکلنے سے قبل ہی بتا چکا تھا۔ ڈرائیور کی کرسی پر بیٹھے شخص نے اسے گاڑی کی عقبی جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ چپ چاپ ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی اپنی منزل کی طرف چل پڑی تھی اور وہ راستے میں بکھرے منظر کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ علی الصبح اسکول جاتے ہوئے چھوٹے بچے، سڑکوں کی صفائی کرتے خاکروب، پٹرول پمپ پر گاڑیوں کی قطار۔۔۔۔ پھر اچانک اس کی نظر پھولوں کے ایک جھنڈ پر پڑی جسے بڑی مہارت سے سنوارا گیا تھا، اس کے دل میں خوشی در آئی۔۔ یہ اس کا پسندیدہ منظر تھا۔ ڈرائیور بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ بلا آخر وہ ایک ایسی جگہ رک گئے جہاں سے کچھ فاصلے پر پولیس کی وردیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ مال روڈ پر ہونے والا ایک مظاہرہ تھا، ہر طرف کالے کوٹوں کی بھرمار تھی اور ان کو ڈنڈوں کے زور پر روکتے ہوئے پولیس والے۔ ڈرائیور نے اسے اترنے کا اشارہ کیا اور وہ آہستگی سے اتر کر پولیس والوں کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ کچھ ہی ساعت میں وہ نعروں کی آوازیں بلند کرتے مظاہرین کو روکتے پولیس والوں کے درمیان پہنچ چکا تھا، ایک پولیس والے نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، اس نے اپنا دوسرا ہاتھ فضا میں بلند کر کے اللہ اکبر کا زوردار نعرہ لگایا اور ایک کان پھاڑ دینے والے خوفناک دھماکے نے فضا کو دہلا دیا۔ دھوئیں کے بادلوں سے فضا سیاہ ہو رہی تھی، کئی پولیس والوں کے چیتھڑے اڑ چکے تھے اور ان کے اعضاء دور دور تک بکھر چکے تھے۔

اگلے ہی لمحے اس نے خود کو ہوا میں اڑتے پایا، وہ تیزی سے ایک جانب اڑتا جا رہا تھا، اس کا بدن ہوا کی طرح ہلکا ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد مناظر تیزی سے بدلتے جا رہے تھے۔ جلد ہی وہ ایک جگہ ایسی جگہ جا کر رک گیا جہاں ہر طرف ملگجا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس دھند لکے میں اس نے دیکھا کہ اس کے چاروں جانب جلے ہوئے پتھروں کا ڈھیر ہے، ایک عجیب سی بو اسے پریشان کر رہی تھی۔ ماحول سوگوار تھا۔ اس کی پسندیدہ ہریالی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ اچانک سامنے سے کوئی اس کی جانب آتا دکھائی دیا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟۔ جواب میں اس شخص نے جو کہا، اسے سن کر اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اس کا ذہن اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔۔۔۔

اس سے اگلی رات وہ استاد صاحب کے خواب میں آیا، وہ ہاتھ باندھے استاد صاحب کے سامنے کھڑا تھا اور گڑگڑاتی ہوئی آواز میں استدعا کر رہا تھا: حضرت! براہ کرم امیر المومنین تک یہ درخواست پہنچا دیں کہ خودکش جرسی میں بارود ذرا کم ڈالا کریں۔۔ میں جنت سے پچاس کلومیٹر آگے نکل گیا ہوں۔

سعادت علی خان ہر امر میں سلیقے اور صفائی کا پابند تھا۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اہلِ دفتر خوشخط لکھیں، اور فی غلطی ایک روپیہ جرمانہ۔ اتفاقاً اعلیٰ درجے کے اہل انشا میں ایک مولوی صاحب تھے۔ انہوں نے فردِ حساب میں ''اجناس'' کو ''اجنا'' لکھ دیا۔ سعادت علی خان تو ہر شے پر خود نظر رکھتے تھے۔ ان کی بھی نگاہ پڑ گئی مولویوں کو جواب دینے میں کمال ہوتا ہے، انہوں نے کچھ قاموس، کچھ صراح سے، ''اجنا'' کے معنی بتائے، کچھ قوعدِ نحو سے ترخیم میں لے گئے۔ نواب نے سید انشا کو اشارہ کر دیا، تو انہوں نے رباعی پڑھی:

اجناس کی فرد پر یہ ''اجنا'' کیسا
یاں ابر لغات کا گرجنا کیسا؟
گو ہوں، ''اجنا'' کے معنی جو اگے
لیکن یہ نئی اُپج کا اُپجنا کیسا؟

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

وہ نقش پا تو نہیں نقشِ پان چھوڑ گیا
کہاں کہاں مرا قاتل نشان چھوڑ گیا

تھیں پانچوں انگلیاں اسکی محبتوں کی گواہ
وہ میرے چہرے پہ اک داستان چھوڑ گیا

ہے اپنا حال بھی اس بھوکے شخص کی مانند
کباب کھا گیا جو ، سادہ نان چھوڑ گیا

ہے شکر اُس سے ملاقات کھل کے ہو نہ سکی
سنا کے چار سو اشعار جان چھوڑ گیا

نہیں ہے فکر کہ برباد کر گیا سب کچھ
خوشی ہے اس کی وہ میرا مکان چھوڑ گیا

ہیں پیچھے کتے تو لڑکی کا ابا سامنے ہے
کہاں پہ مجھ کو مرا مہربان چھوڑ گیا

الٹ پلٹ کے زمیں کو کئے پلاٹ الاٹ
نہ ہاتھ آسکا یوں آسمان چھوڑ دیا

سہانا وقت نہیں کھا نہ بادلوں کا فریب
دھواں بسوں کا کوئی کاروان چھوڑ گیا

کمایا جتنا تھا وہ دے کے صورتِ تاوان
میں تائیوان سدھارا دکان چھوڑ گیا

ہمارا حلق میں کھانا اٹک سا گیا
کہ بل سے پہلے ہمیں میزبان چھوڑ گیا

دعائیں دے گی ظرافت تجھے نوید ظفرؔ
مزاح و طنز کا اک ارمغان چھوڑ گیا

مشاعرے وہاں ہوتے تھے اسقدر مظہرؔ
''کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا''

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

غزل کسی کی ہو اپنا اُسے بنا لیا جائے
کوئی ردیف کوئی قافیہ چُرالیا جائے

حصولِ امن کی خاطر ہے اس کا ایک ہی حل
جلا پراٹھا جو بیوی دے اس کو کھا لیا جائے

کہ اس سے پہلے کوئی زلزلہ ہلانے لگے
پہاڑ جسم کو تھوڑا سا خود ہلا لیا جائے

نکلتی بھاپ ہے جس طرح بند ککر سے
درست ہوگا کہ کچھ منہ میں بُڑبُڑا لیا جائے

ڈیزائینر نے کہا دے کے ٹائیٹ اور کُرتی
چلو پھر آج خواتین کو پھنسا لیا جائے

کلام پڑھ کے گھروں کو سدھارے ''بے وزنے''
جنابِ صدر کو اب نیند سے جگا لیا جائے

وہ لے کے ایم۔اے کی ڈگری ہوئے ہیں سنجیدہ
یہ سوچتے ہیں کہ اب کوئی قاعدہ لیا جائے

تمام جھوٹوں کو جیلوں میں بند کرنے کے بعد
ہمارے مُلک کا اِک سچا جائزہ لیا جائے

تو پہلے آتا تھا جتنے میں سُوٹ بیگم کا
اب اتنے پیسوں میں بچے کا جانگیہ لیا جائے

نہ جانے ڈھونڈ رہا ہے مریض کب سے کوئی
حکیم ، سرجری کا جس سے مشورہ لیا جائے

ملے گا وہ ، نہ ملے گا جو ورلڈ بنک سے بھی
خدا کے آگے اگر اتنا گڑگڑا لیا جائے

ابھی تو عقد سے پہلے پڑا ہے وقت بہت
تو کھل کھلا کے ذرا اور کِھلکھلا لیا جائے

غزل میں بھر کے ظریفانہ رنگ مظہرؔ جی
گھٹن کے دور میں تھوڑا سا مسکرا لیا جائے

تنویر پھولؔ

کوئی بھی بات پُراثر نہ ہوئی
شکر ہے آنکھ میری تر نہ ہوئی

پھوٹتے من میں کس طرح لڈو!
حالِ دل کی اُنھیں خبر نہ ہوئی

دیکھ لو! کار وبارِ انٹرنیٹ
ختم ڈیوٹی یہ رات بھر نہ ہوئی

لیلیٰ مجنوں کا کھیل ہم کھیلے!
یہ کہانی مگر امر نہ ہوئی

اِک نکھٹو گلی میں رہتے تھے
زندگی کام میں بسر نہ ہوئی

اپنی اپنی ہیں قسمتیں یارو!
بوند ٹپکی مگر گہر نہ ہوئی

ہو چکی تھیں سگائیاں کتنی!
اُن کی شادی کبھی مگر نہ ہوئی

خواب میں قہقہے نظر آئے!
شامِ غم کی مگر سحر نہ ہوئی

پھولؔ! اشعار کے کھلے غنچے
اپنی کوشش یہ بے ثمر نہ ہوئی

تنویر پھولؔ

چار سو بیسی وطیرہ ہُوا مکّاروں کا
حال ابتر ہے شرافت میں ہی بے چاروں کا

ڈانٹ پھٹکار میں بیگم کی ہے بجلی کی کڑک
بس یہی راز ہے بھیگی ہوئی شلواروں کا

رال ٹپکاتی ہے ہر منہ سے کبابوں کی مہک
سیخ کے نیچے بچھا فرش ہے انگاروں کا

تیرے ابّا نے ہیں برسائے ستم کے ڈنڈے
کیسا نکلا ہے کچومر ترے بیماروں کا

دال جو دیکھی تو مہمان نے منہ پھیر لیا
منتظر وہ تھا کبابوں ہی کے چٹخاروں کا

دیکھو! لیڈر پہ ہوئی مال کی کیسی بارش
سامنے بنگلے کے بیڑا ہے نئی کاروں کا

پیٹو مُلّا کی جو اُلجھی ہوئی داڑھی دیکھی
لوگ سمجھے کہ یہ ہے جال سیہ تاروں کا

سڑکیں ویران ہوئیں، نو بجے اُلّو بولے
لوڈ شیڈنگ سے یہ حال ہے بازاروں کا

کوششیں مُنّے کی امّی نے بہت کیں لیکن
سلسلہ رُک نہ سکا رات کے فوّاروں کا

کوئی تجھ کو بھی بنالے نہ گلے کی زینت
پھولؔ! بازار بہت گرم ہُوا ہاروں کا

شوکت جمالؔ

نہ دھمکیوں سے ملا ہے نہ حُجّتوں سے ملا
ملا ہے دل جو یہ واپس تو منّتوں سے ملا

پتنگ بازی ہماری تو اک بہانہ تھا
پڑوسیوں سے وفا کا سبق چھتوں سے ملا

ملا جو ڈاک سے اُس کو پیامِ شوق مرا
جواب دینے سے پہلے وہ پنڈتوں سے ملا

ہیں کتنے چاہنے والے ترے ہمارے سِوا
سُراغ ہم کو محلّے کی عورتوں سے ملا

یہ کہہ کے بزم سے اُس نے اُٹھا دیا مجھ کو
کہ نیتوں کا پتا تیری حرکتوں سے ملا

شوکت جمالؔ

تمھارے دِل میں میرا خوف کس نے اِس قدر ڈالا
لگایا تم نے اِک تالا اِدھر اور اِک اُدھر ڈالا

یہ بھولیں وہ کبھی یہ ذائقہ اُن کے لئے ہم نے
کڑاھی گوشت بنوایا تو دل ڈالا، جگر ڈالا

ہمیشہ ایک سے رہتے نہیں ہیں دِن سو قدرت نے
بہو کو کچھ برس رکھا، بہو پھر ساس کر ڈالا

میں اُس میں ڈھونڈتا تھا کوچۂ دلدار کا رستہ
مگر کم بخت GOOGLE نے نہ جانے کس ڈگر ڈالا

بآسانی وہ پڑھ لیں نامۂ الفت میرا، میں نے
ضرورت کے مطابق پیش ڈالا، زیر ڈالا اور زبر ڈالا

سیاسی لیڈروں میں بھی یہ خصلت ہے مویشی کی
گلستانِ وطن میں جو ہرا دیکھا، وہ چر ڈالا

نہ پلٹیں وہ کئی دن تک جو میکے سے تو پھر ہم نے
کہلوایا کچھ اوروں سے، کچھ اپنا بھی اثر ڈالا

ڈاکٹر عزیز فیصل

وہ احمقوں کا پیر تھا، جبران تو نہ تھا
اس میں سیانی بات کا امکان تو نہ تھا

ٹھونسی ہیں یونہی کانوں میں تم نے تو انگلیاں
چولا یہ اک ہی شعر ہے، دیوان تو نہ تھا

سڑکوں کو لال و لال جو دیکھا تو یہ کھلا
جو چیز اس کے منہ میں تھی، وہ پان تو نہ تھا

لایا وہ گھر میں تیسری بیگم بھی گھیر کر
اس گھر میں ایسی جنس کا فقدان تو نہ تھا

نسوار، لمبی مونچھ نہ کندھے پہ کوئی گن
وہ شخص فنی طور پر گل خان تو نہ تھا

میں نیند میں ہی ریل سے یک دم اتر پڑا
ملتان جس کو سمجھا تھا، ملتان تو نہ تھا

بٹوا ہوا تمام تر خالی تو یہ کھلا
اک پل کا وصل یار بھی آسان تو نہ تھا

نوبل پرائز جس کو ملا بھنڈی کاشت میں
جاپان کا وہ دھوبی تھا، دہقان تو نہ تھا

یہ سب ہی لوٹ مار کی فلموں کا درس ہے
بنکوں کو ورنہ لوٹنا آسان تو نہ تھا

بیگم نے جس کو گنے کا جبراً پلایا رس
شوگر تھی اس حکیم کو، یرقان تو نہ تھا

بن کر کرین دودھ کی اک نہر کھودنا
فرہاد کے دماغ کا خلجان تو نہ تھا؟

پردہ نشیں ہی مجھ کو سمجھتے ہیں بھائی جان
ورنہ میں فیس بک سے پریشان تو نہ تھا

فیصلؔ بتا یہ اپنی غزل کو کہ پھر بھی تو
فاروق روکھڑی سا سخندان تو نہ تھا

ڈاکٹر عزیز فیصل

دل میں اس کی یادیں ڈالی جا سکتی ہیں
ایسی بلائیں بھی تو پالی جا سکتی ہیں

ٹال مٹول کو اتنا تو پھیلاؤ تم ناں
اس کی ڈمانڈیں جب تک ٹالی جا سکتی ہیں

خالی جیبوں والے دل پھینکوں کے در سے
چاند فقیرنیاں بھی خالی جا سکتی ہیں

شوہر کی حرکات بہ چشم منکوحہ ہی
دیکھی جا سکتی ہیں، بھالی جا سکتی ہیں

ناقص گھی سے پکنے والا سالن کھا کر
اپنی ساری آنتیں گالی جا سکتی ہیں

عہد جدید میں پگڑی باندھتا کوئی نہیں
سو اب پی کیپیں ہی اچھالی جا سکتی ہیں

فیصلؔ یہ بتلاؤ بعض بزرگوں کی بھی
عادتیں کیسے بچوں والی جا سکتی ہیں؟

سید فہیم الدین

کنوار پن ہے تبھی گرانی سے بچ گیا ہوں
زوال کیسا اگر زنانی سے بچ گیا ہوں

وزن تھا ایسا میری کمانی بھی ٹوٹ جاتی
میں اپنے سسرال کی نشانی سے بچ گیا ہوں

پٹا رقیبوں سے پہلی الفت کے پہلے دن ہی
سو آج کی اک بڑی کہانی سے بچ گیا ہوں

مجھے پلس نے پکڑ لیا تھا برائے رشوت
میں اپنے پھوپھا کی مہربانی سے بچ گیا ہوں

مرے لہو میں تو اب کرپشن سی دوڑتی ہے
یہی سبب ہے اِسی روانی سے بچ گیا ہوں

مجھے خبر تھی کہ کوئی مفتے میں مار دے گا
میں فوت ہو کر جہانِ فانی سے بچ گیا ہوں

سید فہیم الدین

افسر مرے خلاف ترے بعد میں ہوا
نیچے مرا گراف ترے بعد میں ہوا

پہلے تو میرے دل میں تھا چھوٹا سا چھید ہی
دل میں مرے شگاف ترے بعد میں ہوا

اپنا شمار تھا بڑے چچوں میں خیر سے
پتہ ہمارا صاف ترے بعد میں ہوا

انسان کا شمار کبھی بندروں میں تھا
لیکن یہ انکشاف ترے بعد میں ہوا

چلتے تھے اِن حسینوں سے اپنے معاملات
پر اِن سے اختلاف ترے بعد میں ہوا

رحمان حفیظ

ایک مہماں پورے ''خانے'' میں
اونٹ لایا ہوں شامیانے میں
آؤ کانوں میں انگلیاں دے لیں
ہے وہ مصروف گانے گانے میں
کام مشکل سہی مگر قسمے
لطف ہے پیٹھ کو کھجانے میں
جیسے بازارِ درد گرم رہا
اتنی تکلیف گری دانے میں !!
مشترک ٹھرک کتنے پائے گئے
میرے دادے تمہارے نانے میں
تم بھی شہنائی لائے ہو لیکن
گال پھولیں گے یہ بجانے میں
قیس! تڑیاں لگارہا ہے مجھے
عمر کاٹے گا جیل خانے میں
لنچ کے ساتھ مکھیاں بھی ملیں
تھیں جو ایکسپرٹ بھنبنانے میں
من و سلویٰ سے بڑھ آتا ہے
لطف اوروں کا مال کھانے میں
نادرا اب شمار کرتا ہے
میرے خانے کو جیل خانے میں
کیسے جیتے ہیں ہم وطن میرے
کچھ کچہری میں، باقی تھانے میں

احمد علی برقی اعظمی

گرا تو سکتا ہے لیکن اٹھانے والا نہیں
رُلا تو سکتا ہے تجھ کو ہنسانے والا نہیں
دلے گا مونگ وہ اب پانچ سال چھاتی پر
وہ جانتا ہے کوئی اب ہٹانے والا نہیں
دیا ہے ووٹ تو اس کی سزا بھگتنا ہے
وہ شکل اپنی تجھے اب دکھانے والا نہیں
غرض ہے تیری تو ،تواس سے جاکے مل ورنہ
تجھے وہ بھول سے ملنے ملانے والا نہیں
ملاتا تھا جو تری ہاں میں ہاں الیکشن میں
گلے سے اپنے تجھے وہ لگانے والا نہیں
نہ ہاتھ آئے گا اب پانچ سال وہ تیرے
تو مَر بھی جائے تو پانی پلانے والا نہیں
تو اس کی کرتا ہے ناحق یہ ناز برداری
کہیں بھی کام سے تیرے وہ جانے والا نہیں
ہے ٹیڑھی کھیر ملاقات اس سے اب تیری
تو پانچ سال کہیں اس کو پانے والا نہیں
کرے گا تجھ سے وفا ہے یہ تیری خوش فہمی
وہ تیری موت پہ آنسو بہانے والا نہیں
امیر شہر کو تو جانتا نہیں ہے ابھی
لگا کے آگ وہ ہرگز بجھانے والا نہیں
ہے تجھ کو مشورہ برقیؔ کا چھوڑ دے اس کو
وہ تیری دال کہیں بھی گلانے والا نہیں

عرفان قادر

دل میں ہمارے روز ہی دلبر لگا کے آگ
پٹرول پھینکتا ہے وہ اس پر، لگا کے آگ

پہلے ہی اُس کے ہاتھ میں ماچس نہ دیجیے
بستی جلا نہ دے کہیں بندر، لگا کے آگ

باقی کرپشنوں کا رہے کوئی نا ثبوت
جلوا کے راکھ کر دیئے دفتر، لگا کے آگ

دونوں طرف اگرچہ ہیں حوا کی بیٹیاں
معصوم بن ہی جاتی ہیں اکثر لگا کے آگ

آپس میں ایک دوسرے سے سب ملے ہوئے
لڑواتے ہیں عوام کو رہبر لگا کے آگ

کوئی نہ اُس پہ شک کرے، شاید اسی لیے
وہ پی رہا ہے دیکھ لو، فیڈر، لگا کے آگ

انسانیت بھسم ہے کی یوں ذات پات نے
''تُو اونچی ذات کا ہے''، ''تُو شودر''، لگا کے آگ

شعلے اُگل رہی ہے تری آتشیں زباں
جاری ابھی تلک ہے یہ ٹر ٹر، لگا کے آگ

بھڑکائے گا خود آدمی، یہ جانتا نہ تھا
شیطان ہے کھڑا ہوا ششدر لگا کے آگ

پہنچے گی تیرے گھر کے بھی اندر ضرور وہ
بچ پائے گا نہیں کبھی باہر لگا کے آگ

عرفان قادر

گر جاں عزیز ہے تو، ذرا اور تیز بھاگ
مجنوں تمھارے پیچھے ہیں لیلیٰ کے تین ڈاگ

دیوان ایک ''شاعرِ اعظم'' کا پڑھ کے لوگ
پٹرول پھینکتے ہیں، وہ اس پر، لگا کے آگ

گانے سُنا رہا ہے وہ کچھ اس طرح ہمیں
مچھر بھی گرمیوں میں نہیں گاتے ایسے راگ

برگر کے ساتھ پیپسی مرغوب ہے انھیں
بچے ہمارے عہد کے کب کھائیں دال ساگ؟

دن رات مارتا تھا جو بھینسوں کے سامنے
اب تک ہمیں وہ یاد ہیں رانجھے کے ڈائیلاگ

چاہے زبان جو بھی ہو، شوہر ہیں بے زباں
پیرس ہو پُونے ہو یا پشاور ہو یا پراگ

دیکھو جسے بھی گھر میں ہے جھاڑو لگا رہا
برتن، بنا کے دھوئے ہیں، صابن سے خوب جھاگ

ان پڑھ ہمارے دیس کو بالکل ڈبو نہ دیں
تعلیم یافتہ جواں! بڑھ کر سنبھال باگ

یورپ کے ساحلوں پہ تھا پھرتا کسی کے ساتھ
بیلن لگا جو سر پہ تو فوراً گیا وہ جاگ

دیں گے ضرور داد تری شاعری پہ وہ
معیار کیا ہے جانتے ہیں سب پرانے گھاگ

ہاشم علی خان ہمدمؔ

راز کھلتے ہیں کہاں ہم پہ پری خانوں کے
ہم تو بندے ہیں سیاست کے نہ ایوانوں کے

اپنی دستار اتاریں بھی تو کس کو سونپیں
سر ہی گنجے ہیں مرے عہد میں سلطانوں کے

جو کھلا دے اسے جینے کی دعا دیتے ہیں
وہ بھی شوقین ہیں چائے کی طرح کھانوں کے

پاپ میوزک میں سناتے ہیں زنانہ چیخیں
یوں بدلتے ہیں وہ انداز بھی دوگانوں کے

دیکھنا سننا یہاں سب کا ہے گونگوں جیسا
کان بہروں نے لگا رکھے ہیں عجب کانوں کے

شوخ ساقی نے سیاہ لینس لگا رکھے تھے
کس کی آنکھوں سے پتے پوچھتے میخانوں کے

اک گداگر نے عجب کہہ کے پریشان کیا
کام آتے ہیں مسلماں ہی مسلمانوں کے

دال روٹی پہ گزارہ ہے ہمارا ورنہ
دام اچھے ہیں ابھی شہر میں انسانوں کے

کم سے کم خون کا سودا نہیں کرتے صاحب!
کام انساں سے تو اچھے ہیں نا حیوانوں کے

مست رہتے ہیں بھرے شہر میں شیشہ پی کر
برگری ناز ہیں اس دور میں دیوانوں کے

کوک پیتے ہیں لنڈھاتے ہیں ڈیو کی بوتل
بڑھ گئے دام جو ساقی ترے پیمانوں کے

میں بھی تو اپنے علاقے کا ملک ہوں ہمدم
ووٹ کیوں پڑتے نہیں ہیں مجھے اعوانوں کے

شاہین فصیح ربانی

شادی کا کارڈ اس لیے آیا نہیں ہنوز
مانا دلہن غریب کا تایا نہیں ہنوز

ترکیب سہل تو ہے خیالی پلاؤ کی
لیکن جناب ہم نے پکایا نہیں ہنوز

اپنی سزا کا کیسے تعین کریں گے ہم
احباب نے قصور بتایا نہیں ہنوز

کرتے ہیں لوگ یوز بہت کمپنی کا نیٹ
کیوں یہ پوائنٹ اس نے اٹھایا نہیں ہنوز

آیا ہوں دے کے ناپ نئے پینٹ کوٹ کا
دعوت پہ گرچہ اس نے بلایا نہیں ہنوز

مالک مکان آئے تو مرغی کھلاؤں گا
دینے کو میرے پاس کرایہ نہیں ہنوز

اٹھا ہے شورِ واہ سرِ انجمن فصیح
ہم نے غزل کا شعر سنایا نہیں ہنوز

روبینہ شاہین بیناؔ

حقوق نسواں کے بل پہ چارہ نہیں چلے گا
کسی بھی شوہر کا اب اجارہ نہیں چلے گا

کہا ٹریفک کے سارجنٹ سے یہ دل جلے نے
کبھی بھی گھر میں ترا اشارہ نہیں چلے گا

ہمیں ضرورت ہے گرمیوں میں تمھاری بجلی
تمھارے بن کوئی فین ہمارا نہیں چلے گا

بہت ہوا ہے یہ مک مکیا سیاستوں میں
ہمارے ووٹوں پہ اب اجارہ نہیں چلے گا

سیاسی نعروں نے ووٹروں کو دیا ہی کیا ہے
بغیر نوٹوں کے اب یہ نعرہ نہیں چلے گا

شہباز چوہانؔ

بے شک برگ و بار کے دن ہیں باباجی
آپ کے سوچ بچار کے دن ہیں باباجی

عشق و حُسن کا دور سہانا بیت گیا
توبہ استغفار کے دن ہیں باباجی

عزرائیل سے وصل کا موسم آیا ہے
قبروں کے دیدار کے دن ہیں باباجی

نمبر ڈھونڈیں سرجن اور فزیشن کے
کھانسی درد بخار کے دن ہیں باباجی

گھوما کریں نہ پچھلے پہر بازاروں میں
کیونکہ اگلے پار کے دن ہیں باباجی

لیتے ہو جو پنگا گڈیوں چڑیوں سے
لگتا ہے کہ مار کے دن ہیں باباجی

احمد علوی

پٹائی سے پولس والوں کی کیا کیا بول دیتا ہے
میاں زندوں کی کیا اوقات مردہ بول دیتا ہے

بہت عزت کمائی ہے وطن میں ٹی وی چینل نے
وہی سچائی ہوتی ہے جو جھوٹا بول دیتا ہے

رسولوں سے بڑا ہے مرتبہ عزت مآبوں کا
کوئی بولے کہ نہ بولے یہ چمچا بول دیتا ہے

نہیں برداشت ہوتا مرچ لگ جاتی ہے دنیا کو
کبھی حق بے زباں جب بے ارادہ بول دیتا ہے

حقیقت کب بدلتی ہے بدل جانے سے لفظوں کے
اڑایا ہے کہاں سے شعر، چربہ بول دیتا ہے

مقدر میں نہیں ہو تو کھدائی میں نہیں ملتا
اگر تقدیر میں ہو تو خزانہ بول دیتا ہے

جو کالا ہے اسے کالا جو گورا ہے اسے گورا
نہیں رکتا کبھی علویؔ ہمیشہ بول دیتا ہے

اقبال شانہؔ

عشق ہمت سے میں فرماؤں گا انشاء اللہ
اُن کے ڈیڈی سے نہ گھبراؤں گا انشاء اللہ

کیوں ڈراتے ہو دکھا کر مجھے خالی بندوق
وقت آئے گا تو مر جاؤں گا انشاء اللہ

کیا ہوا کل جو میں وعدے پہ نہ آیا جاناں
زندگی میں تیری آ جاؤں گا انشاء اللہ

آپ کی طرح میں بھی آدمی کا بچہ ہوں
ڈر لگے گا تو میں ڈر جاؤں گا انشاء اللہ

یوں تو یہ شرم و حیا آپ ہی کا زیور ہے
آپ کہتے ہیں تو شرماؤں گا انشاء اللہ

تیرے درباں نے ترے گھر سے نکالا مجھ کو
اب میں دربان کے گھر جاؤں گا انشاء اللہ

اب گرج کر نہ کوئی شعر پڑھوں گا شانہؔ
میں ترنم میں غزل گاؤں گا انشاء اللہ

عتیق الرحمٰن صفی

ورزش سے کچھ ویٹ گھٹایا جا سکتا ہے
خود کو پھر سے ینگ بنایا جا سکتا ہے
ایجنگ فیکٹر آڑے آ جائے تو پھر بھی
انٹرنیٹ پہ عشق لڑایا جا سکتا ہے
سوچ رہا ہوں اتنی بھینگی محبوبہ سے
کس اینگل سے نین ملایا جا سکتا ہے
گر وہ ساتھ نہ آئے تو پھر اُس کے پیچھے
کتا چھوڑ کے ساتھ بھگایا جا سکتا ہے
ہر اِک دانشور سے بس یہ پوچھتا ہوں میں
پاگل سے کیا کیا کروایا جا سکتا ہے
ڈانس نہیں جس جس کو آتا اُس کو بھی تو
ٹھمکی کا اِک ناچ نچایا جا سکتا ہے
اک دوشیزہ نے بتلایا جعلی عاشق
جعلی بھائیوں سے پٹوایا جا سکتا ہے
جس کی ہر اِک سوچ کو سیدھا کرنا ہو تو
اُس کو اُلٹا ہی لٹکایا جا سکتا ہے
گوگل ارتھ سے اُس کی چھت کو دیکھ کے سوچا
اُس کو کوٹھے پہ بلوایا جا سکتا ہے
یہ اِک میک اپ ٹپ ہے گنجے یارو سُن لو
ٹاکی سے ٹنڈ کو لشکایا جا سکتا ہے
صابن دانی پہ باقی ہے جو چکنائی
اُس سے بھی اِک روز نہایا جا سکتا ہے
کفرانِ نعمت ہے یارو انکار اِس کا
گھسرے کو بھی یار بنایا جا سکتا ہے
اُن سے پیار محبت والا سین صفی بس
ذہن کے پردے پہ فلمایا جا سکتا ہے

اسلام الدین اسلامؔ

نثار، عابد و زاہد ملے وقار ملا
گنوار کہتی ہے اب بھی نہ سچا پیار ملا

ہزار لوڈ کراؤ تو بات ہوتی ہے
ہمیں تو یار بھی قسطوں پہ ماہوار ملا

اتار لی وہ انگوٹھی جو دی تھی تحفے میں
شدید بھیڑ میں جیسے ہی دستِ یار ملا

اُسی کو تحفے میں دے کر پٹائی کروا لی
تھا رات ھولی میں جس کے گلے کا ہار ملا

پھر اسکی عمر رسیدہ کزن سے شادی ہوئی
نتیجتاً اسے بیوی سے ماں کا پیار ملا

"مرا طریق امیری نہیں فقیری ہے"
یہی وجہ ہے مجھے قرض بے شمار ملا

وہاں وہاں تھے رہائش پذیر دیس کے لوگ
جہاں جہاں مجھے یورپ میں کوئی غار ملا

کل ایک شیخ لگا بیٹھا سب جمع پونجی
پلوٹو پہ جو پلاٹنگ کا اشتہار ملا

مرے گوالے' مرے یار، سارا پانی ہے
خدا کے واسطے اِک دودھ کی بھی دھار ملا

یاسر عباس فرازؔ

جن کو نصیب خوبرو ہمسائیاں نہیں
ان کے نصیب میں کہیں خوش بختیاں نہیں

جو تم میں پائی جاتی ہیں عہدِ شباب میں
وہ ساری والدین ہی کی غلطیاں نہیں

یوں بھی کرایا گیس پہ گیزر جناب نے
جب بھی نہانا ہوتا ہے تب بجلیاں نہیں

لڈو، گلاب جامن، امرتی، جلیبیاں
مجھ کو یہ سب پسند ہیں بس برفیاں نہیں

سردی میں بھی سلیو لیس پہنیں جو لڑکیاں
پھر لڑکیاں وہ ٹھنڈ سے کیوں مرتیاں نہیں

مردوں کا ماپ لینے کو شہرِ لباس میں
درزی تو پائے جاتے ہیں درزانیاں نہیں

کرنے لگا ہوں عشق کی پوچھل پہ استری
سیدھی ہمیں جناب کبھی سوجھیاں نہیں

میری نظر کے پیٹ میں چوہے ہیں دوڑتے
اک عمر سے جو پائی تمہیں جھاتیاں نہیں

جا کر یہ کہہ دیں قوم کی سب لڑکیوں سے آپ
بے پردہ جو پھریں وہ رہیں باجیاں نہیں

کاٹا ہے ان کو عشق کے بھونڈوں نے ٹھیک ٹھاک
ایسے ہی ان کی آنکھ میں یہ لالیاں نہیں

بس کیجیے جناب کہ یاسرؔ بہت ہوا
زائد مزاح کاریاں بھی اچھیاں نہیں

محمد قمر شہزاد آسیؔ

دیدار اس نے یار کا پایا نہیں ہنوز
جس نے بھی ایزی لوڈ کرایا نہیں ہنوز

پہلے ہی بول پر ہوئی برساتِ پیر پوش
مغنی نے بول دوسرا گایا نہیں ہنوز

چٹ کر کے بیس روٹیاں سالم بمع مٹن
کہتا ہے مجھ سے میٹھا تو کھایا نہیں ہنوز

بجلی کے بل کو دیکھتے ہی ہوش اڑ گئے
اور گیس کا تو بل ابھی آیا نہیں ہنوز

اس واسطے ہی عشق مرا کامیاب ہے
شادی کا میں نے اسکو بتایا نہیں ہنوز

بیگم بھی فیس بک پہ ہی مصروف کار ہے
کھانے کو اس نے کچھ بھی بنایا نہیں ہنوز

اس نے کہا تھا اپنا بنا کر میں چھوڑونگی
بیگم نے اپنا قول نبھایا نہیں ہنوز

اتنی سی بات پر وہ قمر سے خفا ہوئی
تارے فلک سے توڑ کے لایا نہیں ہنوز

نوید صدیقی

شہرِ سخن میں چند ہی شاعر پاگل ہیں ، دیوانے ہیں
ہاشم ، فیض، نوید ، کیانی ، بس دو چار ہی دانے ہیں
جن کے نیچے لمبی گاڑی ان کو ہے سیلیوٹ یہاں
ہم جیسے بائک والوں کی قسمت میں جرمانے ہیں
کوئی بھی اپنے ملک کا ویزہ دینے کو تیار نہیں
چھان کے ہم نے دیکھے ہیں یاں جتنے سفارت خانے ہیں
ہر دفتر میں افسرِ اعلیٰ صرف انھی سے ملتے ہیں
اہلِ شفارش ہیں یا جن کے ہاتھوں میں نذرانے ہیں
دہشت گردی کیسے ہو سکتی ہے ختم ، بتاؤ تو
جب کہ سیاست دانوں کے ان سے گہرے یارانے ہیں
اب تو معاذاللہ! یہاں کچھ نظمیں سن کر لگتا ہے
حمد و ثنا کی آڑ میں گویا پورے فلمی گانے ہیں
ثابت ہوتا ہے دعوت میں چھین جھپٹ سے یاروں کی
''اپنی ذات سے عشق ہے سچا ، باقی سب افسانے ہیں''
بزم میں آنے والوں نے گھیرا ہے صدرِ محفل کو
آنے والے جیسے آئے ہی سیلفی بنوانے ہیں
رہتا ہے دن رات مگن خود آپ وہ اس کی خدمت میں
جو کہتا تھا کہ بیوی سے ناز اپنے اٹھوانے ہیں
ساس بہو کے سارے ڈراموں کی ہے ''بیسک تھیم'' یہی
گھر میں ہیں جتنے بھانڈے سب آپس میں ٹکرانے ہیں
''ہی اوں'' میں ہیں نہ ''شی اوں'' میں، کچھ اینکر ہیں ایسے بھی
صاف ''زنانے'' دکھتے ہیں حالاں کہ وہ ''مردانے'' ہیں

نورؔ جمشید پوری

بہو سے ساس نہ بیزار ہو ایسا نہیں ہوتا
بہو بھی ساس سے سر شار ہو ایسا نہیں ہوتا
ذرا سا دل بڑا کر لو نہ دیکھو تم حقارت سے
بہو جو لائی سب بیکار ہو ایسا نہیں ہوتا
اسے دیکھا کبھی تم نے بتاؤ ماں کی نظروں سے
بہو ہر ایک ہی عیار ہو ایسا نہیں ہوتا
جو اپنے گھر میں لاکر پھر بہو پر ظلم کرتے ہیں
خدا کی ان پہ نہ پھٹکار ہو ایسا نہیں ہوتا
پڑوسی اک نیا جوڑا ،ہرا بن کر جو آیا ہے
کسی دن ان کی نہ تکرار ہو ایسا نہیں ہوتا
اگر تھوڑا سا پڑھ لیتے کسی میں پاس ہوجاتے
ہر اک پر چہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہوں کتنے عیب بھی ان میں امیری ڈھانپ لیتی ہے
جو ہے مفلس وہی غدار ہو ایسا نہیں ہوتا
اُنہیں بھی تو ہمارے ہی تعاون کی ضرورت ہے
ہر اک سرکا ہی بیکار ہو ایسا نہیں ہوتا
کہاں ہم آگئے ہیں اب، کسی دن ابن آدم سے
رنگا نہ خون میں اخبار ہو ایسا نہیں ہوتا
بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں تری محفل میں سب آکر
ہر اک بندہ یہاں فنکار ہو ایسا نہیں ہوتا
سخن ور اور اچھے ہیں، ہمیشہ نورؔ محفل میں
ترا ہر شعر ہی دم دار ہو ایسا نہیں ہوتا

نوید ظفرؔ کیانی

حُسن کیسے ہو مسخّر سوچیں
کوئی منتر ، کوئی جنتر سوچیں
ناچ ٹھُمکی کا نچا دیتی ہیں
یوں گھما دیتی ہیں میٹر سوچیں
کیوں زمانے کا چلن ہے اُلٹا
شاخ سے اُلٹا لٹک کر سوچیں
کوئی انسان بنے کیوں لوٹا
کچھ سیاست کے مچھندر سوچیں
جب تصرف میں ہے دیوارِ سخن
تھاپیے صورتِ گوبر سوچیں
کسی انگنائی میں گھس جاتی ہیں
چن چڑھائیں گی نیا شر سوچیں
جس قدر شادی شدہ ہیں اب کے
صدر ممنون سے بن کر سوچیں
میں تو پنڈی میں کہیں اٹکا ہوں
اور جا پہنچیں پشاور سوچیں
جب زمیں پاؤں تلے کی کھسکے
قوم کے واسطے لیڈر سوچیں
اپنے بارے میں نہ سوچے انساں
تو کیا ان کے لئے ڈنگر سوچیں
آپا دھاپی کا زمانہ ہے ظفرؔ
خود کو دیکھیں یا وہ مجھ پر سوچیں

وسیمؔ شہزاد

اپنی قسمت میں چوبارے رہ گئے
ہم کنوارے تھے کنوارے رہ گئے

سامنے گھر کے جو شادی ہال ہے
دیکھتے اس کو بچارے رہ گئے

سامنے سے سر ہوا گنجا مرا
اب ہرے اس کے کنارے رہ گئے

اب ہوا برباد کاروبار بھی
گاہک اب تو بس اُدھارے رہ گئے

چل دئے وہ مجھ کو یونہی چھوڑ کر
میری خاطر بس اشارے رہ گئے

پارٹی کا کیک قسمت میں نہ تھا
پھول، پانی اور غبارے رہ گئے

کھا لیا تھا مرغ سارا اور کباب
ہاں مگر چاول کرارے رہ گئے

سُنتِ شیریں ادا ہو گی کبھی
سوچتے ہم غم کے مارے رہ گئے

محمد خلیل الرحمٰن

وہ جو میرا تُم پہ اُدھار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
نہیں اب تلک وہ ادا ہوا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

تھے غبی مگر ہوا داخلہ، ہوئے پاس یہ بھی کمال ہے
سبھی کچھ تھا میرا کیا دھرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ جو پٹ رہے تھے گلی میں تُم، وہ جو چیختے تھے مدد، مدد
وہی میں تھا جس نے چھڑا لیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

جسے آپ گنتے ہیں ہر گھڑی، یہ جو گرم جیب ہوئی ابھی
اسے اور کہتے ہیں کیا بھلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

چلو چھوڑ دو یہ کہانیاں، نہیں یاد، یہ بھی بُرا نہیں
مِرے منہ سے یونہی نکل گیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مزمل حسین چیمہ

اپنا ہر زخم دکھانے کا کہا تھا
بائیو اس نے پڑھانے کا کہا تھا

میں نے پھر اس کو سنا دی ہے غزل
اس نے احوال سنانے کا کہا تھا

میں اُسے بہن بنانے لگا ہوں
وہ جسے تو نے پٹانے کا کہا تھا

جس کی جانب میں بہت جانے لگا
اُس نے کیسے مجھے جانے کا کہا تھا

چھو کے پہلے مجھے تو آگ کیا
اور پھر اس نے بجھانے کا کہا تھا

جم دیے اُس نے بہت سے بچے
ہم نے تو دودھ جمانے کا کہا تھا

میری آنکھوں میں بھی آنسو اُمڈے
یوں مجھے اس نے نہانے کا کہا تھا

میں نے آواز غزلؔ دی خود کو
اس نے تو اس کو بلانے کا کہا تھا

نیاز احمد مجاز انصاری

ہمیں پولس کے جو افسر تلاش کرتے ہیں
ہمارے ساتھ ہی پی کر تلاش کرتے ہیں

ہر ایک فرم کے مالک کو سیلری کے لئے
اداس نظروں سے نوکر تلاش کرتے ہیں

نصیب اپنا بنانے ندی کنارے پر
ہم اپنی راشی کے پتھر تلاش کرتے ہیں

جب ہم کو دل کے مرض نے بنا دیا لاغر
سنا ہے سارے تونگر تلاش کرتے ہیں

جلا کے اپنے لہو کو حسد کی بھٹی میں
برائے خون چقندر تلاش کرتے ہیں

کوئی تو ہم کو سمجھ لے کہ پھنس رہے ہیں ہم
حسین چہروں کو ہنس کر تلاش کرتے ہیں

جو گومتی سے بہے اور چناب میں ڈوبے
ہم ایسے میل کے پتھر تلاش کرتے ہیں

''مجاز'' شہر میں تبلیغ دین کس نے کی
امام باڑے مجاور تلاش کرتے ہیں

ابنِ منیب

''ڈ'' سے شعر بنا کر ہم نے
حیراں سب کو کر ڈالا ہے

جھگڑا ہے بیکار کا صاحب!
آپ نے جس میں سر ڈالا ہے

دیکھو دیکھو پیار نے آ کر
دل میں کیسا ڈر ڈالا ہے

میں نے فتنہ اُس کے گھر میں
اُس نے میرے گھر ڈالا ہے

ارمانوں کے خون سے ہم نے
دیس کا دامن بھر ڈالا ہے

شہزاد قیس

زکو تو تم کو بتائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
کلی اَکیلے اُٹھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
کہا طبیب نے ، گر رَنگ گورا رَکھنا ہے
تو چاندنی سے بچائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
وُہ نیند کے لیے شبنم کی قرص بھی صاحب
کلی سے پوچھ کے کھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
ہَوائی بوسہ دِیا پھول نے ، بنا ڈِمپل
اُجالے ، جسم دَبائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
سنا ہے پنکھڑی سے رات کان میں پوچھا
یہ جلد کیسے بچائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو اُن کے سائے کے پاؤں پہ پاؤں آ جائے
تو ڈاکٹر کو دِکھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
متاعِ ناز کے ناخن تراشنے ہوں اَگر
کلوروفام سنگھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
لباس اُتاریں جو کلیوں کا وُہ بنے فیشن
گلاب دام چکائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
حجاب نظروں کا ہوتا ہے سو وُہ ساحل پر
سیاہ چشمہ چڑھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو جھوٹ بولنے میں اَوّل آیا اُس نے کہا
وُہ تین روٹیاں کھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
وُہ گول گپا بھی کچھ فاصلے سے دیکھتے ہیں
کہ اِس میں گر ہی نہ جائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
کنیز توڑ کے بادام لائی تو بولے
گِری بھی پیس کے لائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو غنچہ سونگھ لیں خوشبو سے پیٹ اِتنا بھرے
کہ کھانا سونگھ نہ پائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں

جو ''نیم ٹھوس'' غذا کھانے کو حکیم کہے
ہَوا بہار کی کھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
زُکام ہو گیا دیکھی جو برف کی تصویر
اَب اُن کو یخنی دِکھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
دَوا پلا کے قریب اُن کے بھیجے دو مچھر
کہ اُن کو ٹیکہ لگائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
بہت تلاش کی مچھر نے سُوئی گھونپنے کی
رَہا یا دائیں یا بائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
شفا کو اُن کی قریب اُن کے لیٹ کر ٹیکہ
طبیب خود کو لگائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
دَوا کو کھانا نہیں تین بار سوچنا ہے
طبیب پھر سے بتائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
وُہ تین روٹیوں کا آٹا گوندھ لیں جس دِن
تو گھر میں جشن منائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
وُہ بول لیتے ہیں یہ بھی خدا کی قدرت ہے
حُروف جشن منائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
گلے میں لفظ اَٹک جائیں اُردو بولیں تو
غرارے ''چپ'' کے کرائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو گاڑھی اُردو سے نازُک مزاج ہو ناساز
فِر اُن کو ہندی سنائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو اُن کا نام کوئی پوچھے تو اِشارے سے
ہَوا میں ''ل'' بنائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
جو پہلی بار ملے اُلٹا اُس سے کہتے ہیں
ہمارا نام بتائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
گواہی دینے وُہ جاتے تو ہیں پر اُن کی جگہ
قسم بھی لوگ اُٹھائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
وُہ پانچ خط لکھیں تو ''شکریہ'' کا لفظ بنے
ذِرا حساب لگائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں
چیونٹیوں کی لڑائی میں بول پڑتے ہیں
جلی کٹی بھی سنائیں ، وُہ اِتنے نازُک ہیں

بس اِس دَلیل پہ کرتے نہیں وُہ سالگرہ
کہ شمع کیسے بجھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
غبارہ پھولتا ہے خود سکڑنے لگتے ہیں
غبارہ کیسے پھلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
خیال میں بھی جو دعوت کریں عزیزوں کی
تو سال چھٹی منائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
اُٹھا کے لاتے جو تتلی تو موچ آ جاتی
گھسیٹتے ہُوئے لائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
ہر ایک کام کو "مختارِ خاص" رَکھتے ہیں
سو عشق خود نہ لڑائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
غزل یہ اُن کو پڑھائی ہے نو مہینوں میں
کتاب کیسے پڑھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
کتاب میں پھنسے اُنگلی وَرَق پلٹتے ہُوئے
تو جلد ساز بُلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
جو دِل بھی توڑنا ہو تو کرائے کے قاتل
سے ایسا کام کرائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
کلاس ساری تو اَلجبرا پڑھتی ہے اُن کو
اَلاختیار پڑھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
زیادہ پڑھ نہ سکے اور مسئلہ یہ تھا
کہ ڈِگری کیسے اُٹھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
بلب جلانے سے اِک دَھکا روشنی کا لگے
سو ایک دَم نہ جلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
جو کالی چیونٹی کبھی رَستہ کاٹ دے اُن کا
پلٹ کے گھر چلے جائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
غضب ہے چھٹی کے دِن گڑیا ، گڈا مل جل کر
اُنہی کی شادی کرائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وُہ پہلوانوں کو گڑیا کی بانہوں کی مچھلی
اُکھاڑے جا کے دِکھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
جو آئینے میں وُہ خود سے لڑائیں آنکھیں کبھی
تو ایک پل میں جھکائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں

وُہ صرف باتیں نہیں کرتے کارٹونوں سے
ڈِنر پہ گھر بھی بلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
قدم اُٹھاتے ہُوئے دیر تک وُہ سوچتے ہیں
قدم یہ کیسے اُٹھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
کلی ، گلاب ، بہن بھائی اُن کے لگتے ہیں
جو اُن میں عکس بنائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
چیونٹیوں سے وُہ لے لیتے ہیں قُلی کا کام
پھر اُن کو چینی کھلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وُہ تتلیوں کی طرح قدرے اُڑنے لگتے ہیں
جو آنچل اَپنا ہلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
فریج میں آرزو رَکھتے ہیں تا کہ تازہ رہے
قسم بھی دھو کے ہی کھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
سنا ہے وَہم کو اُن کے وُجود پر شک ہے
گمان قسمیں اُٹھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
جو کھیل کھیل میں اُلجھیں خیال سے اَپنے
تو زَخم دونوں کو آئیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وُہ سیر ، صبح کی کرتے ہیں خواب میں چل کر
وَزن کو سو کے گھٹائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وَزن گھٹانے کا نسخہ بتائیں کانٹوں کو
پھر اُن کو چل کے دِکھائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وُہ تِل کے بوجھ سے بے ہوش ہو گئے اِک دِن
سہارا دے کے چلائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
کل اَپنے سائے سے وُہ اِلتماس کرتے تھے
یہاں پہ رَش نہ لگائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
وُہ تھک کے چُور سے ہو جاتے ہیں خدارا اُنہیں
خیال میں بھی نہ لائیں ، وُہ اِتنے نازک ہیں
غزل وُہ پڑھتے ہی یہ کہہ کے قیس رُوٹھ گئے
کہ ناز کی تو ستائیں ، وہ اِتنے نازک ہیں

(شاعر کی ایک طویل غزل کے چند اشعار)

سید بدر سعید

حُسن شناسی حسن عباسی

جس طرح ساتویں بچے کی پیدائش پر ہمارے ہمسائے کو خیال آیا کہ آٹھواں بچہ موٹر سائیکل پر نہیں پھنس سکے گا اسی طرح ایک دن موٹر سائیکل چلاتے چلاتے حسن عباسی کو احساس ہوا کہ اگلی شاعرہ کی آمد پر بہت جلد اسے ٹینکی سے ہینڈل پر آنا پڑے گا سو دونوں نے گاڑی خرید لی۔ مشاعروں میں حسن عباسی کو دیکھ کر اختر ریاض الدین کی ہوائی والی گاڑی یاد آجاتی ہے، ہمارے دوست ''ب'' المعروف شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ حسن عباسی پارٹ ٹائم پبلشر ہے جبکہ فل ٹائم شاعرات ''ڈھونے'' کا کام کرتا ہے۔ وہ شاعرات جنہیں اکیلے، رات کو غیر مردوں کے ساتھ مشاعروں میں آنے کی اجازت نہیں ملتی انہیں لانے کا کام حسن عباسی انجام دیتا ہے معلوم نہیں کیوں ان کے گھر والے اسے ''مرد'' نہیں سمجھتے۔ حسن عباسی کو پانی، مسجد، کتاب اور لڑکیوں سے محبت ہے کہتا ہے پہلی تین چیزیں نہ ہوں تب بھی کام چلا لوں گا۔ کہتا ہے میں نے اپنے پہلے شعر سمندر کی ریت پر لکھے تھے میں نے پوچھا پھر کیا ہوا؟ تو کہنے لگا جس کے لیے لکھے تھے اسی نے گھر شکایت لگا دی کہ حسن ریت کھاتا ہے۔ اردو بازار کے پرانے لوگوں کا کہنا ہے کہ حسن عباسی نے بہت محنت کی ہے شاہ صاحب کا کہنا ہے واقعی بہت محنت اسی لیے اس کے سر پر نئے بال اگ آئے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ جتنا مشہور لاہور میں ہے اس سے کہیں زیادہ پشاور اور دبئی میں ہے۔ شکل وصورت کچھ ایسی ہے کہ ایک مرتبہ دبئی مشاعرہ پڑھنے گیا تو شیخ صاحبان نے غزل سے پہلے ہی واہ واہ شروع کر دی۔ اس کی غزل ''تیری مشکل نہ بڑھاؤں گا، چلا جاؤں گا'' کافی مشہور ہوئی لیکن مشاعرے میں سنانے سے پرہیز کرتا ہے کیونکہ جیسے ہی پہلا مصرعہ پڑھتا ہے منچلے ''چلے جاؤ، چلے جاؤ'' آواز لگا دیتے ہیں۔ ہر بات شاعرانہ انداز میں کرتا ہے، یہاں تک کہ کوئی بیوی بچوں کا پوچھے تو کہتا ہے:

ایک بیوی ہے تین بچے ہیں
عشق جھوٹا ہے لوگ سچے ہیں

وزن کی خرابی کے ڈر سے ابھی تک تین ہی بچے ہیں۔

حسن عباسی سب سے بنا کر رکھتا ہے اسی لیے ہمیں شک ہے کہ وہ زن مرید ہے جبکہ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ وہ رن مرید ہے کیونکہ زن عموماً ایک اور زیادہ سے زیادہ چار ہوتی ہیں۔ اس کی ہر تحریر میں پھول، بادل، اور لڑکی ضرور ہوتی ہے۔ کسی کا تعزیت نامہ لکھے تو اس میں بھی کوئی خوبصورت لڑکی ضرور ڈال دے گا جیسے لڑکی نہ ہوئی کوئی پکا پکایا پھل ہو گیا۔ اگر کسی چیز کا بار بار ذکر کرنے پر

جوہر سرحدی

جب میں نے بتایا کہ میں پشاور بھی ہو کر آ رہا ہوں، تو ان کے ہونٹوں پر ایک شرارت بھری مسکان کا رنگ آیا۔ "ہم تو پشاور کے صرف ایک ہی شخص سے واقف ہیں جو پاکستان تو کیا، پاکستان سے باہر انڈیا، انگلستان اور امریکا تک اردو کی بانسری بجاتا پھرتا ہے۔ مشاعروں کا کرشن کنھیا ہے۔" پھر مسکرائے، بولے، "میری مراد اور کس سے ہو سکتی ہے؟ احمد فراز سے ہے، جو کبھی جوہر سرحدی کے نام سے پہچانا جاتا تھا!"

احمد فراز اور جوہر سرحدی؟ میری استفسار میں اٹھی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر بولے، "جی ہاں، موصوف احمد فراز بننے سے پہلے اسی نام سے پہچانے جاتے تھے۔ اس سے پہلے کوئی اور نام بھی تھا، جو مجھے یاد نہیں!"

ستیہ پال آنند کے مضمون "مشفق خواجہ (مرحوم) کے ساتھ ایک دن" سے ایک اقتباس

انسان میں وہی خصوصیات آ جاتیں تو حسن عباسی آج دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہوتا۔

اس کا کہنا ہے کہ لڑکیاں اس کی شاعری پر مرتی ہیں، یہ الگ بات کہ اس پر مرنے والی لڑکیاں بھی شادی کسی اور سے ہی کرتی ہیں۔ ادبی تقریبات میں عموماً سب سے پیچھے والی لائن میں بیٹھتا ہے کہتا ہے وہاں بیٹھ کر آگے والوں کی چغلیاں کرنے میں جو مزا ہے وہ اور کسی کام میں نہیں۔ سب کو ایک آنکھ سے دیکھنے کا قائل ہے البتہ لڑکیوں کو دونوں آنکھیں کھول کر دیکھتا ہے۔ حسن عباسی نے سفرنامے لکھنے کا آغاز کیا تو معلوم ہوا اس کے ہاں بھی مستنصر حسین تارڑ والا معاملہ ہے۔ یعنی جہاں جاتا ہے لڑکیاں اس کے آگے پیچھے منڈلاتی پھرتی ہیں کبھی ہم تارڑ صاحب کے سفرنامے پڑھ کر سوچا کرتے تھے کہ بیرون ملک سفر کے دوران ان کے آگے پیچھے پھرنے والی لڑکیاں کیا اندھی تھیں؟ اب یہی حسن عباسی کے بارے میں سوچتے تھے لیکن ایک دن ان میں سے ایک لڑکی کی تصویر دیکھ لی تو حسن کی بات پر یقین آ گیا کیونکہ وہ لڑکی اس سے بھی زیادہ کالی تھی۔

حسن عباسی پاکستان سے باہر ہونے والے عالمی مشاعروں میں ضرور جاتا ہے کہتا ہے وہاں لڑکیاں مجھے چھیڑتی ہیں تو اچھا لگتا ہے،۔ اس کی قسمت ایسی ہے کہ بیرون ملک کسی حسینہ کو غزل سنانے لگے تو پاس سے کوئی کالا آ جاتا ہے جبکہ پاکستان میں ایسی جرات کرے تو اس کا اپنا سالا آ جاتا ہے۔ اصولوں کا اتنا پابند ہے کہ آوارہ گردی بھی ٹائم ٹیبل کے مطابق کرتا ہے، آوارہ گردی کرنے نکلے تو بھی اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کہاں کہاں جانا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی طرح گٹار بجانا سیکھ لے ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا گٹار ایک ایسا ساز ہے جو کسی لڑکی کو سکھانا ہو تو پہلے اسے گود میں بٹھانا پڑتا ہے ہم نے پوچھا پھر سیکھا کیوں نہیں تو معصومیت سے کہنے لگا: "سیکھنے تو گیا تھا لیکن وہاں اصلی خان صاحب بیٹھے سیکھا رہے تھے۔"

حسن عباسی کو لکھنے پڑھنے کا بہت شوق ہے شاید اسی لیے جسے عشقیہ خط لکھے اس کی گالیاں بھی شوق سے پڑھ لیتا ہے۔ حسن سے جب بھی ملیں اس کی گفتگو میں لڑکیوں کا ذکر ضرور ہوتا گا یہاں تک کہ لڑکیوں سے بھی لڑکیوں کی باتیں کر لیتا ہے۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کی زندگی میں لڑکیوں کی وہی اہمیت ہے جو کھانے میں نمک کی، لیکن ہمیں شاہ صاحب کی بات سے سخت اختلاف ہے کیونکہ کھانے میں نمک ضروری، ضرور ہوتا ہے لیکن کم کم بھی ہوتا ہے۔ اسے شاعرات وہی اچھی لگتی ہیں جو "بے وزن" ہوں کہتا ہے "وزن" میں خود پیدا کر لوں گا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ حسن عباسی کا شمار ان شاعروں میں کیا جاتا ہے جنہیں اوزان کا علم ہے اور وہ بے وزن شاعری کو باآسانی وزن میں کرنے پر قادر نظر آتے ہیں۔ حسن عباسی بہت اچھا دوست اور مخلص انسان ہے، آج کے دور میں ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جو مخلص بھی ہوں اور ادبی انداز میں گفتگو کرنے پر بھی قادر ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اسے ڈھیر ساری خوشیاں عطا فرمائے۔ شاہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے معاشقوں کو دیکھ کر بھی یہی لگتا ہے کہ اسے ہر سال کم از کم تین چار خوشیاں تو ضرور ملتی ہوں گی لیکن یہ بدنامی کے ڈر سے چھپا لیتا ہے۔

خادم حسین مجاہد

ارشاد العصر جعفری ادب کا آل راؤنڈر

ارشاد العصر جعفری ہمہ جہت تخلیق کار ہے ادب کا کوئی شعبہ ہو اس میں آپ کو اس کا نام ضرور ملے گا۔ یہ بیک وقت شاعر، افسانہ نگار، کہانی کار، ڈرامہ نگار، ناول نگار، بچوں کا ادیب، سفرنامہ نگار، مضمون نگار اور مزاح نگار ہے۔ اس سے بڑی بات یہ کہ اس نے ادب کے ہر شعبے میں اپنے آپ کو منوایا ہے۔ اس کو کسی ایک شعبے میں محدود کر کے لیبل نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں تخلیق کی حیرت انگیز قوت پائی جاتی ہے۔ اگر آپ اس کے تخلیقی میدانوں میں کارناموں پر نظر دوڑائیں تو انگشتِ بدنداں رہ جائیں کہ بطور معلم اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ناول، کہانیاں، افسانے، ڈرامے، غزل، نظم اور طنز و مزاح میں اپنا وافر حصہ ڈالنا کس طرح ممکن ہے

مجھے ارشاد کے ہاں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کی رفتار ہے، جتنی دیر میں عام رائٹر کوئی بڑی کہانی لکھتا ہے اتنی دیر میں یہ ناول لکھ لیتا ہے۔ اس تیز رفتاری کے باوجود تحریر کا معیار بھی متاثر نہیں ہوتا۔ یہ عام لوگوں کی طرح سوچ سوچ کر نہیں لکھتا بلکہ جب لکھنا شروع کرتا ہے تو اس کا قلم مشین کی طرح چلنے لگتا ہے۔ اور منزل پر پہنچ کر ہی دم لیتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تخلیقات اس پر بنی بنائی نازل ہوتی ہیں۔ یہ تو بس ان کو تحریر کرتا ہے۔ اس کے باوجود اس کی تحریر میں بے ربطی کہیں محسوس نہیں ہوتی اور نہ ہی معیار میں کوئی کمی ہوتی ہے۔

دوسری چیز جو ارشاد کی تحریر کی نمایاں خصوصیت ہے وہ ہے اس کا زبردست مشاہدہ، یہ مثالی یاداشت کا مالک ہے اور حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ کے ساتھ اس کی یاداشت تحریر میں نئے گل کھلاتی ہے۔ یہ برسوں پہلے کی باتوں کو جزئیات سمیت یاد رکھتا ہے اور جونہی موقع ملے انہیں پوری تفصیل کے ساتھ بیان بھی کر دیتا ہے۔ اس کی تحریر میں روانی اور سلاست ہے۔ یہ فطری تخلیق کار ہے اس لئے تحریر میں کبھی ثقیل اور اوق الفاظ استعال کر کے اسے بوجھل نہیں بناتا۔ اس کی تحریر دل سے نکلتی ہے اور دل میں اتر جاتی ہے۔
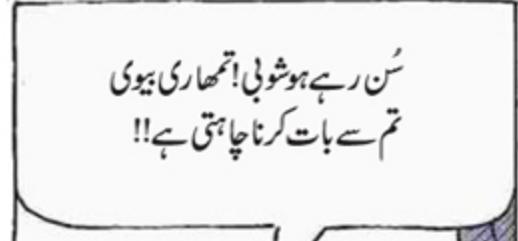
ارشاد بنیادی طور پر نثر نگار ہے اور نثر کے ہر شعبے میں اس کا کام نمایاں ہے۔ لیکن شاعری بھی یہ اسی رفتار سے کرتا ہے۔ شاعری میں اس کا پسندیدہ میدان نظم ہے۔ کئی بہت سی اچھی نظمیں اس کے کریڈٹ پر ہیں

چند سال پہلے اس نے عمران سیریز سے متعلقہ ناول لکھنا شروع کئے اور ایسے ماحول میں کہ جہاں قاری محض ایک آدھ نام سے ہی عمران سیریز پڑھنا چاہتے تھے ارشاد نے اپنی ایک پہچان بنائی۔ اور قارئین کو اپنے ناول کے انتظار کا عادی بنا دیا۔ اب جبکہ

چکی ہیں اور کئی منظرِ اشاعت ہیں۔ یہ ان کو عام اشاعت کے ساتھ ساتھ نیٹ پر بھی شائع کر رہا ہے اور اگر آپ اسے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس نے کبھی اپنی صحت پر اتنی توجہ نہیں دی جتنی ادب پر دیتا ہے۔ ادب پرور لوگ آج کے دور میں ملنے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہیں اس لئے ان کا دم غنیمت سمجھیں۔۔
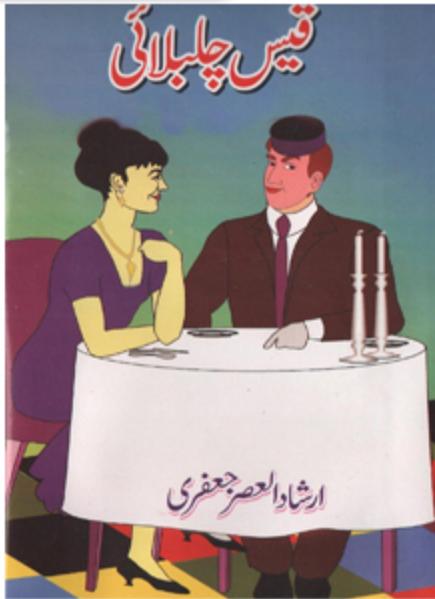
''میں بن جاتا ہوں پیر۔ مجھے کچھ تعویز لکھنے آتے ہیں کیونکہ میں نے دو سال پہلے پورا ایک مہینہ ایک پیر کے ساتھ گزارہ ہے۔ اس کا چیلا بن کر اور اس دوران میں نے اس کی حرکتیں بہت غور سے دیکھی تھیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ میں یہ کردار بخوبی نبھالوں گا۔ ہم یہاں سے نزلہ، زکام، کھانسی، بخار وغیرہ کی گولیاں پیس کر لئے چلیں گے اور انہیں چینی میں مکس کر کے اور چینی پر دم کر کے مریدوں کو دیں گے۔ ایک آدمی جاسوسی کرے گا۔ وہ گاؤں کے ہر گھر کا پتا کرے گا کہ اس گھر کے کیا مسائل ہیں۔ گاؤں کے کسی گھر کی جاسوسی کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ جاسوس زیرو زیرو ایٹ۔ وہ تمام تفصیل معہ گھر کے افراد کے کوائف مجھے بتائے گا۔ اس طرح میں ان کے مسائل سے آگاہ ہو جاؤں گا اور ان پر پریشر پڑے گا۔ اگر کوئی بندہ میرے لئے پریشانی کا باعث بنے گا تو اسے باقی ساتھیوں نے سنبھالنا ہوگا۔ انہیں سنبھالنے کے لئے ہمیں ماسک میک اپ کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب تم خوفناک ماسک میک اپ کر کے رات کے وقت کسی کو ڈرانے جاؤ گے تو معصوم اور سیدھے سادھے دیہاتی فوراً ڈر جائیں گے۔ اس کے علاوہ تم سب نے مختلف ذرائع سے اس گاؤں میں میری پبلسٹی کرنی ہے۔ ایک بار میں مشہور ہو جاؤں پھر نوٹ ہی نوٹ اور عیش ہی عیش۔''

ارشاد العصر جعفری کے ناول ''قیس چلبلائی'' سے ایک اقتباس

ملٹی میڈیا کے طوفان نے کتب بینی کو کم کر دیا ہے اور ادب رو بہ زوال ہے تو اس نے ادب کی ترویج و ترقی کے لئے ادبی ویب سائٹ قلم اردو بنائی ہے جس پر دنیا بھر کے شعراء اور ادباء کی تخلیقات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اپنی تحریریں اور ناول بھی شائع کر رہا ہے۔

ارشاد اردو زبان کے ساتھ ساتھ سرائیکی زبان میں بھی لکھتا ہے سرائیکی میں سیرت کی کتاب ''سوجھلا'' پر یہ صوبائی اور قومی ایوارڈ حاصل کر چکا ہے۔ یہ سرائیکی ڈرامے بھی لکھ رہا ہے اور اردو بھی۔۔۔ افسانہ اور کہانی ارشاد کا خصوصی میدان ہے۔ یہ کئی کہانیوں پر انعام اور ایوارڈ لے چکا ہے اس کی کئی کتب شائع ہو

نوید ظفر کیانی

قیس چلبلائی۔ ایک چلبلا ناول

یادش بخیر، غالباً اُس وقت میری عمر یہی کوئی بارہ برس تھی، میرے ایک دوست ضیا معین نے مجھے ایک رسالہ تھمایا اور پڑھنے کی پُر زور سفارش کی۔ اُس رسالے کا نام ''ماہنامہ قہقہہ'' تھا۔ یہ رسالہ اُردو طنز و مزاح کا عظیم مرقع تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب مجھ پر منکشف ہوا کہ پاکستان میں اُردو طنز و مزاح کا ایک مکمل رسالہ بھی کہیں شائع ہوتا ہے۔ اُس دن کے بعد میں ہر ماہ اپنے جیب خرچ سے یہ رسالہ خریدا کرتا تھا۔ بعد میں یہ رسالہ مختلف ناموں کی پٹڑی پر چلتا ہوا ''تیس روزہ چاند'' کے نام سے طلوع ہوا اور اِسی نام کے ساتھ پھر غروب بھی ہوا۔

''تیس روزہ چاند'' میں مجھے بہت سے ایسے اہلِ قلم نے متاثر کیا جو مسلسل کئی برسوں تک پوری تندہی سے لکھتے رہے اور ان میں بعض لکھنے والوں نے اِتنا اچھا مزاح تخلیق کیا کہ آج بھی چاند کے گزشتہ شمارے کھولتا ہوں تو جیسے کھو سا جاتا ہوں۔ اِنہیں میں ایک نام سید ارشاد العصر جعفری کا بھی ہے۔

ارشاد صاحب نے چاند میں خاصی چاند ماری کی۔ کم از کم مجھے ہر ماہ جن اصحاب کی تحریروں کا انتظار رہتا تھا اُن میں اِن کا نام بھی شامل تھا۔ اِنہوں نے چاند میں خاصے معرکے کی چیزیں لکھی ہیں۔ قیس چلبلائی اس کی ایک جھلک ہے۔ جیسا کہ کتاب کے آخر میں ارشاد صاحب نے ایک نوٹ میں واضح طور پر اس امر کی نشاندھی کی ہے کہ:

''1990 سے 1994 تک ہم میٹرک اور ایف اے کے سٹوڈنٹ تھے اسی زمانے میں ہم پاکستان بھر کے دیگر رسائل کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ماہنامے ''چاند'' میں بھی ذوق وشوق سے لکھتے تھے۔ یہ ناول انہی چھوٹی چھوٹی تحریروں کو ربط دے کر تیار کیا گیا ہے۔''

اگر چہ ارشاد صاحب نے ''قیس چلبلائی'' کی تجسیم میں بہت سی ایسی تحریروں کا مسالا گوندھ گوندھ کر ملایا ہے جو مختلف اوقات میں لکھی گئی ہیں اور جن کا ماحول بھی ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھا لیکن اُنہوں نے اِس مہارت سے اِن تمام مختلف تحریروں کو ایک لڑی میں پرویا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس ہار کے پروئے جانے والے موتی مختلف رنگوں کے حامل ہیں۔ مختلف ادوار میں لکھے گئے واقعات پر کسی ایک کردار کا کمبل ڈالنا ارشاد صاحب کا ہی کام ہے اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ کتاب پڑھتے ہوئے اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ لکھے جانے والے واقعات قیس چلبلائی کے کردار سے مبرا ہو کر لکھے گئے ہیں۔ میرے نزدیک یہ

بھی ارشادالعصر جعفری کا ایک منفرد کارنامہ ہے جو اُن کی ہم جہت شخصیت کا ایک اور دریافت کردہ رنگ ہے۔

اُردو ادب میں ایک مکمل مزاحیہ ناول کا لکھا جانا کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اس سے قبل بہت سے مزاحیہ ناول لکھے جا چکے ہیں۔ اُردو طنز و مزاح کے لئے ''اودھ پنچ'' کا دور ایک سنہرا دور ہے۔ اس دور میں اودھ پنچ کے لکھنے والوں نے بہت سے ایسے طویل ناول لکھے ہیں جو اودھ پنچ میں قسط وار شائع ہوئے ہیں اور پھر بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ منشی سجاد حسین کا ناول ''تمیز الدین'' تو ریختہ ڈاٹ کام پر بھی موجود ہے۔ بعدازاں بھی بہت سے ایسے شگفتہ بیان ناول نگار گزرے ہیں جنہیں بلا مبالغہ طنز و مزاح پر مبنی ناول نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں شوکت تھانوی کا ذکر نہ کیا جائے تو موضوع کے ساتھ سراسر ناانصافی ہو گی۔ شوکت تھانوی نے اسی (۸۰) کے قریب ناول تخلیق کئے ہیں جو بظاہر رومانوی تھے لیکن شوکت تھانوی کے شگفتہ اور برجستہ اندازِ بیان نے اِن ناولوں کو طنز و مزاح کی ایک ایسی طرزِ تفویض کی تھی جو اسے بلا مبالغہ فکاہیہ ناول کے درجے پر فائز کرتا ہے۔ شوکت تھانوی کا یہی شگفتہ اندازِ بیان اور برجستگی ہے جس کی بناء پر اُنہیں اُردو ادب کا ''پی جی ووڈ ہاؤس'' کہیں تو بیجا نہ ہو گا۔ اسی طرح ابنِ صفی (اسرار احمد، طغرل بوغا) کا ناول ''تزک دو پیازی'' بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ ابنِ صفی کے سری ادبی رجحانات کے برعکس یہ ناول مکمل طور پر فکاہیہ ہے۔ اس ناول میں ابنِ صفی صاحب کے فکاہی جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔

موجودہ دور میں گلِ نوخیز اختر کے ناول ''ٹائیں ٹائیں فش'' کو فخریہ طور پر فکاہی ناول کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ دراصل ارشادالعصر جعفری کا ناول ''قیس چلبلائی'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اِن دونوں ناولوں کے مصنفین میں ایک بات مشترک ہے کہ دونوں کا تعلق مرحوم ''چاند'' سے رہا ہے۔

''قیس چلبلائی'' کا نام ہی اپنے آپ پر ایک طنز ہے۔ قیس چلبلائی کا کردار نام کا تو قیس ہے اور آپ کو قیس کا احوال معلوم ہے کہ بی بی لیلیٰ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا، اور کوئی اور حُسن اُسے متاثر نہیں کر سکا تھا، جبکہ قیس چلبلائی صاحب ایک مکمل فلرٹ کردار ہے جس کا نظریۂ عشق اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ:

تُو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

ظالم کا بچہ تمام ناول کے دوران محبوباؤں کو یوں بدلتا رہا ہے جیسے شیر خوار بچہ سارا دن پوتڑے بدلتا رہتا ہے۔ یہ آج کل کے عشاق پر ایک بھرپور طنز بھی ہے۔ آجکل کے عاشق اگرچہ دعویٰ تو اس امر کا کر رہے ہوتے ہیں کہ اُنہیں ''لوریا (LOVERIA)'' نے کہیں کا نہیں چھوڑا، لیکن اُن کی نظریں ہمہ اوقات اس چکر میں کلی کلی منڈلاتی پھرتی ہیں کہ:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ ناول بہت سی خود مختار کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ناول کی ساری کہانیاں قیس چلبلائی کے کردار کے گرد بھنگڑا ڈالتی نظر آتی ہیں۔ قیس صاحب ہمہ اوقات راجہ اندر بنے بیٹھے نظر آتے ہیں اور لڑکیاں موصوف کے گرد یوں

> خوشی کی بات یہ ہے کہ ارشادالعصر جعفری نے مزاح کا انتخاب کیا۔ اور اس طبقاتی کشمکش اور نفسا نفسی کے دور میں جب انسانی ارتقاء کی ہر نہج ذہنی وسعتِ اخلاقی اقدار سیاسی اور سماجی آزادی اور دولت کے تصور نے ذوقِ مزاح پر بڑے نمایاں اثرات مرتب کئے ہیں کہ اب ہمارا مزاح یقینی طور پر گروہ کی ہنسی سے نکل کر فرد کی ہنسی تک جا پہنچا ہے۔ ایسے وقت میں قیس کا کردار ہمدردی محبت اور بے غرضی کا ہے جو تفریح کے ساتھ ایک مثبت پیغام بھی قاری تک پہنچا رہا ہے۔
>
> یقیناً آج مزاح ایک ایسے مقام پر جا پہنچا ہے جہاں اس نے یاس کے گلے میں بانہیں ڈال دی ہیں۔ اب جہاں یاس مزاح کو بے اختیار ہو کر قہقہے لگانے سے باز رکھتی ہے وہاں مزاح بھی یاس کو ہچکیوں میں تبدیل ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔
>
> ارم زہرا

قیس شروع سے آخر تک عشق کے شوق میں خوار ہوتا ہے۔ مگر ہر بار ناکام عشق لوٹتا ہے لیکن ہمت نہیں ہارتا۔ کیونکہ اس کا ارادہ عشق پختہ ہے۔ شوقِ عشق کے تمام مراحل ورسوم بھی فرض سمجھ کر ادا کرتا ہے۔ غیر ضروری جزیات سے پرہیز کیا گیا ہے۔ واقعات و کردار کی کڑیاں آپس میں ملی ہوئی ہیں۔ اور پلاٹ کو متاثر نہیں کرتی۔ مجموعی طور پر یہ صنف مزاح دشوار راستہ ہے۔ جو شاہراہِ عام بھی نہیں۔ لہٰذا یہ ارشاد کی کامیاب کاوش ہے۔

رابعہ الرّ باء

انڈی پڑتی ہیں جیسے پتنگیں بجلی کی تاروں میں پھنسی نظر آتی ہیں لیکن انجامِ کار قیس صاحب کی محبت کا ہما ''آفرین'' کے سر پر ہی بیٹھتا ہے۔ باقی سب لڑکیاں تو جیسے منزل نہیں بلکہ ''راہگذر'' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مصنف نے مختلف النوع کہانیوں کو اس خوبی سے ناول کی وحدت دی ہے کہ وہ ایک مکمل ناول لگتا ہے۔

''قیس چلبلائی'' کا آغاز ہی اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ در آتی ہے:

''آج دل نے ایک نئی فرمائش کر دی۔
''قیس صاحب۔ گالیاں تو سنیں''

دل کی اس فرمائش پر ہم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کوئی ایسی ہستی نظر آئے تو دل کی فرمائش پوری کی جائے لیکن ابھی اردگرد کوئی بھی ایسی ہستی موجود نہیں تھی۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے دل کی اس فرمائش پر آپ کے ماتھے پر سلوٹیں ابھر آئی ہیں اور شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ دل کی یہ کیسی فرمائش ہے۔ تو ہم آپ کو بتاتے چلیں کہ یہ ہمارا دل ہے۔ یعنی قیس چلبلائی۔ ایم ایس سی۔ سڑکیات۔ ڈی ایس سی۔ آواریات۔ یونیورسٹی آف عشقیات۔ یہ دل کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔ کسی بھی چیز کی فرمائش کر سکتا ہے۔''

بقول شاعر:

چاول کا ایک دانہ دیگوں کی مخبری ہے

ارشاد العصر جعفری کا یہی چُلبلا پن پورے ناول میں پھلجڑیاں چھوڑتا نظر آتا ہے۔

یہ ناول خالصاً تفریحی نقطہ نظر سے لکھا گیا ہے اور اسے اسی انداز میں لیا جانا چاہیئے، یہ میرا نقطۂ نظر ہے تاہم وہ اصحابِ دور اندیش و علم و فن جن کی آنکھوں میں قدرت نے ایکسٹرا لینز کی بصیرت فٹ کی ہوئی ہے اور جو بوسے میں بھی فلسفہ تلاش کر لیتے ہیں، انہیں اس ناول میں نصیحت و سبق حاصل ہو تو فدوی کچھ کہنے سے عاجز ہے۔

اِس ناول کا ماحول بھی ہمارے معاشرے کے عمومی رویے کے برعکس ہے۔ مصنف نے اس ناول میں تذکرہ کرنے کے لئے معاشرے کی اُن چیدہ چیدہ خصوصیات کا احاطہ کیا ہے جو مزاح نگاروں کا پسندیدہ موضوع رہی ہیں تاہم حقیقی معاشرے کی مکمل تصویر کا احاطہ نہیں کرتی۔ ناول کی تمام بیویاں شہ زور، تمام شوہر فرمانبردار اور مظلوم، تمام لڑکیاں مکار اور دھوکے باز اور تمام لڑکے دل پھینک اور ٹھرکی ہیں۔ اس رویے کو ہمارے معاشرے کا عمومی رویہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پنجاب اسمبلی سے ہمارے ملک کی مراعات یافتہ مخصوص کلاس کی نمائندہ خواتین ''حقوقِ نسواں ایکٹ'' کے نام پر ایسا قانون منظور کرانے میں کامیاب نہ ہو جاتیں اور وہ بھی اس انداز سے کہ سیاست کے شیر بھی اُن کے پیچھے اپنی اپنی دُمیں ہلاتے پھریں۔ اس ایکٹ کا انجام تادمِ تحریر دو تین طلاقوں پر منتج ہوا ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس ناول کو تفریحی نقطۂ نظر سے پڑھا جانا چاہیئے اور اسی انداز میں لیا جانا چاہیئے۔

ارشاد العصر جعفری نے اس ناول کی اُٹھان اس خوبصورتی سے رکھی ہے کہ دیکھا چاہیئے۔ واقعات کی رنگین بیانی کے ساتھ ساتھ مکالمات میں برجستگی اور بیساختہ پن اسے نہایت دلچسپ بنائے رکھتا ہے اور یہ اندازِ تحریر اول تا آخر برقرار رکھا گیا ہے۔ ذرا ناول کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

''اچھا جناب۔ اب مجھے اجازت دیں''...... ہمارا نام رجسٹر

پر درج ہونے کے بعد ابا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔قیس کی ہڈیاں ہماری اور کھال آپ کی۔جس قدر چاہیں اس کی چٹنی لگا ئیں''......انہوں نے کہا۔

''ابا جی۔گوشت کس کے حصے میں جائے گا''......ہم نے نہایت معصومیت سے پوچھا،انہوں نے ہمیں گھور کر دیکھا۔

''خاموش۔ نالائق گدھا''...... ابا نے ہمیں ڈانٹ دیا۔

دراصل ابھی چند دن پہلے گھر میں بکرا ذبح ہوا تھا تو ابا جی نے ہڈیاں محلے میں تقسیم کر دی تھیں۔گوشت گھر میں رکھ لیا تھا اور کھال ایک ہزار میں بیچ دی تھی۔

''ابا جی۔ استاد صاحب سے ہماری کھال کے پیسے تو لیتے جائیں''......ابا جانے لگے تو ہم نے پیچھے سے انہیں آواز دی۔ابا رکے،انہوں نے مڑ کر ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا کہ ہم فوراً ہی سہم گئے اور ہم نے گردن جھکالی۔''

''قیس چلبلائی''طنز و ظرافت کا حسین مرقع ہے۔اس میں بیساختہ مسکراہٹ بکھرنے والی سچویشن بھی ہے اور مکالمات کی بیساختگی اور لطافت بھی۔قیس چلبلائی کا یہ اقتباس اسی پہلو کی عکاسی کرتا ہے۔

''قیس۔تم کتنے بہادر ہو؟''......نائلہ نے پوچھا۔

''بہت''......ہم نے اکڑ کر کہا۔

''ویری گڈ۔پھر کام بن گیا۔میں نے جن قابو کرنے کا ایک آسان طریقہ حاصل کیا ہے۔شرط صرف اتنی ہے کہ انسان بہادر اور ذہین ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم جن قابو کر لو گے''...... نائلہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''معاف کرنا۔اگر جن قابو کرنا ہے تو پھر میں بہادر نہیں ہوں بلکہ مجھ جیسا بزدل پورے ملک میں نہیں ہوگا''......ہم نے منہ بنا کر کہا۔

''قیس ڈیئر۔تم بزدل نہیں ہو۔ایک دم بہادر ہو۔ بھلا ایک بہادر بیوی کا شوہر بزدل کیسے ہوسکتا ہے''۔۔۔نائلہ نے کہا۔

''میں آج تک تمہیں قابو نہیں کر سکا جن کیسے قابو کر سکتا ہوں''...... ہم نے بدستور منہ بناتے ہوئے کہا۔

''بیوی کو قابو کرنا مشکل ہے۔لیکن جن قابو کرنا بہت آسان ہے۔تم جن قابو کر لو گے۔ہاں''......اس نے کہا۔''

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک فکاہی تخلیق کار ہو اور طنز کی چٹکیاں نہ بھرے۔معاشرے کی غیر ہمواری کی نشاندھی کرنا ہر فکاہی ادیب و شاعر کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ہنسی ہنسی میں کوئی ایسی بات کہہ جانا جس سے معاشرے کی ناہموارکی طرف اشارہ بھی ہوجائے اور تلخ بیانی کا ارتکاب بھی نہ ہو، ایک اچھے مزاح نگار کی امتیازی خصوصیت ہوتی ہے۔ ارشاد العصر میں یہ وصف بدرجہ اتم موجود ہے۔وہ باتوں ہی باتوں میں طنز کی ایسے ایسے نشتر چبھو جاتے ہیں کہ دیکھا چاہیئے۔

ایک آدمی ہماری طرف بڑھا۔

''ابے لڑکیوں کو چھیڑتا ہے'' اس نے ہماری کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔کالو اسی لمحے کھسک گئی جبکہ ایک نوجوان آگے بڑھا۔

''ٹھیک ہے۔لڑکیوں کو چھیڑنا لڑکوں کا حق ہے۔مگر تمہاری آنکھوں پر کیسی پٹی بندھی ہے کہ تمہیں لڑکی اور افریقن بھینس میں فرق ہی نظر نہیں آیا'' نوجوان نے ہمیں مکا مارتے ہوئے کہا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔یہ ہے۔تمہارا معیار۔اسی معیار پر پڑے گی تمہیں مار'' ایک اور نوجوان نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''آئندہ چھیڑنا ہو تو کسی حسین و جمیل لڑکی کو چھیڑنا۔تاکہ مار بھی پڑے تو افسوس نہ ہو۔اب گھر کی طرف دوڑ لگاؤ ورنہ حقیقتاً بہت مار پڑے گی'' ایک اور نوجوان نے نصیحت کی تو ہم وہاں سے کھسکنے لگے۔

''قیس چلبلائی'' سے ایک اقتباس

لڑکوں کی باتیں

ایک بار ہیا اپنے ہی جیسی تیز طرار لڑکی سے باتیں کر رہی تھی کہ لڑکی نے اس سے پوچھا۔

"کالو۔ یہ بتا یہ لڑکے اپنی محفلوں میں کسی قسم کی باتیں کرتے ہیں"...... حالانکہ اس سوال کا جواب تو اسے بھی معلوم تھا لیکن اس نے انجان اور معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔

"لو۔ تمہیں نہیں پتا کہ یہ لڑکے آپس میں کس قسم کی باتیں کرتے ہیں"...... کالو نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تیری قسم۔ مجھے تو نہیں پتا"...... لڑکی نے نہایت ہی معصوم سے لہجے میں کالو کی قسم کھاتے ہوئے کہا۔

"ارے بیوقوف، پاگل۔ یہ لڑکے بھی اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں جس طرح کی ہم کرتی ہیں"...... کالو نے کہا۔

"ہائے اللہ۔ یہ لڑکے کتنے بے شرم ہوتے ہیں کالو"...... لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا اور دوپٹے کا پلو دانتوں میں لے لیا۔

"قیس چلبلائی" سے ایک اقتباس

"مہربانی پیر سائیں۔ مہربانی۔ میں عمر بھر آپ کی باندی بن کر رہوں گی۔ بس اس کے ظلم و ستم بند کرا دیں"۔۔۔ اس نے اس انداز میں کہا جیسے اس کا شوہر ظلم و ستم کرتا بھی ہمارے حکم سے ہو۔ اپنی بات مکمل کرنے کے بعد اس نے ہمارے پاؤں دبانا شروع کر دیئے تو ہم نے اپنی ٹانگیں مزید پھیلا دیں۔ شریفن بی بی زور زور سے ہمارے پاؤں دبانے لگی۔ ہم سوچنے لگے کہ اگر وہ اِسی جوش و خروش سے اپنے شوہر کی خدمت کرے تو اس کا شوہر بھی اس پر تشدد نہ کرے۔"

اُن کے طنز کا دائرۂ کار معاشرے کے دیگر شعبوں میں بھی چک پھیریاں مارتا پھرتا ہے۔ اس ناول میں کہیں کہیں ایسے کردار بھی ملتے ہیں جو دیگر شعبوں کے بھی نمائندہ کردار ہیں مثلاً "چاکر خان"۔ چاکر خان کا نام بھی اس پر ایک گہرا طنز ہے۔ سیاستدانوں اپنے آپ کو "عوام کا خادم" کہتے ہیں لیکن اُن کی شان ایسی ہے کہ وہ خود کو جن کا خادم کہتے ہیں اُن سے کوئی اشرف مخلوق نظر آتے ہیں۔ اُن کی شان و شوکت اُن کی گرگٹ صفتی کی مرہونِ منت ہے۔ ناول کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

"نہیں جناب۔ میں کتاب کی اشاعت کے لئے پریشان نہیں ہوں۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں آپ مجھ سے ایک سو ایک مرتبہ وعدہ کر چکے ہیں اور عوام کی طرح مجھے بھی آپ کے وعدے پر اعتبار ہے۔ کتاب کبھی نہ کبھی تو شائع ہو ہی جائے گی"۔۔۔ ہم نے معنی خیز انداز میں کہا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہماری بات سن کر چاکر خان کے چہرے پر شرمندگی ابھرے گی مگر وہ سیاست دان ہی کیا جو کسی کے سامنے شرمسار ہو جائے۔"

ارشاد العصر جعفری ناول کے میدان کا پرانا کھلاڑی ہے۔ اس وقت تک اُن کی چالیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں بلکہ گورنمنٹ آف پنجاب نے تو اُن کی ایک کتاب "سوجھلا" پر ۲۰۱۴ء کا بہترین مصنف کا ایوارڈ بھی دے رکھا ہے۔ بیک وقت مزاح؛ شاعری؛ افسانہ اور جاسوسی کے میدان میں طبع آزمائی کر رہا ہے۔ کئی ڈرامے بھی پی ٹی وی سے نشر ہو چکے ہیں۔ کسی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرنا بھی صدقۂ جاریہ ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ دیگر میدانِ ادب کی طرح طنز و مزاح کے میدان میں بھی اپنی شہسواری جاری رکھے اور اُس کی فتوحات دراز سے دراز تر ہوتا رہے۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ میں تمہیں اپنا فیل ہونے کا ریکارڈ نہیں توڑنے دوں گا۔ اگر تم اس مرتبہ فیل ہو گئے تو میں تمہاری شادی کر دوں گا۔ پھر تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو میرا ہوتا ہے"...... ابا نے ہمیں ایسے دھمکی دی جیسے امریکہ، لیبیا، ایران اور جنوبی کوریا کو دھمکیاں دیتا ہے۔ امریکہ کی دھمکیوں سے وہ تو خوفزدہ نہیں ہوتے لیکن ہمارے تو اوسان خطا ہو گئے تھے۔ شادی کا تصور ہی ہماری روح کو لرزہ دینے کے لئے کافی تھا۔

"قیس چلبلائی" سے ایک اقتباس

ارشاد العصر جعفری

قیس چلبلائی اور ایک شاعر

قیس چلبلائی سے ایک اقتباس

ہمارے پیپرز صحیح نہیں ہوئے تھے اس لئے ہمیں معلوم تھا کہ رزلٹ حسب سابق ہی ہوگا۔

اب ہمیں رات دن پریشانی رہتی تھی۔ اسی پریشانی کے عالم میں ہماری شیو بڑھ چکی تھی۔ کپڑے میلے کچیلے ہو چکے تھے مگر انہیں بدلنے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ اسی پریشانی میں ہم مجنوں روڈ سے گزر رہے تھے کہ اچانک پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔

''اجی سنیئے'' ۔۔۔ ہم نے رک کر پیچھے دیکھا۔ ایک بزرگ ٹائپ انسان کھڑے تھے۔ حلیہ ان کا ہم سے بھی بدتر نظر آ رہا تھا۔

''مجھ سے کچھ فرمایا آپ نے'' ہم نے ان سے پوچھا۔

''واہ، واہ کیا بات ہے آپ کی۔ کیا ادبی لب ولہجہ ہے۔ پہلے تو مجھے شک تھا مگر اب سو فیصد یقین ہوگیا ہے کہ آپ ہمارے ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں'' وکھری ٹائپ بزرگ نے ایک دم خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''جی ۔۔۔ قبیلہ'' ہم نے حیران ہوکر کہا۔

''جی ہاں۔ اپنا قبیلہ، تو پھر ہو جائے ایک غزل'' بزرگ نے اپنی دھن میں بولتے ہوئے کہا۔ ہماری حیرت کو انہوں نے نظر انداز کردیا۔

''غزل ۔۔۔ قبیلہ؟ بزرگوار! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا'' ہماری حیرت ابھی تک برقرار تھی۔

''یہ اڑی اڑی رنگت، یہ الجھے ہوئے بال، یہ پریشان آنکھیں، یہ میلے کچیلے کپڑے، ماتھے پر یہ تفکرات۔ ان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یا تو آپ کسی مقطع پر اڑ رہے ہیں یا کسی بحر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ، ماشاء اللہ اتنی سی عمر اور اتنا بڑا شاعر'' بزرگوار نے کہا تو ہم طویل سانس لے کر رہ گئے۔ ہماری حالت کو دیکھ کر انہیں یہ غلط فہمی ہوگئی تھی کہ ہم شاعر ہیں۔

''نہیں جناب۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شاعر نہیں ہوں'' ہم نے ان کی غلط فہمی دور کرنا چاہی۔

''اس حلیئے کا آدمی یا تو شاعر ہو سکتا ہے یا جہاز۔ ماشاء اللہ آپ کا انداز تکلم بتا رہا ہے کہ آپ جہاز تو نہیں ہیں، شاعر ہی ہو سکتے ہیں۔ دراصل عظیم شاعر کسر نفسی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مرنے کے بعد دنیا کو پتا چلتا ہے کہ کتنا عظیم شاعر اس دنیا سے چل بسا۔ دراصل یہ دنیا جیتے جاگتے انسان کی قدر نہیں کرتی۔ جب انسان اس دنیا سے ۔۔۔'' ابھی وہ نجانے کتنی طویل تقریر کرتے کہ ہم نے انہیں ٹوک دیا۔

''جی جی۔ میں آپ کی بات سمجھ چکا ہوں۔ آپ بجا فرما رہے ہیں'' ہم نے بیزار سے لہجے میں کہا۔

''تو پھر ہو جائے ایک غزل'' انہوں نے کہا۔

''نہیں جی۔ اس وقت نہیں۔ پھر کبھی سہی'' ہم نے ان سے

پیچھا چھڑانے کے لئے کہا اور ایک قدم آگے بڑھایا۔ انہوں نے بھی ہمارے ساتھ ہی قدم بڑھایا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ آسانی سے جان چھوڑنے والے نہیں۔

''دیکھیئے صاحب۔ پہلے آپ اپنی غزل سنا لیجئے۔ میں اپنا تازہ کلام بعد میں سنالوں گا'' بزرگ شاعر کا انداز رشوت دینے والا تھا۔

''عالیجاہ! میں نے عرض کیا نا کہ پھر کسی دن سہی'' ہم نے سخت بیزار لہجے میں کہا۔

''اچھا چلیئے۔ آپ ہی اپنا کلام سنا لیجئے۔ میں اپنا کلام سنانے کی ضد نہیں کروں گا'' اُنہوں نے سخاوت کرتے ہوئے کہا۔

''قبلہ۔ میں نے کہا تو ہے کہ پھر کبھی سہی۔ آخر آپ سمجھتے کیوں نہیں'' اس مرتبہ ہم نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

''اجی! آپ کچھ بھی کہیں۔ ہم نے آپ کا پیچھا نہیں چھوڑنا۔ آپ کے کلام سے محروم رہ کر ہم گنہگار ہو جائیں گے۔ ہمیں گنہگار مت کیجئے'' بزرگ شاعر مکمل طور پر کمبل ہو چکے تھے اور ہمیں ان سے پیچھا چھڑانے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک ہی ایک خیال برق کی طرح ہمارے ذہن میں کوندا۔

''اعلیٰ حضرت۔ ایسا کرتے ہیں کہ دوڑ لگاتے ہیں۔ جو اس دوڑ میں جیت گیا وہ اپنا تازہ کلام سنائے گا'' ہم نے کہا۔

''میاں! آپ نوجوان ہیں اور میں بوڑھا۔ آپ کا اور میرا کیا مقابلہ'' بزرگ شاعر نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے تو نہیں لگ رہا کہ آپ بوڑھے ہیں۔ آپ تو آج کل کے نوجوانوں سے بہت بہتر ہیں۔ آج کے نوجوان کو تو کماد اور زہریلی دواؤں نے تباہ کیا ہوا ہے۔ باقی رہی سہی کسر وہ خود بھی پوری کر لیتے ہیں'' ہم نے کہا۔

''فرماتے تو آپ درست ہیں۔ چلیئے ہمیں منظور ہے'' بزرگ شاعر نے اپنا کلام سنانے کے شوق میں فوراً ہامی بھر لی جبکہ ہماری آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہو چکی تھی۔

''ریڈی۔ ون، ٹو، تھری۔۔۔گو'' ہم نے کہا اور پھر دوڑنا شروع کر دیا۔ ہم نے جان بوجھ کر اپنی رفتار آہستہ رکھی۔ بزرگ

تعلیم اور وزیرِ تعلیم

''لوگوں کا خیال غلط ہے کہ ہم سیاست دان فریبی ہیں۔ ہم سے بڑھ کر فریبی تو ہماری بیگمات ہوتی ہیں۔ جب میں وزیرِ تعلیم تھا تو''۔۔۔ چاکر خان نجانے کیا کہنے والے تھے کہ ہم نے ان کی بات کاٹ دی۔

''ہاں۔ یہ کیا قصہ تھا کہ آپ وزیرِ تعلیم بن گئے۔ حالانکہ آپ انگوٹھا چھاپ ہیں''۔۔۔ ہم نے پوچھا۔

''وزیر بننے کے لئے تعلیم ضروری نہیں ہے بھائی۔ تعلیم تو آپ جیسے غریب، غربا کے لئے ضروری ہے کہ آدھی عمر تعلیم حاصل کرنے میں گزار دیں اور بقیہ آدھی نوکری کی تلاش میں۔ ہم سکول و کالج جا کر کیوں اپنا قیمتی وقت ضائع کریں''۔۔۔ چاکر خان نے نخوت بھرے لہجے میں کہا۔

''قیس چلبلائی'' سے ایک اقتباس

شاعر ہم سے آگے نکل گئے۔ ساتھ سے گزرنے والے لوگ حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔

''پکڑو۔۔۔ پکڑو۔۔۔ چور۔۔۔ چور۔۔۔ چور'' ہم نے ایک دم شور مچا دیا۔ بزرگ کچھ آگے جا چکے تھے اس لئے ہماری آواز ان تک نہ پہنچی البتہ چند لوگ ہماری آواز سن کر ہمارے ساتھ شامل ہو گئے اور انہوں نے بھی چور، چور کی آوازیں لگانا شروع کر دی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ بزرگ کے پیچھے دوڑنے لگے۔ بزرگ شاعر نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور بہت سے لوگوں کو اپنے پیچھے دوڑتا دیکھ کر ان میں مزید جوش پیدا ہو گیا اور انہوں نے اپنی رفتار بڑھا لی۔ اب بہت سے لوگ شور مچا رہے تھے۔ ایک مجمع تھا جو بزرگ شاعر کے پیچھے بھاگ رہا تھا اور پھر چند ہی لمحوں بعد کسی نوجوان نے انہیں پکڑ لیا جبکہ ہم وہاں سے قریبی گلی میں گھس چکے تھے۔

تنبیہ

دوسری شادی چاہنے والے بیتاب شوہروں کے نام

پروین شاکر کی غزل پر تضمین

جلایا تُو نے تو تجھ کو بھی میں جلاؤں گی
توے سے دل پہ ترے روٹیاں پکاؤں گی
میں اپنے سارے ہنر تجھ پہ آزماؤں گی
میں سارے راز ترے کھول کر بتاؤں گی
میں ناچ ننگی کا ایسا تجھے نچاؤں گی
کچہری تھانے تجھے رات دن پھراؤں گی
میں اپنے ہاتھ سے قیمہ ترا بناؤں گی
تو لایا گر نئی دلہن تو پھر بتاؤں گی

بنائے گا تو اگر اس طرح سے گھر دو دو
تجھے پھر اس میں بنانے پڑیں گے در دو دو
اگر ہے شوق تو لے آ ذرا جگر دو دو
پھر اس کے بعد مزے سے تُو کھا ثمر دو دو
یہ کیا کہ ایک ہو تُو ، بیویاں ہوں پر دو دو
بگڑ گئیں جو ، تو آئے گا پھر نظر دو دو
میں اُس سے مل کے ستم تجھ پہ خوب ڈھاؤں گی
تو لایا گر نئی دلہن تو پھر بتاؤں گی

سہولیات تو دیتا نہیں ہے بنیادی
تُلا ہوا ہے کہ ہو میری خانہ بربادی
زبانِ حال سے سارا ہی گھر ہے فریادی
بڑھانا چاہتا ہے کیوں جہاں کی آبادی
یہ شادی ہے یہ کوئی تپ نہیں ہے میعادی
بخار اترا تو بس کرلی دوسری شادی
میں گھر گرہستی کا تجھکو سبق پڑھاؤں گی
تو لایا گر نئی دلہن تو پھر بتاؤں گی

مرے ''فگر'' پہ نہ جا ، تو سمجھ نہ مجھ کو نحیف
غلط ہے سوچ تری ، ہوگئی ہوں میں بھی ضعیف
شریف ہوں مگر اتنی بھی اب نہیں ہوں شریف
بلک کے روئے گا لگ جائے گی جو ضربِ خفیف
یہ میرا گھر ہے ، نہ کر اس میں تُو کوئی تحریف
ہُوں تیری فوج کی اب بھی کمانڈر انچیف
ترے ہی بچوں سے درگت تری بناؤں گی
تو لایا گر نئی دلہن تو پھر بتاؤں گی

تُو عقلِ کل ہے اگر ، میں بھی ہوں بہت ہی ذہین
اور اپنے جیسوں میں مجھ سا نہیں ہے کوئی حسین
پسند تجھ کو ہے شہنائی گر تو مجھ کو ہے بین
نیا بیاہ رچا کر نہ کر مری توہین
تو میرے مصرع پہ اے جانِ من نہ کر تضمین
میں نیک ہوں یا نہ ہوں پر نہیں ہوں میں پروین
کہ اپنے ہاتھ سے تیری دلہن سجاؤں گی
تو لایا گر نئی دلہن تو پھر بتاؤں گی

ڈاکٹر سید مظہر عباس رضوی

اعلان

دوستو!

آپ سب سے تنگ آ کر

اپنے سینے پہ لاد کر پتھر

آج اعلان کر رہا ہوں میں

فیس بک چھوڑ کر چلا ہوں میں

منقطع رابطہ رہے گا مرا

سب کو چہرہ نہ اب دِکھے گا مرا

اِس حقیقت میں اب نہیں ہے شک

اپنے اس خاکسار بھائی سے

مل سکو گے نہ آٹھ منٹوں تک

میں ہوا بن کے لوٹتا ہوں بس

ڈاکٹر عزیزؔ فیصل

پاکستانی کرکٹر

احمد علوی

خدا کے فضل سے ہم میچ سارے ہار جاتے ہیں
کھلاڑی کیا اناڑی ہم سے بازی مار جاتے ہیں
بڑی مشکل سے اب میدان میں زیرو بناتے ہیں
عوام الپاک ہم کو اِس لئے ہیرو بناتے ہیں

جہاں میں ہم سے زندہ ہے روایت یہ پٹھانوں کی
ہمیں عزت بہت پیاری ہے اپنے میزبانوں کی
ہوا نہ آج تک ہم پر کسی بھی فین کو ڈاؤٹ
کوئی آؤٹ نہ کر پائے تو ہو جاتے ہیں رن آؤٹ

لپک لیتے ہیں شاہد آفریدی کا ہر اک چھکا
سلیقہ ہند کو آتا نہیں مہماں نوازی کا
پرائی بال کا ہم تو کبھی پیچھا نہیں کرتے
کبھی ہم باؤنڈری پر بال کو روکا نہیں کرتے

کسی بھی بال کو ہم احتراماً کچھ نہیں کہتے
یہ اپنے بھائی ہیں اِن کو مذاقاً کچھ نہیں کہتے
غلط ہوتی ہیں سب خبریں ہمارے سولڈ ہونے کی
ہمیں جلدی بہت ہوتی ہے یارو بولڈ ہونے کی

کبھی اکّے نکلتے تھے کبھی چوکے نکلتے تھے
بُرا وہ وقت تھا جب بیٹ سے چھکے نکلتے تھے
ہمیں دھونی سے پٹنے میں بڑا ہی لطف آتا ہے
بُرائی کیا ہے پٹنے میں بڑے بھائی کا ناتا ہے

پڑھانے کے سوا ہر کام کرنے کو میں حاضر ہوں
پڑھانے کو اگر بھیجو گے تو آنے سے قاصر ہوں

کہیں تنبو لگانا ہو کسی شادی میں جانا ہو
کوئی عمرے کی دعوت ہو کہیں گانا بجانا ہو
کسی دعوت میں جانا ہو کسی کو جا کے لانا ہو
عقیقہ ہو کسی کا یا کہیں ختنہ کرانا ہو

پڑھانے کے سوا ہر کام کرنے کو میں حاضر ہوں

مرا لمڈا اسمبلی میں تلاوت کرنے جائے گا
مجھے جانا پڑے گا آج لازم ہے مرا جانا
مری ماسی کے نانا کی بھتیجی کا نکاح ٹھہرا
پڑھانا کیا ضروری تھا؟؟ وہاں جانا ضروری تھا!

پڑھانے کے سوا ہر کام کرنے کو میں حاضر ہوں

سیکرٹری باپ ہے میرا ڈریکٹر میرا ماما ہے
ایچ ایم اسکول کا میرے مری بیگم کا چاچا ہے
کوئی چھیڑے تو مجھ کو میں مزا اس کو چکھا دوں گا
کلیکٹر میرے گاؤں کا ہے اور رشتے میں تایا ہے

پڑھانے کے سوا ہر کام کرنے کو میں حاضر ہوں

سویرے نو بجے آتا ہے پانی بھی ضروری ہے
قصد شاپنگ کا سو خدمتِ بیوی ضروری ہے
ہماری ساس کی برسی ہے کل آؤں گا میں کیسے
مسلماں ہوں میں، برسی کی بھی تیاری ضروری ہے

پڑھانے کے سوا ہر کام کرنے کو میں حاضر ہوں

ہمیشہ ٹوٹ پڑتا ہوں

منیر نیازی سے معذرت کے ساتھ

محمد خلیل الرحمٰن

ہمیشہ پیٹ بھر کھاتا ہوں میں، ہر ایک دعوت میں
ہمیشہ ٹوٹ پڑتا ہوں

کسی شادی کی دعوت ہو، ولیمے کا وہ کھانا ہو
عشائیہ ہو ، ظہرانا ہو یا ویسے ہی جانا ہو
ہمیشہ پیٹ بھر کھاتا ہوں میں، ہر ایک دعوت میں
ہمیشہ ٹوٹ پڑتا ہوں

کسی موٹے سے بھوکے کو کبھی نیچا دِکھانا ہو
کبھی اپنے کسی مہمان کو جی بھر ستانا ہو
ہمیشہ پیٹ بھر کھاتا ہوں میں، ہر ایک دعوت میں
ہمیشہ ٹوٹ پڑتا ہوں

کبھی بیوی کے ساتھ، اپنے مجھے سسرال جانا ہو
وہاں مرغِ مسلم ہو، کوئی اچھا سا کھانا ہو
ہمیشہ پیٹ بھر کھاتا ہوں میں، ہر ایک دعوت میں
ہمیشہ ٹوٹ پڑتا ہوں

پروگرامر کا خواب

(گلزار سے معذرت کے ساتھ)

صبح صبح اِک Email کی دستک پر Computer کھولا

دیکھا تو Testers نے کچھ Bugs بھیجے تھے

صورت سے منحوس تھے سارے

Description سارے سنے سنائے تھے

Code کھولا، Debugger لگائے

Process ساتھ Attach کروائے

ساتھ ہی کہیں کہیں، کچھ موٹے موٹے MessageBox لگائے

Description میں وہ Bug میرے

کچھ ان دیکھے Environments کی Log لائے تھے

کوڈ لکھا، Compile کیا

پھر دیکھا تو Semicolon نہیں لگا تھا

آنکھ کھلی تو دیکھا کمپیوٹر پر کوئی نہیں تھا

Mouse ہلا کر دیکھا تو AutoLock ابھی ہوا نہیں تھا

خواب تھا شاید

خواب ہی ہوگا

میٹنگ میں کل رات سنا ہے ہوئی تھی گوشالی

میٹنگ میں کل رات سنا ہے

کچھ Bugs کی فہرست بنی ہے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

اگر خدا پیدا کر دیتا لڑکیوں کا بحران
نہ کوئی کسی کی جانو ہوتی نہ کوئی کسی کی جان
نہ کوئی کسی کو لفٹ کراتی، نہ جلوے دکھلاتی
نہ کوئی اُن کو دیکھ کے بنتا شاہ رُخ اور سلمان
لڑکیوں کے کالج کی سڑکیں ہو جاتیں سنسان
نہ کوئی کسی کے پیچھے جاتا، نہ ہوتا قربان
بازاروں کی رونق بھی پڑ جاتی ساری ماند
نہ کوئی لڑکیاں دیکھنے جاتا، نہ ہوتا ہلکان

لٹریچر اور ادب کی دنیا ہو جاتی ناپید
نہ کوئی شاعر شاعری کرتا نہ بنتے دیوان
نہ کوئی کسی کو میسج کرتا، نہ کوئی کرتا فون
نہ کوئی کسی سے سینڈل کھاتا نہ ہوتا پریشان
ہوتا نہ جب لڑکوں کی دلچسپی کا سامان
لڑکوں کا بھی پڑھنے کی جانب ہوتا رجحان
لڑکے پانچ نمازیں پڑھتے اور پڑھتے قرآن
سیدھے جنت میں جاتے سارے دل پھینک جوان

لڑکی نہ ہوتی تو دنیا ہو جاتی بے رنگ
ہر جانب پیدا ہو جاتا چاہت کا بحران
شکر خدا کا لڑکوں پر ہے یہ کتنا احسان
لڑکی پیدا کر دی رب نے ہر دل کا ارمان

شادی مبارک

اک روز ہم بھی دعوت اڑانے چلے گئے
وعدہ جو کر لیا تھا نبھانے چلے گئے
بیگم کی بات ہم نہیں مانے چلے گئے
اور فیملی کے ساتھ میں کھانے چلے گئے
ٹائم کے ہیر پھیر نے سب کو سکھا دیا
کھانے کے انتظار نے ہم کو پکا دیا

آنتیں شکم میں کرنے لگی تھیں اتھل پتھل
میزوں پہ تھی سجی ہوئی ہر چیز بر محل
بریانی قورمہ وہیں روٹی اغل بغل
چٹنی اچار رائتہ اور چاٹ کے تھے پھل
اسٹال میں سجی ہوئی ہر شہ عظیم تھی
کوفی تھی کولڈرنک تھی آئسکریم تھی

کھانا شروع کرنے کا اعلان جب ہوا
ہر سمت جیسے حشر کا عالم ہوا بپا
کیسی سلاد کس کا اچار اور رائتہ
اِک شخص نے پلیٹ میں ڈونگا پلٹ لیا
ہم یوں بھٹک رہے تھے کہ جیسے حقیر ہوں
خالی پلیٹ ساتھ تھی جیسے فقیر ہوں

بیگم سے تھا بلند کوئی قد میں پست تھا
فرہاد کا چچا کوئی مجنوں پرست تھا
جوشِ شباب میں کوئی مغرور و مست تھا
اتنا ضعیف کوئی کہ لاٹھی بدست تھا
بھگدڑ میں کون دیتا بھلا پھر کسی کا ساتھ
ڈونگہ کسی ہاتھ تھا چمچہ کسی کے ہاتھ

کچھ عورتوں کے ساتھ میں بچے تھے چلبلے
کس باپ کے سپوت تھے کس گود کے پلے
نو دس برس کے سن میں یہ ہمت یہ ولولے
کس کی مجال ان سے کوئی ڈونگا چھین لے
مرغے کی ٹانگ پھینک دی آدھی چھوڑ کر
بریانی پر جھپٹ پڑے روٹی کو چھوڑ کر
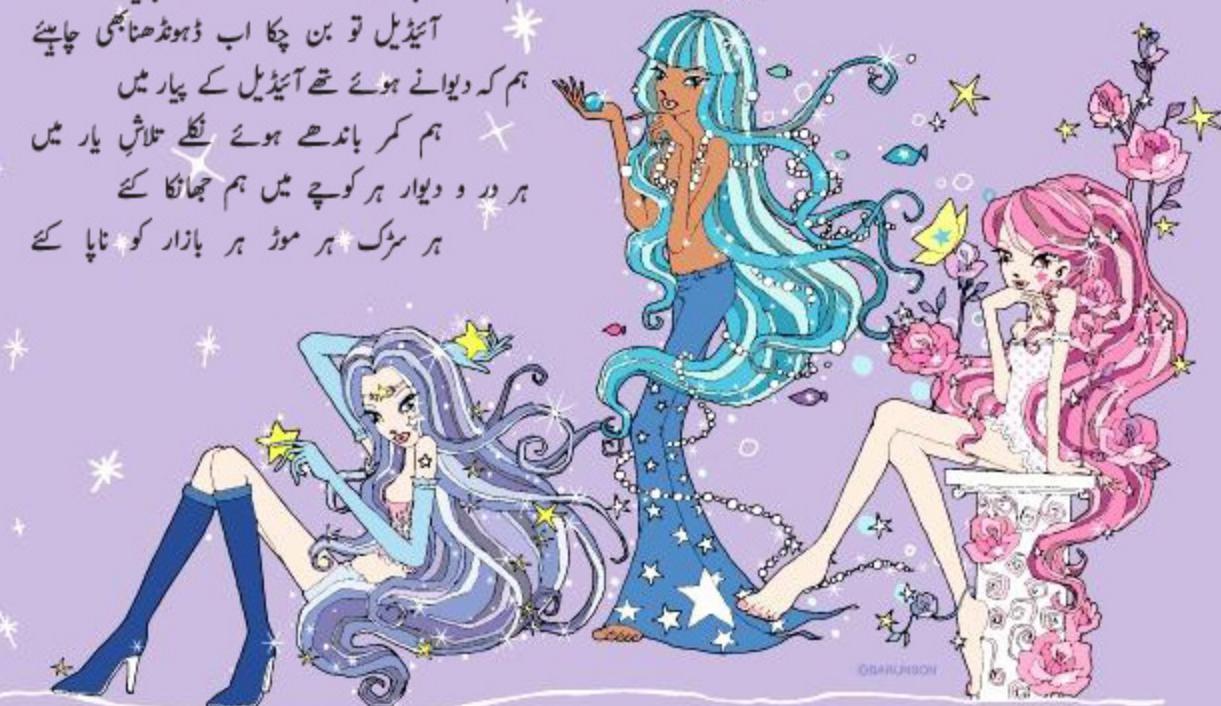
کوئی تو تھا کباب کے پیچھے پڑا ہوا
مرغے کی ٹانگ لینے پہ کوئی اڑا ہوا
ڈش کے قریب کوئی تھا ایسے کھڑا ہوا
کھمبے کی طرح جیسے زمیں میں گڑا ہوا
بریانی کی طلب میں بھٹکتا ہوا کوئی
بوٹی بنا چبائے سٹکتا ہوا کوئی

آئے کباب سیخ تو ہتھیا گیا کوئی
پلّے پڑا نہ کچھ بھی تو جھلا گیا کوئی
چٹنی سمجھ کے سونٹھ وہاں کھا گیا کوئی
اور رائتے میں کے کھیر میں اوندھا گیا کوئی
کوئی تو لے رہا تھا مزا رس ملائی کا
تھپّڑ کسی نے کھا لیا دستِ حنائی کا

پہلے تو ہم بھٹکتے رہے بس اِدھر اُدھر
شرم و حیا کو رکھ دیا پھر ہم نے طاق پر
ٹیبل پہ پہنچے مجمع کو جب چیر پھاڑ کر
ڈونگا اٹھا کے ڈالی جو اس پہ ذرا نظر
اس میں نہ شوربہ نہ ہی بوٹی دکھائی دی
خالی پلیٹ بھوک میں روٹی دکھائی دی

پلّے جب اپنے کچھ نہ پڑا بھاگ دوڑ کر
حسرت بھری نگاہ سے کھانے کو چھوڑ کر
ہم نے سلاد کھا لیا نیبو نچوڑ کر
ویٹر سے پانی مانگا جو پھر ہاتھ جوڑ کر
غصے سے پانی پھر گیا اس وقت پیاس پر
چاروں طرف سنی تھی لپ اسٹک گلاس پر

آئیڈیل

اعظم نصر

جانے کیا سوجھی ہمیں بیٹھے بٹھائے ناگہاں
ورنہ یارو ہم کہاں اور یہ وبالِ دل کہاں
ہم نے سوچا ہم کسی شاعر سے پیچھے کیوں رہیں
ہم تصور کے کسی ماہر سے پیچھے کیوں رہیں
ذہن میں اپنے بھی اک تصویر ہونی چاہیئے
آئیڈیل کے روپ میں تعبیر ہونی چاہیئے
آیئے اب آپ بھی سُن لیں تحمل سے حضور
کیا بنائی تھی زمیں پر ہم نے وہ جنت کی حور

قد میں مجھ سے وہ ذرا سی چھوٹی ہونی چاہیئے
نہ بہت پتلی نہ زیادہ موٹی ہونی چاہیئے
چاند ہو چہرہ! نہیں یہ عام ہی سی چیز ہے
جو بھی دیکھے کہہ اُٹھے یہ کس جہاں کی چیز ہے
آنکھ ہو چشمِ غزالاں، ہونٹ ہو کھلتا گلاب
چال میں ہو یوں روانی جس طرح موجِ چناب
زلف لہرائے تو دن میں رات کا سا ہو سماں
گال پر اک تل ہو کالا، قد خمِ ابرِ کماں
مسکراہٹ میں چھپائے بجلیوں کا راز ہو
دانت ہیرے کی لڑی ہوں جل ترنگ آواز ہو
ناک زیبا کی طرح باریک ہونی چاہیئے
ہاں زبانِ ناز بھی کچھ ٹھیکھونی چاہیئے
یہ کہ تھا چہرہ جبینِ چاند سے بھی خوب تر
پوجنے کے لائق بھی تھا گرچہ یہ چہرہ مگر
ہم ابھی شاعر ہوئے تھے کب کہ بیٹھے سوچتے
یا خیالوں میں فقط اُس نازنیں کو پوجتے
ہم نے سوچا اب ذرا سا گھومنا بھی چاہیئے
آئیڈیل تو بن چکا اب ڈھونڈھنا بھی چاہیئے
ہم کہ دیوانے ہوئے تھے آئیڈیل کے پیار میں
ہم کمر باندھے ہوئے نکلے تلاشِ یار میں
ہر در و دیوار ہر کوچے میں ہم جھانکا کیے
ہر سڑک ہر موڑ ہر بازار کو ناپا کیے

کیا کہیں قسمت میں یہ دن بھی لکھے تھے بے قصور
تھی نظر ہو آنے جانے والے چہرے پر حضور
تھی اگر چشمِ غزالاں تو نہیں ابرو کماں
ہونٹ اگر ملتے کہیں سے ناک زیبا سی کہاں
تھی اگر قد میں مناسب نقش سب بیکار تھے
ہیل تھی لمبی کسی کی یارو زلفِ یار سے
الغرض پھرتے پھراتے یونہی اک بازار میں
کھو گئیں نظریں مری اک محشرِ رفتار میں
کیا بلا کی چال تھی اب کیا کہیں تم سے جناب
تھا ذرا نیلا سا برقعہ، رخ پہ تھا دوھرا نقاب
اور تو سوجھا نہ کچھ ہم کو مگر پھر یوں کئے
چل دئے ہم اُس کے پیچھے آرزوِ دل لئے
چوک سے ہوتی ہوئی پہنچی وہ بس اسٹینڈ پر
تھا اُسے جانا کہاں یارو تھی یہ کس کو خبر
بس کے آتے ہی وہ دروازے کی جانب بڑھ گئے
بھاگ کر جلدی سے یارو ہم بھی بس پر چڑھ گئے
ہم کہ پہلے ہی تھے گھبرائے، ابھی بیٹھے نہ تھے
سر پہ آ پہنچا کنڈکٹر، ہم ابھی سنبھلے نہ تھے
بس کنڈکٹر نے جو پوچھا جانا بابو ہے کہاں
ناگہاں نکلا زباں سے جا رہے ہیں وہ جہاں
میں کہ تھا زلف و لب و رخسار میں کھویا ہوا
وہ چڑھا کے آستیں کو مجھ سے یوں گویا ہوا
کیا کہا بابو ذرا پھر سے تو بتلاؤ مجھے
کیا تعلق ہے تمھارا اس سے سمجھاؤ مجھے
مجھ کو لگتا ہے تمھارے ہوش بھی قائم نہیں
چاہئے ہو خیریت تو تم اُتر جاؤ یہیں
ہم کہ شرمندہ سے اُٹھے بادلِ نخواستہ
پھر وہی تھی بے نشاں منزل وہی تھا راستہ
ہے کوئی بگڑا ہوا، وہ جاتے جاتے کہہ گئے
لے گئے وہ جان کو ہم ہاتھ ملتے رہ گئے

اول اول شوق یارو ہار تھی کس کو قبول
پھر وہی راہیں وہی گلیاں وہی راہوں کی دھول
بڑھتے بڑھتے شیو بھی داڑھی نظر آنے لگی
حالتِ اعظم میاں مجنوں کو شرمانے لگی
خیر قصہ مختصر! اک موڑ پر جاتے ہوئے
پھر نظر آئی ہمیں وہ مہ جبیں آتے ہوئے
ہم کہ پھولے نہ سمائے تھے اُسے پہچان کے
پیر سے سیٹی بجائی ہم نے موقع جان کے
اُس نے جو دیکھا پلٹ کر ہم خوشی سے تن گئے
جھوم اُٹھا دل یوں جیسے کام سارے بن گئے
حالِ دل جونہی سنایا پوچھئے نہ پھر جناب
اُس نے اک دم سے اُلٹ دی اپنے چہرے سے نقاب
رُخ سے جو پردہ ہٹا بیساختہ نکلی تھی آہ
تھا رُخِ لیلیٰ کو شرماتا ہوا رنگِ سیاہ
گھور کر دیکھا جو اُس نے ہم کھڑے ہی رہ گئے
پیار کے جذبے سبھی دل میں دھرے ہی رہ گئے
پوچھئے نہ ہم پہ ظالم کیا ستم ڈھاتے رہے
ایک جھانپڑ میں ہمارے ہوش تک جاتے رہے
ایک لمحے میں اکٹھا اک زمانہ ہو گیا
شوق میں بیٹھے بٹھائے ہی فسانہ ہو گیا
ہر کسی کے منہ میں یارو اپنے دل کا پاپ تھا
تھی کسی کی وہ بہن اور کوئی اُس کا باپ تھا
تھا کوئی شکوہ کناں اچھا زمانہ کھو گیا
آج کل کی پود کو نہ جانے یہ کیا ہو گیا
کیسی رسوائی ہوئی پھر کیا سُنائیں آپ کو
کس طرح سے جان چھوٹی کیا بتائیں آپ کو
آئیڈیل کے شوق میں کیا کچھ نہیں سہنا پڑا
آئندہ سے یہ نہیں ہو گا ، ہمیں کہنا پڑا
آج تک بھی دل سے گزرا سانحہ جاتا نہیں
آئیڈیل کا اب تو ہم کو خواب بھی آتا نہیں

انجینئر عتیق الرحمٰن

زخم دل پر جو لگیں ہم تو بھلا دیتے ہیں
بعد میں زخم یہی ہم کو گھلا دیتے ہیں

یہ نیا دور ہے بزنس کا طریقہ بھی نیا
کسٹمر حق بھی ہمیں بن کے خدا دیتے ہیں

وقتِ بزنس وہ ہرے باغ دکھا دیتے ہیں
نوٹ دیتے ہوئے بالکل ہی رُلا دیتے ہیں

اب تو دشوار ہوا ہے یہاں بزنس کرنا
ایسے بزنس میں تو سب خود کو لُٹا دیتے ہیں

پڑھ کے بیٹھے ہیں جو فائنانس کی تعلیم یہاں
گر چلے بس تو وہ ہستی سے مٹا دیتے ہیں

جال ڈالے ہوئے بیٹھے ہیں مچھیروں کی طرح
جو نکلنے کی کرے اُس کو پھنسا دیتے ہیں

بات بزنس کی ہوئی جب بھی ہماری اُن سے
ہاتھ میں ٹرمز کریڈٹ کا تھما دیتے ہیں

جب بھی کرتے ہیں تقاضہ کہ کرو قسط ادا
قسط دینے کی جگہ دل وہ جلا دیتے ہیں

ہو کوئی ان سے کریں سوچ سمجھ کر بزنس
یہ تو دیوار سے ہر اک کو لگا دیتے ہیں

اب مروت کا کہیں نام نہیں بزنس میں
ایک ہی ڈیل میں وہ سب کو اُڑا دیتے ہیں

چھین لیتے ہیں یہاں منہ سے نوالا اب تو
ایسے حالات تباہی کی صدا دیتے ہیں

کیوں تمنا ہے تمھیں مال بنانے کی عتیقؔ
لوگ اس دوڑ میں خود کو بھی گنوا دیتے ہیں

کاش کہ ہم خاتون ہوتے
ہر کوئی غزلیں لکھ کر دیتا
ہر کوئی نظمیں لکھ کر دیتا
اور ان پر پھر داد بھی دیتا
اس کی دیکھا دیکھی پھر سب
داد بھی دیتے اور دعوت بھی
امریکہ، افریقا، دوبئ
انڈیا ،اردن اور کراچی
نیوزی لینڈ اور کینیڈا میں
پڑھتے مشاعرے اور شاپنگ بھی
کھل کر کرتے، جن سے کرتے
انگ انگ کے فوٹو لگتے
سب اطراف سے پیغام آتے
بینک بیلنس بھی بڑھتا رہتا
بچے بھی آرام سے پڑھتے
کاش کہ ہم خاتون ہوتے

خاوند بھی اتراتا پھرتا
لوگوں سے ملواتا پھرتا
جب بھی جاتے محفل میں ہم
پیچھے دُم ہلاتا پھرتا
سجن آن بلائیں لیتے
دعوتیں ہوتیں کھانے کھاتے
کوٹھی کار اور بنگلہ ہوتا
نوکر چاکر بھاگتے پھرتے
ساس اور نندیں جل جل مرتیں
دیور جیٹھ حسد میں رہتے
اماں واری واری جاتیں
بہنیں اور بھائی لپٹاتے
ابا بھی جوپال میں جا کر
کہتے زینو بہت اچھی ہے
بہت ہی اچھی بہت اچھی ہے
کاش کہ ہم خاتون ہوتے

سید ظفر کاظمی

قسطوں قسط

پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی

بات ہورہی ہو واٹر پمپ مارکیٹ کی اور وہاں کی شہرۂ آفاق ''گوشت مارکیٹ'' کے قصے نہ چھیڑے جائیں۔ لیجئے، ۱۹۸۱ء کا سال ہے، اُردو کے معروف نقاد امیر حسنین جلیسی، جنھوں نے شعرائے اُردو کا معروف تذکرہ ''بت خانہ شکستم من'' لکھا، ایران میں اعلیٰ قالینوں کا کاروبار کیا کرتے، پاکستان آکر سوسائٹی (پی ای سی ایچ ایس بلاک ایک) میں مقیم ہوئے، پھر طارق روڈ کی کوٹھی میں اُس وقت تک رہے جب ایک ہزار گز کی کوٹھی ایک لاکھ روپے میں مل جایا کرتی۔ راقم کے سگے پھوپھا، پھوپھی افضل خاتون صاحبہ کے شوہر، معروف شاعر دلاور فگار صاحب کے بہنوئی اور بہت نفیس انسان، ڈاکٹر جلیسی کے والد صاحب واٹر پمپ کی ''مچھلی مارکیٹ'' میں ملے۔

مجیب ظفر: السلام علیکم پھوپھا جان۔

امیر حسنین جلیسی: جیتے رہیے، خوش رہیے، سلامت رہیے (لیجئے ایک سلام کے جواب میں کئی دعائیں مل گئیں)

پوچھا: پھوپھا جان یہاں کیسے آنے ہوا؟ گاڑی کہاں پارک کی ہے (اُس وقت حضرت کے پاس کالی مرسڈیز تھی، یہ لمبی سی) فرمایا: میاں صاحب زادے، ایک ویگن ہمارے گھر (شمالی ناظم آباد بلاک این) کے سامنے سے ''U'' چلی ہے، وہ سیدھی واٹر پمپ مارکیٹ آتی ہے، سوچا کہ آج یہاں سے مچھلی لے لوں، حیدری مارکیٹ میں تو بہت مہنگی ہے اور تازہ بھی نہیں ہوتی۔ انوار (میرے والد) اور خاتون (میری والدہ) اور بشرہ (بہن)، راجا میاں (چھوٹا بھائی)، راجا پہلوان۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ راجا پہلوان مزے میں ہیں؟''

راجا نے معین اطہر شاہ خان جیدی صاحب کا کوئی ٹی وی ڈراما دیکھ کر معین اختر کے کردار ''راجا پہلوان'' کو دیکھ کر خود کو راجا پہلوان کہلوانا شروع کر دیا تھا، لوگ نوید ظفر تو بھول گئے ''راجا'' یاد رہ گیا۔ آج ماشا اللہ دو جوان لڑکوں حسن اور سعد کے والد ہیں، مگر ''راجا'' ہیں۔ ہاہا۔۔۔

''جی ہاں، پھوپھا جان، اللہ کا شکر ہے، آپ کی دعائیں ہیں۔''

حضرت نے کوئی چالیس، پچاس رُپے کی تھیلا بھر مچھلی لی، صاف، شفاف، خوشبودار ''رہو''، اور کچھ ''پاپلیٹ'' لئے، جسے ہم مچھلی کا بچہ سمجھتے تھے۔ یہ مجھے پھوپھا جان نے ہی بتایا تھا کہ مچھلی کے بچے کو ''ماچھ'' کہا جاتا ہے جیسے بلی کے بچے کو اُردو میں بلوٹا کہا

جاتا ہے، ''بلونگڑا'' پنجابی زبان میں کہتے ہیں۔ کیسے کیسے قابل بزرگ تھے؟ ہائے، خاک میں رُلے۔ ہائے۔ بدایوں چھوڑا، گویا سب کچھ چھوڑا، حویلی پر جھومتا ہاتھی چھوڑا، اشرفیاں بھری دیواریں، ہائے ہائے، حویلیاں، دالان، کھیت کھلیان سب چھوڑے۔

جناب امیر حسنین جلیسی انتہائی عجلت میں تھے، ناگاہ، ویگن سہولت سے قریب رُکی، کنڈکٹر لڑکا ادب سے اُترا، امیر حسنین جلیسی صاحب کو سلام کر کے سوار ہونے میں مدد دی اور وہ ہمیں ٹاٹا کرتے تشریف لے گئے۔ اُس وقت کی ویگنیں اور اُن کا اسٹاف، ایسا لگتا تھا جیسے پڑھے لکھے طالب علم ہیں، مجال ہے کوئی فحش کلمہ، گالی، آنکھ مٹکا رائج ہو۔ انتہائی محنتی اسٹاف اور نت نویلی ویگنیں، میں خود اپنے کالج (اُردو سائنس کالج گلشن اقبال) ''یو'' یا ''یوفور'' ویگن سے جاتا تھا، ''شہزادی ہاؤس'' (گلشن اقبال) سے مُڑتی، جہاں میری والدہ کی چچی اور ڈاکٹر وہاج کی والدہ رہا کرتی تھیں۔ اکثر اُن کے بنگلے، کالج سے واپس آتے وقت اُتر جاتا۔ کیا بات تھی اُن بزرگوں کی؟ ماشااللہ۔ کہاں وہ شہزادی ہاؤس، کہاں آج کا قفسِ ''گلشن''۔ اب تو سائلنسر نکلی اُڑتی ہوئی موٹر سائکلوں کا دور ہے، بے قابو رکشوں کا ہجوم ہے، متعلقہ افسران آنکھوں پر سیاہ چشمے چڑھائے اور کانوں میں رُوئی ڈاٹے بیٹھے ہیں۔

گھر آ کر والدہ صاحبہ کو بتایا کہ پھوپھا جان نیچے سے نیچے چلے گئے۔ افسوس کیا۔ ٹیلے فون پر پھوپھی جان سے معذرت کی۔ پُرخلوص رشتوں کا دور تھا۔ شام ہوئی تو حسبِ معمول دادی محترمہ جنھیں ہم ''امّاں'' کہا کرتے، تشریف لائیں، آنچل سے بارہ روپے کھول کر دئے اور فرمایا: ''پُوت، نیچے، گامی کی دُکان سے آدھا سیر بکری کا گوشت تولا دے، تمہارے چچا جان (جناب مظفر حسین حمیدی) آنے والے ہوں گے، اُن کے آنے سے پہلے سالن بنانا ہے سلمیٰ کو، دیکھیو، قصائی کوئی چھیچھڑا نہ رکھ دے، اتنا فرما کر مسہری کے سرہانے سے سر ٹکا لیتیں۔ ایوب منزل (دستگیر) کے میدان سے پیدل چل کر واٹر پمپ یو کے اسکوائر آتیں، خوب پیدل چلا کرتیں، لگ بھگ سو برس میں انتقال فرمایا۔ آنکھ، ناک، کان سب درست۔ نہ شوگر، نہ بلڈ پریشر۔ جب مجھے ہائی بلڈ پریشر کی بیماری ہوئی تو خوب روئیں: ''ہائے ہائے موا، خفقان بچّے کو چمٹ گیا، ہائے، یہ کیسا شہر ہے کرانچی۔''

ہاہاہا۔۔۔۔۔کراچی کو ہمیشہ ''کرانچی'' کہا کرتیں۔ بدایوں کی حویلی اور مولوی ٹولے، فرشوری ٹولے پر ناز کیا کرتیں کہ وہ تھے ہمارے گھر۔ تمہارے دادا سونے کے بٹن میرے کرتے میں لگواتے تھے، روٹی پکانے، بال کاڑھنے، ناخن تراشنے کو نائنیں آتیں۔ مامائیں آتیں۔ یہ موا ''ماسی'' کا لفظ بھی کرانچی کا ہے۔ ماما یا انّا کہا کرتے تھے ہم تو۔

والدہ فرماتیں: ''اے ہے امّاں، اب سلمیٰ کب گوشت چڑھائیں گی، کب گلے گا، کہیں تو میں سالن پکا دوں مظفر کو؟'' فوراً راضی ہو جاتیں: ''ہاں ہاں بہو، ذرا چکنائی اور مرچ کم ڈالنا، اور ہنڈیا چڑھا کے ذرا میرے سر میں تیل تو ڈال کے کنگھی کر دو، جوئیں تو نہ پڑ گئیں، مُوئی خارش کیوں ہے اس قدر سر میں؟''

بہت وہم تھا، انتہائی صاف ستھری رہا کرتیں۔ والدہ مسکراتے ہوئے اُن کے سر میں تیل ڈالتیں، کنگھا کرتیں، صاف کنگھا دکھاتیں کہ دیکھیں اماں کوئی جُوں نہ ہے آپ کے سر میں، اللہ کا شکر ادا کرتیں۔ پھر عصر کی نماز پڑھ کر لیٹ جاتیں اور ہم بچوں سے اور اپنی بہو (ہماری والدہ) سے باتیں کرتے سو جاتیں۔ شام کو والد صاحب آتے تو بمع ہنڈیا اُنھیں اُن کے دستگیر کے خوبصورت گھر میں چھوڑ آتے۔ جاوید نہاری کی دائیں پہلی گلی کا پہلا کونے والا گھر، یہ بڑے آم، امرود کے درختوں والا۔

واٹر پمپ مارکیٹ کے دو حصے تھے، ایک ہول سیلر یا تھوک فروش اور دوسرے ریٹیلر۔ ہمارے فلیٹوں (یو۔ کے اسکوائر) کے عین نیچے ''عبدل کریانہ مرچنٹ'' تھا۔ پہلے تو مہینے بھر کا سودا سلف میں اور والدہ لالو کھیت سے رکشے میں لاتے، دو سو روپے میں رکشہ بھر کر۔ اب بتاؤ تو کسی کو یقین نہیں آتا کہ وہی سودا اب دس پندرہ ہزار میں آتا ہے۔ میں دن بھر عبدل سے پاپڑ، رنگ پاپڑ، جلیبی پاپڑ، املی کی مٹھائیاں، انڈیا کے جلیبی پاپڑ لاتا اور تل تل کر کھاتا۔ شام کی چائے خود بناتا اور اپنے ہاتھ سے تلے ہوئے پاپڑ

کھاتا۔ یہ فرنچ فرائز وغیرہ تو بہت بعد کی بات ہے کہ یہ آلو کے چپس تلنے کی مشینیں آئیں، پہلے یہ آلو کے چپس صرف صدر اور کلفٹن کی مہنگی بیکریوں پر ملا کرتے تھے۔ پھر مینا بازار میں ایک بیکری کھلی تھی کوئی نئی ''یونائٹڈ بیکری'' سے پہلے ، منامہ یا پنامہ۔۔۔اللہ جانے کیا نام تھا اُس کا۔ وہاں ملا کرتے۔ ایک دن میں عبدل کی دُکان پر گیا تو عبدل ایک پختہ عمر آدمی تھا۔ مجھے غور سے دیکھ کر بولا: ''بابو، اب آپ جوان ہوگئے ہو، یہ املی، پاپڑ زیادہ نہ کھایا کرو، موٹے ہو جاؤ گے۔'' مجھے بڑی حیرت ہوئی،

اُس وقت میں بی ایس سی میں تھا، پوچھا کہ جوانی اور پاپڑ اور املی سے کیا؟ کچھ نہیں بولا۔ اگلے دن کالج میں دوستوں سے تذکرہ کیا تو انھیں بھی کچھ خاص معلومات نہیں تھیں۔ میڈیکل کے پروفیسر صاحب ڈاکٹر وقار احمد زبیری صاحب سے پوچھا تو وہ بھی خاموش ہوگئے: ''پتا نہیں بیٹا، اپنی بیوی سے پوچھوں گا کہ جوان لڑکا املی اور پاپڑ کھٹے کیوں نہیں کھا سکتا؟'' خاصا سوچ کر جواب دیا تھا۔

ہمارے گروپ میں ایک بہت ہی تیز لڑکا تھا ''عرفان تابانی'' ، ہائے اللہ عرفان اگر تم یہ سطور پڑھ رہے ہو تو پلیز سراج الدولہ کالج میں صبح دس بجے تک آجاؤ، میں مجیب ہوں، جو پانچویں کلاس سے تمہارے ساتھ پڑھتا تھا اور میں آج کل پرنسپل ہوں کالج کا، عرفان تابانی، شاہد شمس، انوار الحق، تمثیل، ناصر، خالد خلجی، رضا، شکیل انصاری، قلندر خان، ایک ہی کلاس میں تھے ہم سب ''دوم جیم میں''۔ تو مجھے عرفان تابانی نے جو بتایا تو ہم میں کسی کو کچھ ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آیا۔ اس پر عرفان بولا کہ اچھا یار رات کو میرا ایک دوست ہے خالد، بڑا امیر ہے، اُس کی بڑے لڑکوں سے دوستی ہے، تو وہ غیر ملکی فلم وی سی آر پر چھپ کر چلائے گا تو میں بھی فرسٹ ٹائم دیکھوں گا کہ ہوتا کیا ہے جوان لڑکوں کے ساتھ؟ ہم نے منھ پھاڑ کر پوچھا: ''کون سی فلم ہے عرفان؟'' وہ معصومیت سے بولا: ''یار اسکو بلو فلم بول رہا تھا خالد۔''

''اچھا اچھا، نیلے رنگ کی ہوتی ہوگی نا مووی۔'' سارے سقراط بقراط نے اپنی اپنی رائے پیش کی، اچانک عرفان کی گُدّی پر کسی نے پوری طاقت سے کس کر گھونسا مارا، پیچھے مُڑ کر دیکھا کہ محلّہ کے غنڈے ''ستار بھائی'' کھڑے تھے۔

''یہ تم کیا بھونک رہے تھے ابھی عرفان، پھر سے بولو!'' اُن کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ہم سب سہم گئے، عرفان کی تو گھگھی بندھ گئی۔ ''وہ وہ بھائی، وہ وہ بھائی، خالد کوئی فلم لائے گا، وہ دکھانے بلایا ہے ہم لوگوں کو آج مغرب کے بعد۔''

''ماشا اللہ، بہت خُوب، سبحان اللہ۔۔۔۔'' ستار بھائی نے اس طرح چبا چبا کر کہا جیسے عرفان تابانی کی ہڈیاں چبا رہے ہوں، پوچھا: ''پھر کیا ارشاد فرمایا آپ نے؟''

عرفان تو سر جھکا کر چُپکا ہو رہا، ہم ہمت کر کے بولے: ''ستار بھائی، ستار بھائی، میں نے کہا کہ خالد بھائی، آپ فلم کو ریوائنڈ کر کے رکھیں، ہم لوگ ابھی نماز پڑھ کر آتے ہیں اور دیکھئے، بے ایمانی مت کیجئے گا، جب ہم آئیں تو بلو فلم اُسی وقت اسٹارٹ کیجئے گا۔'' اچانک ستار بھائی کو جانے کیا ہوا، اِدھر اُدھر دیکھ کر زمین پر بیٹھ گئے، بڑے توانا کڑیل جوان تھے، منھ گھٹنوں میں چھپا کر خوب ہنسے، میں سمجھا رو رہے ہیں۔ خوب ہنسے۔ پھر قریب سے کامران بھائی نماز پڑھنے کو گزرے تو اُن کے کان میں بھی کچھ کہا، وہ بھی خوب ہنسے اور بولے: ''بچّے ہیں یہ سب شریف گھرانوں کے، وہ بدمعاش مکار ہے، جاؤ جاؤ نماز پڑھ کر گھر جاؤ۔ میں خالد کی خبر لیتا ہوں جا کر۔'' دونوں دوست نماز کو چلتے بنے۔ ستار بھائی محلّہ بھر کے بدمعاش تھے لیکن نماز پنج وقتہ پڑھا کرتے، نہ کسی کو گالی دیتے، نہ مارتے، عورتوں بچوں کی عزتوں کے امین، لڑکوں کو نمازیں پڑھنے کا کہا کرتے، میلاد سُن کر خُوب روتے، اللہ جانے کاہے کے بدمعاش تھے وہ، اللہ جانے، مرحوم ہوئے، قبر میں سے وہ بھینی مہک اُٹھی کہ مولوی صاحب آب دیدہ ہوگئے، ''فرشتہ کون تھا یہ؟'' انھوں نے پوچھا۔ میں آنکھیں رگڑتے ہوئے بولا: ''بہت بڑے بدمعاش تھے واٹر پمپ مارکیٹ کے!'' عجیب لوگ تھے تدفین میں، میری بات سُن کر بجائے ہنسنے کے، منھ پھاڑ کر رونے لگے، مل کر بین ڈالنے لگے کہ ہائے ستار مر گیا، کئی گھرانوں کو پالنے والا، کراچی کا ایک بدمعاش اور کم ہوگیا۔

WOW کا واؤ

ووٹ کا واؤ اگر زیرِ تعلیم پر لگا دیا جائے تو زیرِ تعلیم وزیرِ تعلیم بن جاتا ہے'' یہ ہے وہ مشہور مکالمہ جو اردو کے مشہور ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین نے اپنے مقبول ترین ڈرامے ''تعلیمِ بالغاں'' میں اپنے کردار ''مولوی صاحب'' سے ادا کروایا تھا۔ یوں تو پچاس کی دھائی کا یہ فقرہ آج بھی اسی طرح تروتازہ ہے جس طرح ہمارے سیاستدانوں کی چالبازیاں، اور ووٹ کا واؤ بہت سارے سیاستدانوں کے لیئے ایسا WOW ثابت ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری تک سے بارآور ہوجاتے ہیں۔

خواجہ معین الدین کے اس بھر پور جملے نے جہاں ہمارے سیاسی نظام پر طنز کا ایک تیز نشتر رکھا ہے، وہیں ہمیں سوچنے کی ایک نئی راہ بھی دکھائی ہے۔ وہ راہ یہ ہے کہ اگر کسی لفظ میں سے کوئی ایک حرف نکال کر کوئی دوسرا حرف شامل کر دیا جائے تو صورتحال کتنی دلچسپ اور معنی خیز ہو سکتی ہے۔ یوں بھی ایک مشہور شعر کے مطابق ایک نقطہ کا فرق دعا کو دغا اور محرم مجرم بنا دیتا ہے۔ حروف کے اسی الٹ پھیر نے کیا کیا دلچسپ صورتحال پیدا کی ہے آیئے اس پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

''کیل'' ایک بہت معمولی سا لوہے کا ٹکڑا ہے جو کوئی سی دو اشیاء، خصوصاً لکڑی کی اشیاء، کے جوڑ میں پختگی کے لیئے کام آتا ہے۔ لیکن اگر یہی کیل کسی گاڑی کے ٹائر میں چبھ جائے تو پھر چاہے وہ گاڑی سائیکل ہو یا موٹر سائیکل، وہ کوئی چھوٹی سی کار ہو یا کئی گز لمبا ٹرالر، وہ کیل اس کو رکنے پر مجبور کردے گی۔ اگر اسی کیل کو وہاں کا واؤ لگا دیا جائے کیل وکیل میں بدل جائے گی جس کے سامنے اچھا بھلا وبال بھی بال بن کر رہ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے دوست محسن ترمذی کا کہنا ہے کہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وکیل کا واؤ اگر بال (بچوں) کو مل جائے تو ایک چھوٹے سے بال کے وبال بننے میں لمحہ بھر بھی نہیں لگے گا، مگر دوسری طرف واؤ نکل جانے کے بعد بھی وکیل لنڈورہ ہو جانے کے باوجود بھی کیل بن کر چبھنے سے باز نہیں آئے گا۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن میں سے واؤ نکال لیں یا واؤ لگا

> ووٹ کا واؤ اگر زیرِ تعلیم پر لگا دیا جائے تو زیرِ تعلیم وزیرِ تعلیم بن جاتا ہے۔

دیں ان کی معنویت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ اب مثلاً لفظ سیم (سیم وزر والا) کو ہی دیکھ لیں، اس کے معنی ہیں ''چاندی''۔ اگر اس میں وجود کا واؤ لگا دیا جائے تو یہ لفظ وسیم میں بدل جائے گا۔ اور وسیم کا مطلب ہوتا ہے ''خوبصورت'' اب اس سے کون انکار کرے گا کہ معنویت کے اعتبار سے دونوں ہی ہم پلہ الفاظ ہیں۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جب وجود نے اپنا واؤ سیم کو دیکر اسکو وسیم بنایا تو وہ خود عدم وجود نہیں ہوگیا بلکہ "جُود" بن گیا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ''جُود'' کا مطلب بخشش اور

سخاوت ہے۔اسی سے مشہور لفظ "جُو دوسخا" بنا۔

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیئے گا، ہو وہ کتنا ہی صاحب جود وسخا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

خاندان کے بزرگوں کے لیئے مستعمل لفظ جَد (جَدِ امجد، جَدِ اعلیٰ) کو اگر واؤ مل جائے تو اسی لفظ جَد پر ایسا وجد طاری ہو جاتا ہے کہ آپ اس بات کو ماننے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہاں بھی لفظ کی معنویت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ یوں بھی بزرگوں کا سن کر آج بھی اکثر لوگوں پر وجد (عالمِ بیخودی) طاری ہو جاتا ہے۔

عربی زبان کا لفظ ہے "وہاب" اس کا مطلب ہے عطا کرنے والا، دینے والا۔ اسی لفظ وہاب سے واؤ مستعار لیکر اگر عربی کے ہی دوسرے لفظ "ید" پر لگا دیا جائے (یہاں پر مجھ جیسے کم علم افراد کو

> اب سے کچھ عرصہ قبل ہمارے ملک کے اقتدارِ اعلیٰ پر قابض ایک شخصیت، جو آج بھی اسی کرسی کے سہانے سپنے دیکھ رہی ہے، ایک خاص قسم کی وردی پہنا کرتی تھی، جب ان سے وردی اتارنے کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے کہ وردی تو میری کھال ہے، کوئی اپنی کھال کس طرح اتار سکتا ہے؟ حالات نے تیزی سے پلٹا کھایا، جن لوگوں نے اس شخصیت کو وردی پہنائی تھی انہوں نے بڑے سکون اور اطمنان سے موصوف کی وردی میں سے "واؤ" نکال دیا، اس کے بعد کیا بچا؟ یہ بتلانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ "ید" عربی میں ہاتھ کو کہتے ہیں۔) تو پھر عربی کا یہ لفظ "ید" ہندی کے لفظ "وید" میں بدل جائے گا۔ آج کے دور میں جب لوگ ہندوستانی فلموں کی وجہ سے دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ "وید" سے تو تقریباً ہر شخص ہی واقف ہوگا۔ اگر وید صحیح کام کرے تو عامۃ الناس کو جسمانی اور روحانی سکون دلانے والا بن جاتا ہے بصورتِ دیگر یہ انسانی جسم کو کتنی اذیت سے دوچار کر دیگا اس کا اظہار الفاظ میں بیان کرنا تقریباً ناممکن ہے۔

"واؤ" کی ایک بہت بڑی اثر انگیزی اس وقت بھی دیکھنے کو ملتی ہے جب "وسائل" سے یہ واؤ غائب ہو جائے تو "وسائل" کے "سائل" بننے میں کوئی دیر نہ ہوگی اور "وسائل" "سائل" بن کر کاسہِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

"واؤ" کے اسی کرشماتی اثر کا مشاہدہ ماضی قریب کی ایک معروف شخصیت سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اب سے کچھ عرصہ قبل ہمارے ملک کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ایک شخصیت، جو آج بھی اسی کرسی کے سہانے سپنے دیکھ رہی ہے، ایک خاص قسم کی وردی پہنا کرتی تھی، جب ان سے وردی اتارنے کے بارے میں پوچھا جاتا تو فرماتے کہ وردی تو میری کھال ہے، کوئی اپنی کھال کس طرح اتار سکتا ہے؟ حالات نے تیزی سے پلٹا کھایا، جن لوگوں نے اس شخصیت کو وردی پہنائی تھی انہوں نے بڑے سکون اور اطمنان سے موصوف کی وردی میں سے "واؤ" نکال دیا، اس کے بعد کیا بچا؟ یہ بتلانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، کچھ کام ہمارے قارئین کو خود بھی کر لینا چاہیے۔

"واؤ" کی اضافت سے جو دلچسپ صورتحال پیدا ہوا کرتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں کھائی جانے والی کثیر المقدار دالوں میں سے ایک "اُرد" (ماش) کی دال بھی ہے۔ یوں تو یہ دال جادو ٹونے کے کام بھی آتی ہے لیکن اطباء اور بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ اگر اُرد کی دال ادرک کے بغیر کھائی جائے تو اس کا اثر بہت جادوئی ہوتا ہے اور اس میں فوری طور پر "واؤ" لگ جاتا ہے اور پھر کھانے والے کے پیٹ سے جو کچھ وارد ہوتا ہے اس موقع کے لیئے اسلام آباد کے ایک مزاح گو شاعر جناب بیدل جونپوری مرحوم نے کچھ یوں شعر کہا ہے:

ضروری نہیں لب ہلیں تو صدا ہو
مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

شہد کی مکھی اور نواز شریف کا گال

میٹھی مرچیں

نسیم سحر
naseemesehar@gmail.com

آج ہمارا موضوع جہازوں کی لینڈنگ نہیں، بلکہ اس شہد کی مکھی کی لینڈنگ ہے جسے اپنی لینڈنگ کے لئے گذشتہ دنوں وزیرِ اعظم جناب نواز شریف کا سرخ وسفید گال پسند آ گیا تھا۔ یہ خبر آپ نے بھی پڑھی ہوگی کہ ابھی چند دن پہلے جب وہ ساہیوال کول پاور پراجیکٹ کا دورہ کر رہے تھے، کسی طرف سے ایک شہد کی مکھی اڑتی ہوئی آئی اور اس نے ان کا سرخ و سفید، پھولا ہوا گال اپنی لینڈنگ کے لئے پسند کر لیا اور مزے سے وہاں لینڈ کر گئی۔ اس وقت جناب نواز شریف پراجیکٹ کے دورے کے دوران اخبار نویسوں سے بات چیت کر رہے تھے۔ اُن کے ساتھ گورنر پنجاب رفیق رجوانہ بھی تھے، دیگر وزراء اور حکام بھی ہوں گے، سیکورٹی کا سٹاف بھی ہوگا، اور ان سب کی موجودگی میں ایک گستاخ شہد کی مکھی نے یہ حرکت کر ڈالی۔ نواز شریف تو سٹیل مل کا مالک ہونے کے ساتھ ساتھ آہنی اعصاب کے بھی مالک ہیں اس لئے انہوں نے اس گستاخ مکھی کا کوئی نوٹس لئے بغیر گفتگو جاری رکھی مگر گورنر رفیق رجوانہ اس پر خاصے پریشان ہوئے، آخر ایک اخبار نویس نجات دہندہ بنا اور اس نے ہاتھ ہلا کر یہ مکھی اڑا دی اور تب گورنر صاحب بھی پُر سکون دکھائی دیئے۔ اگر خود رفیق رجوانہ کے گال پر مکھی بیٹھی ہوتی تو شاید وہ اتنے پریشان نہ ہوتے، مگر وزیرِ اعظم کے گال پر مکھی کا بیٹھنا؟؟؟ توبہ توبہ!

حیرت ہے کہ تا حال کسی کالم نویس، کسی وزیر، کسی بیان باز شخصیت نے اِس مکھی کی جرأتِ رندانہ بلکہ جرأتِ احمقانہ پر کوئی بیان نہیں دیا، اور مزید حیرت اِس پر ہے کہ وہ مکھی ابھی تک زندہ بھی ہے اور آزاد بھی۔ کوئی ہما شما ہوتا تو شاید اب تک جیل کی ہوا کھا رہا ہوتا۔

ہماری حسِ مزاح نے اِس شہد کی مکھی کے اِس اعلیٰ ترین سرکاری گال پر بیٹھنے کے بارے میں کئی پہلو تراش کر لئے ہیں، اور یہ بھی سوچا ہے کہ کون کون سا سیاستدان اس صورت حال پر کیا کیا بیان دے سکتا تھا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اگر سیاستدانوں نے اِس کا

اگر خود رفیق رجوانہ کے گال پر مکھی بیٹھی ہوتی تو شاید وہ اتنے پریشان نہ ہوتے، مگر وزیرِ اعظم کے گال پر مکھی کا بیٹھنا؟؟؟ توبہ توبہ!

نوٹس لیا ہوتا تو کیا کیا بیان شائع ہوئے ہوتے۔ جناب پرویز رشید نے تو اسے فوراً پی ٹی آئی اور عمران خان کی سازش قرار دے دیا ہوتا۔ دیگر کچھ وزیروں نے بھی عمران خان اور طاہر القادری کے دھرنے کو اس کا سبب قرار دے دیا ہوتا۔ شہباز شریف نے مکھی کو چوبیس گھنٹوں کے اندر تلاش کر کے پیش کرنے کا حکم دیا ہوتا تاکہ اسے الٹا لٹکا دیا جائے۔ اگر اہلکار اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہتے تو انہیں فوری طور پر برخواست کر دیا جاتا۔ شیخ رشید احمد نے سگار کا کش لگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے ٹی وی چینل کی

میزبان خاتون کو دیکھتے ہوئے کہا ہوتا: ''یہ اندر کی بات ہے۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا''۔عمران خان نے اسے نون لیگ کے اندرونی اختلافات کا نتیجہ قرار دیا ہوتا۔پیپلز پارٹی نے اسے ڈاکٹر عاصم اور عذیر بلوچ کے خلاف اٹھائے جانے والے اقدامات کا ردِعمل قرار دے دیا ہوتا۔آصف علی زرداری نے کہا ہوتا کہ یہ مفاہمت کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔وعلیٰ ہٰذہ القیاس!

ایک اور سوال یہ ہے کہ اگر شاعروں نے اس پر شعر لکھا ہوتا تو کیا کہا ہوتا۔محبوب کے گال کے تِل پر تو بیشمار اشعار ملتے ہیں، یہاں تک کہ تِل کو مصحفِ رخسارِ یار کی تلاوت میں مصروف حافظِ قرآن بھی کہا گیا ہے، اور ایک اور شاعر نے تو کمال کی سخاوت برتتے ہوئے کالے تِل کو گورے رخسار پر بیٹھنے پر بُرا بھلا کہتے ہوئے بھی کہہ دیا کہ ''جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر''۔ بلکہ حکیم الاُمت علامہ اقبال نے تو کسی خاتون کی گود میں بلّی دیکھ کر ایک نظم ہی ''۔۔۔کی گود میں بلّی دیکھ کر'' کے عنوان سے لکھ ڈالی تھی۔

محبوب کے گال کے تِل پر تو بیشمار اشعار ملتے ہیں، یہاں تک کہ تِل کو مصحفِ رخسارِ یار کی تلاوت میں مصروف حافظِ قرآن بھی کہا گیا ہے، اور ایک اور شاعر نے تو کمال کی سخاوت برتتے ہوئے کالے تِل کو گورے رخسار پر بیٹھنے پر بُرا بھلا کہتے ہوئے بھی کہہ دیا کہ ''جا چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر''۔ بلکہ حکیم الاُمت علامہ اقبال نے تو کسی خاتون کی گود میں بلّی دیکھ کر ایک نظم ہی ''۔۔۔کی گود میں بلّی دیکھ کر'' کے عنوان سے لکھ ڈالی تھی۔

چنانچہ نون لیگ سے وابستہ کسی شاعر کو چاہئے تھا کہ اسی انداز میں ''۔۔ کے گال پر شہد کی مکھی دیکھ کر'' کے عنوان سے بھی نظم لکھ ڈالتے۔ چلئے نظم نہ سہی، کوئی قطعہ ہی سہی، کوئی شعر ہی سہی۔ تا کہ نون لیگ سے وفاداری کا حق بھی ادا ہو جاتا اور شعری ادب میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

پھر ایک اور بات سوچنے والی یہ بھی ہے کہ یہ مکھی شہد کی مکھی تھی، گندگی پھیلانے والی مکھی نہیں تھی۔ تحقیق اِس بات پر بھی ہونی چاہئیے کہ کیا وہ اپنی بھری ہوئی شہد کی ٹینکی نواز شریف صاحب کو نذر کرنے آئی تھی یا خالی ٹینکی کے ساتھ وہاں آ کر اُن کے پلے پلائے گال کو ایک سرخ پھول سمجھ کر اُس کا رس چوسنے آئی تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر تو ہم اُس شہد کی مکھی کا رس حاصل کرنے کے لئے منہ مانگی

تحقیق اِس بات پر بھی ہونی چاہئیے کہ کیا وہ اپنی بھری ہوئی شہد کی ٹینکی نواز شریف صاحب کو نذر کرنے آئی تھی یا خالی ٹینکی کے ساتھ وہاں آ کر اُن کے پلے پلائے گال کو ایک سرخ پھول سمجھ کر اُس کا رس چوسنے آئی تھی۔

قیمت ادا کرنے پر بھی تیار ہیں کہ جسمانی اور سیاسی طاقت سے لبریز ایسا شہد بھلا اور کہاں سے ملے گا۔ ویسے عام مکھی تو عوام کی طرح بے ضرر ہی ہوتی ہے، آخر وہ اپنے ننھے ننھے پروں سے کتنی گندگی لا سکتی ہے۔ چلئے خیر ہوئی کہ ایسا نہیں ہوا اور یہ مکھی شہد کی مکھی تھی۔ مگر شہد کی مکھی بھی گال پر بیٹھی اور ڈنک مارے بغیر چلی گئی تو اِس پر بھی تحقیق ہونی چاہئے۔ کیا یہ رعب اقتدار کی وجہ سے تھا؟ خدانخواستہ اگر اس نے ڈنک مارا بھی ہوتا تو ہمارے خیال میں نواز شریف کا گال سوجن کا شکار نہ ہوتا کیونکہ وہ تو ماشاء اللہ پہلے ہی خاصا پھولا ہوا ہے، غُصّے سے نہیں، صحت سے، ہاں اگر ان کی جگہ شہباز شریف ہوتے اور خدانخواستہ مکھی نے ان کے گال پر کاٹ لیا ہوتا تو پھر یقیناً ان کے گال پر دوہری سوجن طاری ہوتی، ایک تو مکھی کے کاٹنے سے، دوسری غُصّے سے۔ اور پھر وہ مکھی شاید وہیں ہلاک کر دی جاتی۔ خیر، شہد کی مکھی نے اگر نواز شریف یا شہباز شریف کے گال پر کوئی ایسی حرکت کی ہوتی تو اب تک تحریک طالبان پاکستان کا یہ دعویٰ بھی منظرِ عام پر آ چکا ہوتا کہ یہ مکھی اسی نے بھیجی تھی، اور اس کے ذریعے اس نے مزید کارروائیوں کے لئے بڑی مفید معلومات اکٹھی کر لی ہیں۔

قارئینِ کرام، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ یہ کالم پڑھ کر یہ نہ کہہ دیں کہ ارے بھئی یہ کیا مکھی پہ مکھی مارے جا رہے ہو۔ چنانچہ اس نصیحت کے ساتھ ہم اپنا یہ کالم ختم کر رہے ہیں کہ اس موسم میں ہر قسم کی مکھیوں سے ہوشیار۔

محمد خلیل الرحمٰن

جیون میں اِک بار آنا سنگاپور

سنگاپور میں ہماری تربیت جاری رہی اور آخر کار جمعہ کا دن بھی آگیا۔ اس روز ہم الارم بجنے سے کوئی پانچ منٹ پہلے ہی بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور پطرس بخاری صاحب کی طرح غسل خانے میں دیر تک چل چل چنبیلی باغ میں گاتے رہے۔ آج جمعہ تھا یعنی اب سے کچھ ہی گھنٹے میں ہفتے کا اختتامیہ شروع ہو رہا تھا۔ پاکستان میں چونکہ ہفتہ وار چھٹی کا صرف ایک ہی دن معین ہوتا ہے لہٰذا وہاں پر لوگ جمعے کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ پارسال جب ہم جرمنی گئے تھے تو وہاں پر ہم نے یہ رمز جانا تھا۔ جمعہ کی صبح ہی سے وہاں پر لوگوں کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا ہے۔ ٹی جی آئی ایف۔ کلاس روم میں پہنچتے ہی ہم نے بورڈ پر چاک سے ٹی جی آئی ایف لکھ دیا۔ جو لوگ صاحب کشف تھے فوراً سمجھ گئے۔ ہمارے انسٹرکٹر صاحب بھی جو جرمن تھے اور ''گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو تھے'' مسکرا دیے۔ اور بورڈ پر اس کے سامنے پورا جملہ لکھ مارا۔ ''تھینک گاڈ اِٹس فرائیڈے'' یعنی اللہ کا شکر ہے آج جمعہ ہے۔

خیر صاحب! آج ایک گھنٹہ پہلے چھٹی ہونی تھی۔ نہیں بتا سکتے کہ کس طرح انگاروں پر یہ وقت گزارا۔ چھٹی ہوتے ہی، فائل وغیرہ کو بغل میں داب، ویگن میں آن بیٹھے اور آن کی آن میں ہوٹل پہنچ گئے۔ ابھی سہ پہر کی دھوپ ڈھلنا شروع ہوئی تھی۔ کمرے میں پہنچے تو آج نوٹ کیا کہ پردے کھنچے ہوئے تھے اور شیشے میں سے سہ پہر کی تیز روشنی کمرے میں آرہی تھی۔

ہم نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو ایک عجیب منظر ہماری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ہمارا کمرہ ہوٹل کی دسویں منزل پر تھا اور یہاں سے ہمیں چھٹی منزل پر بنا ہوا سوئمنگ پول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس وقت اس سوئمنگ پول میں دو عدد جل پریاں دو صورت حرام مردوں کے ساتھ چہلیں لگا رہی تھیں۔ بقول چچا غالب:

جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی

دل تو چاہا کہ یہیں سے چھلانگ مار کر سوئمنگ پول کے اندر پہنچ جائیں، لیکن کیا کرتے، ہمارے سامان میں سوئمنگ کاسٹیوم نہیں تھا۔ کان پکڑ کر باہر نکال دیے جاتے۔ ہم نے فوراً اپنی خریداری لسٹ میں سوئمنگ کاسٹیوم کا اضافہ کیا اور طنطناتے ہوئے کمرے سے باہر نکل آئے۔ چودھری صاحب کو بتایا تو وہ ابھی اسی وقت سوئمنگ پول کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ بڑی مشکل سے انہیں راضی کیا کہ بھائی جان آپ تو تیرنا بھی نہیں جانتے۔ کیا آپ پول کے باہر اپنے پورے کپڑوں میں بیٹھے تماشا

کرنا چاہیں گے؟ خود بھی تماشا بنیں گے اور ہمیں بھی پول نکالا دلوائیں گے۔

طے پایا کہ آج کا باقی دن کمپیوٹر کی خریداری پر لگایا جائے اور کل بروز ہفتہ ژورونگ برڈ پارک جا کر رنگ برنگے پرندوں سے جی بہلائیں گے۔ اس زمانے میں سم لم اسکوائر ابھی نہیں بنا تھا۔ الیکٹرانکس کی تمام اشیاء سم لم ٹاور سے یا پھر کمپیوٹر کی قبیل کی اشیاء نارتھ برج روڈ پر واقع فونان سنٹر سے مل سکتی ہیں۔ پہلے بس میں بیٹھ کر بوکے تیما روڈ اور سرنگوں روڈ کے سنگم پر واقع سم لم ٹاور پہنچے اور مارکیٹ کا جائزہ لیا۔ پھر فونان سنٹر پہنچ کر ایک دکاندار سے بھاؤ تاؤ شروع کیا۔

پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو وہاں دکان پر پہنچ کر دکاندار سے کہا تھا کہ ایک کموڈور کمپیوٹر چاہئے اور اس نے شیلف سے ایک عدد سیل بند ڈبہ نکال دیا تھا جسے لے کر خوشی خوشی ہوٹل آگئے تھے۔ یہاں پر جب ہم نے دکاندار سے کہا کہ ہمیں ایک کمپیوٹر درکار ہے تو وہ پہلے تو حیران ہو کر ہمیں دیکھنے لگا، گویا ہم نے کوئی عجیب بات کہہ دی ہو۔

بولا ”کس قسم کا کمپیوٹر چاہیے آپ کو؟“

ہم نے کہا ”جیسا ایک کمپیوٹر ہوتا ہے۔ ویسا ہی چاہیے۔“

بولا ”کچھ جزیات کی تفصیل ہے آپ کے پاس۔“

ہم نے کہا ”کمپیوٹر ایک ایسا آلہ ہوتا ہے جو بجلی سے چلتا ہے اور آٹو میٹک ہوتا ہے۔“

وہ نانہجار اب بھی نہ سمجھا، بولا ”وہ سب تو مجھے پتہ ہے لیکن آپ کو پروسسر کون سا چاہیے۔ ریم کون سی اور کتنی چاہیے۔ فلاپی ڈسک ڈرائیو کتنی درکار ہیں۔ مانیٹر کون سا چاہیے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ اور بھی بہت سی تفصیل تھی جو ہمیں اب یاد نہیں ہے۔

اس بار ہم اس کی بات نہیں سمجھے۔ لوگوں نے بیچ بچاؤ کروا دیا اور طے پایا کہ وہ جاہل شخص ہمارے لیے ایک عدد کلون آئی بی ایم پی سی ایکس ٹی بنا دے گا، جس کی جزیات کی تفصیل اس نے ایک کاغذ پر ہمیں لکھ دی تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آوے۔ ہم نے اسے پیسوں کی نقد ادائیگی کر دی اور مال کے طالب

> ICS کی فرسٹ ائر کی کتابوں میں رکھی ہوئی اسلامیات (لازمی) کا سائز دیکھ کر یوں محسوس ہوا جیسے مطالعہ کے لئے نہیں محض برکت کے لئے رکھی ہوئی ہو۔
>
> اعظم نصر

ہوئے، بولا ”کمپیوٹر آپ کو ایک ہفتے بعد ملے گا۔ اس عرصے میں میں اسے آپ کے لیے اسمبل کروں گا اور پورا ہفتہ اپنی دکان پر اسے ٹسٹ کروں گا۔“

ہم نے کہا ”یہ عجب کہی تم نے۔ پار سال جب ہم جرمنی گئے تھے تو ہاتھ کے ہاتھ دکان سے کمپیوٹر لے آئے تھے۔“

لیکن صاحب ہماری ایک نہ چلی۔ اس نانہجار نے ہماری باتوں کو سمجھنے سے صاف انکار کر دیا اور ہم ناکام و نامراد وہاں سے واپس مڑے، اگلے ہفتے تک انتظار کی کوفت اٹھانے کے لیے۔

خیر صاحب، اس بڑے کام سے فارغ ہوئے تو پھر چائنا ٹاؤن سیر کی سوجھی۔ نارتھ برج روڈ سے ہوتے ہوئے چائنا ٹاون پہنچے۔ لٹل انڈیا کی طرح چائنا ٹاؤن کا بھی اپنا ایک نرالا انداز ہے۔ ہر طرف چھوٹی چھوٹی چائنیز دکانیں کھلی ہیں۔ کہیں چائنیز جڑی بوٹیاں بک رہی ہیں تو کہیں چائنیز کھانوں کے اسٹال ہیں۔ چائنیز کھانوں کی ناقابلِ برداشت بو سے دماغ پکا جاتا ہے۔ دکانوں میں سجاوٹ کا چائنیز سامان بک رہا ہے، اسلئے کہ سنگاپور میں سیاحوں کو متوجہ کرنے کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی تہوار منایا جا رہا ہوتا ہے۔ چائنیز نئے سال کے موقعے پر تو چائنا ٹاؤن کو خاص طور پر سجایا جاتا ہے اور یہ سجاوٹ دیدنی ہوتی ہے۔ ہم چونکہ جولائی میں سنگاپور پہنچے تھے اور اگست میں سنگاپور کا قومی دن منایا جانا طے تھا، لہٰذا آجکل اس تہوار کی خوشی میں سجاوٹ کی جا رہی تھی۔ اس زمانے کا ایک مشہور گیت جو ہمیں بہت پسند آیا تھا وہ تھا ”وی آر سنگاپور“ یعنی ہم سنگاپور ہیں۔ ہمیں یہ گیت اتنا پسند آیا کہ ہم نے اس گیت پر مشتمل ایک عدد کیسٹ خرید لیا اور وطن واپس پہنچ کر اکثر اسے سنا کرتے اور سنگاپور کی یادیں تازہ کرتے تھے۔

وی آر سنگاپور
سنگاپوریز

سنگاپور آور ہوم لینڈ
اِٹس ہیئر دیٹ وی بیلونگ
آل آف اس یونائیٹڈ
ون پیپل مارچنگ آن
ان انگریزی الفاظ کے لفظی ترجمہ سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، ان جذبات واحساسات کی ترجمانی کی جائے تو امجد حسین کا گایا ہوا مندرجہ ذیل پاکستانی نغمہ بن جاتا ہے۔

ہم زندہ قوم ہیں
پائندہ قوم ہیں
ہم سب کی ہے پہچان
ہم سب کا پاکستان، پاکستان، پاکستان
ہم سب کا پاکستان

چائنا ٹاؤن میں رات کے وقت چھوٹی چھوٹی دکانوں کا ایک بازار سجتا ہے جو سیاحوں کی خاص دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹی بڑی یادگاری چیزیں وغیرہ رکھی ہوتی ہیں اور سستے داموں فروخت کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ رات گئے تک ہم اس بازار میں آوارہ گردی کرتے رہے آخر کار تھک ہار کر ہوٹل پہنچے۔

ہفتے کے روز صبح سویرے، یعنی دس بجے ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور مفت ناشتہ کو یقینی بناتے ہوئے ساڑھے دس بجے سے پہلے ہی ریسٹورینٹ میں داخل ہوگئے۔ اگر پانچ منٹ اور دیر سے اٹھتے تو ہمیں اس کی پاداش میں ناشتے کے لیے کچھ سنگاپوری ڈالر خرچ کرنے پڑ ہی جاتے۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم نے چودھری صاحب کی معیت میں بس پکڑی اور اپر بوکے تیما روڈ پر شمال کی جانب عازمِ سفر ہوئے۔ سنگاپور باغوں، پارکوں اور تفریح گاہوں کا شہر ہے۔ مشہور باغوں میں زولوجیکل گارڈن، بوٹانیکل گارڈن، چائنیز اور جاپانیز گارڈن ژورونگ برڈ پارک اور جزیرہ سینتوسا شامل ہیں۔ برڈ پارک میں رنگ برنگ کے خوشنما پرندے اپنی شان دکھا رہے ہوتے ہیں۔

برڈ پارک پہنچے تو دیکھا کہ سامنے ہی ایک ٹرینر اپنے سدھائے ہوئے اژدھے کو لیے ہوئے ایک عجیب شو دکھا رہا تھا۔

> سوچ رہا ہوں کہ چور کو کس طرح سے چور کہا جائے کہ نہ تو کسی کی توہین ہو اور نہ ہی کسی پر ذاتی حملہ تصور کیا جائے۔ ویسے بھی چوری چونکہ چوری چوری کی جاتی ہے اس لئے اس کا ثبوت فراہم کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔
>
> اعظم نصر

وہ اپنا اژدھا اطمینان کے ساتھ سیاح کے گلے میں ڈال دیتا اور اس کی تصویریں کھینچ کر اس سے پیسے وصول کر لیتا۔ بہادر تو ہم بچپن سے ہی ہیں، اس دن اپنی بہادری کو آزمانے کا خیال آیا تو خم ٹھونک کر اژدھے والے کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ اس نابکار نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، اور اپنا خوفناک اژدھا اٹھا کر ہمارے گلے میں ڈال دیا۔ یہ شاید ہماری زندگی کا بدترین دن تھا۔ واہ میاں یہ بھی خوب رہی۔ بلی کی بلا طویلے کر سر۔ ہمیں تو اس وقت صحیح محاورہ تک یاد نہیں آرہا تھا۔ خدا جانے کتنے گھنٹے وہ بلا ہمارے گلے سے لپٹی رہی اور وہ نابکار سپیرا مختلف پوز بنا بنا کر ہماری تصویریں کھینچتا رہا۔ ادھر چودھری صاحب بھی مختلف زاویوں سے ہمیں دیکھ دیکھ کر ہماری اس بے بسی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو۔ ہمیں جتنی دعائیں یاد تھیں، ہم نے وہ سب دل ہی دل میں دہرانا شروع کردیں۔ آخر کار خدا خدا کرکے اس مصیبت سے نجات ملی اور سپیرے نے اس خطرناک ترین اژدھے کو ہمارے گلے سے نکالا تو ہم نے یوں زندہ بچ جانے پر اللہ رب العزت کا شکر ادا کیا، جوں توں کرکے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس نکالا اور منہ مانگے ڈالر اس موذی کی نذر کیے۔ ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ دوبارہ اس اژدھے کو ہمارے گلے نہ منڈھ دے۔ اب چودھری صاحب کی باری تھی لیکن وہ اس مشکل صورتِ حال میں پھنسنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوئے اور بھاگ کر سپیرے کی پہنچ سے دور جا کھڑے ہوئے۔

آگے بڑھے تو شہباز کے شو کا وقت ہو چلا تھا۔ ایک کھلی جگہ پر لوگ شہباز کے ٹرینر کو گھیرے کھڑے تھے۔ اس نے لوگوں کو دور ایک اونچے درخت کی سب سے اونچی ٹہنی پر بنایا ہوا شہباز کا بسیرا

دکھایا اور اعلان کیا کہ شہباز اس کی آواز پر لپکتا ہوا اس کے پاس آئے گا اور اس کے ہاتھ سے گوشت کی بوٹی لے جائے گا۔ اور یوں ہی ہوا۔ وقتِ مقررہ پر شہباز کے گھر کا دروازہ کھولا گیا، ٹرینر نے اسے پکارا اور وہ ایک اونچی اڑان لے کر جھپٹتا ہوا آیا اور ٹرینر کے ہاتھ سے گوشت کا پارچہ لے اڑا۔ پھر جب وہ اس پارچے کو اطمینان سے کھا چکا تو ایک لمبی اڑان لے کر دوبارہ اپنے ٹرینز کے کندھے پر آ بیٹھا اور داد سمیٹی۔ ہم نے بھی ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کے ساتھ مل کر خوب دل کھول کر اس پرندے کو اور اس کے ٹرینز کو سراہا۔ ہمیں علامہ اقبال کا شعر یاد آ گیا جو انھوں نے شاید ہمارے سنگاپور کے اس سفر میں شہباز کے اس مظاہرے کے لیے ہی لکھا تھا۔

جھپٹنا، پلٹنا، جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

سنگاپور آ کر نقلی رنگین پرندے تو بہت دیکھے تھے، یہاں پر آ کر ہم نے جی بھر کے اصلی رنگین پرندے دیکھے۔ جب یہاں سے خوب دل بھر گیا تو ہم نے روانگی کا پروگرام بنایا اور وہاں سے نکل کر سیدھے جزیرے کی دوسری جانب، چائنا ٹاؤن کے قریب دریائے سنگاپور کے کنارے پہنچے۔ نارتھ برج روڈ اور ساؤتھ برج روڈ کے سنگم پر دریا کے اوپر ایک نہایت خوبصورت پل بنایا گیا ہے اور اسی پل کی مناسبت سے ان دونوں سڑکوں کا نام رکھا گیا ہے۔

وہیں سے ہم پیدل چلتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں پر سر اسٹیمفورڈ ریفلز نے پہلی مرتبہ سنگاپور کی سرزمین پر قدم رکھا تھا۔ یہاں اب حکومت نے سر ریفلز کا ایک قد آدم مجسمہ کھڑا کر دیا ہے جو اس واقعے کی یاد دلاتا ہے۔

اب سے سینکڑوں سال پہلے جب علاقے میں ملاکا کی اسلامی سلطنت کا قیام عمل میں لایا گیا اور وہ علاقے کی ایک قابلِ ذکر تجارتی منڈی بن گیا، تو سنگاپور اس سلطنت کا ایک حصہ بنا، بالآخر ۱۵۱۱ء میں ملاکا پرتگیزوں کے ہاتھوں فتح ہوا تو سنگاپور اس کی عملداری سے نکل کر جوہور بھارو کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ ۱۸۱۹ء میں سر ٹامس اسٹیمفورڈ بنگلے ریفلز نے اس جزیرے پر اتر کر اسے برطانوی عملداری میں دیدیا۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد اسے ۱۹۴۹ء میں محدود خود مختاری دی گئی۔ پھر جب ۱۹۶۵ء میں برطانوی حکومت نے اس علاقے کو چھوڑا اور ملائشیا آزاد ہوا تو اسے بھی ملائشیا سے الگ کر کے ایک الگ ریاست کی شکل دیدی گئی۔

یہاں سے چلے تو مرلائن پارک پہنچے جہاں پر سنگاپور دریا کے دہانے پر مرلائن کا ایک مجسمہ نصب کیا گیا ہے جس کا سر شیر کا اور دھڑ مچھلی کا ہے۔ یہ سنگاپور کا قومی نشان ہے۔ کچھ دیر تو ہم اس مجسمے کے منھ سے ابلتے ہوئے پانی کو دیکھتے رہے اور پھر ہوٹل واپسی کا پروگرام بنایا۔

عمر

ریل کے سفر میں سب سے اوپر والی برتھ پر مجاز، درمیان میں جوش ملیح آبادی اور نچلی برتھ پر فراق گورکھپوری سفر کر رہے تھے۔ معاً جوش نے فراق سے پوچھا ”رگھوپتی اس وقت تمہاری عمر کیا ہوگی۔“

فراق نے جواب دیا ”یہی کوئی دس برس۔“

جوش خاموش ہوگئے تو فراق نے جوش سے پوچھا ”شبیر حسن تمہاری عمر کیا ہوگی۔“

جوش نے برجستہ جواب دیا ”یہی کوئی پانچ چھ سال۔“

اس پر اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے مجاز نے اپنا منہ چادر میں چھپاتے ہوئے کہا ”بزرگوار مجھ سے عمر مت پوچھنا کیونکہ میں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔“

میجر عاطف مرزا

سیاحت

زندگی خالق کائنات کی وہ نعمت ہے جسے بالعموم کائنات میں اور بالخصوص زمین پر ہر جگہ پر اتارا گیا۔ بے آب و گیاہ ریگستانوں سے سرسبز وشاداب میدانوں تک، اونچے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں سے لے کر پاتال سے معانقہ کرتے ہوئے گہرے سمندروں میں زندگی کا وجود روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ جس کا یقین حرکت کی موجودگی سے کیا جاسکتا ہے۔ پڑا پڑا تو پتھر بھی بھاری ہوجاتا ہے۔ حضر پہ نظر اور سفر سے مفر کاہلی کی علامت ہے، ایک گھر میں رہنے والے باہر سے قطع تعلق کرلیں تو ان کی زندگی رک جاتی ہے۔ زندگی کو رواں دواں رکھنے کے لیے آوارہ گردی ضروری ہے۔ آوارہ گردی ذرا سٹائل سے کی جائے تو یارانِ نیک نام اِسے سیاحت کا نام دے دیتے ہیں۔ سیاحت سفر کی وہ قسم ہے جس میں صعوبتوں سے بھی لطف اٹھایا جاتا ہے، یہ خالصتاً بے سکونی کی زندگی سے نکل کر کسی دوردراز علاقے میں جاکر بے سکون ہونے کا نام ہے۔ سیاحت اور آوارہ گردی میں شاید ہلکا سا فرق ہو مگر جب یہ دونوں ایک ہی شخص کی عادت کا درجہ حاصل کرلیں تو پھر کہاں کے سفر اور کون مقیم......!!؟؟

آوارہ گرد سیاح کبھی کسی ابن بطوطہ کے تعاقب میں نہیں نکلتے، وہ کبھی واسکوڈے گاما بھی بننا پسند نہیں کرتے کہ اُن کی 'غلطی' کی سزا تاریخی یا سیاسی طور پر حال اور مستقبل کی نسلوں پر عذاب کی صورت مسلط رہے۔ ہاں جہاں وہ جاتے ہیں وہاں کا پتا وہ جدی پشتی آوارہ گردوں کو ہی دیتے ہیں۔ اُن کے یقین کے مطابق کم ظرف سیاح اُس جنت نظیر مقام کی بے حُرمتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ تارڑ صاحب اور بیشتر سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کچھ کم ظرف سیاحوں کی طرف سے کی جانے والی بے حرمتیوں کا ذکر بڑے رقت آمیز انداز میں کیا ہے۔ پاکستان کے کئی پُر فضا مقامات ایسے ہیں جن کے بارے میں بڑے جید سیاحوں نے یہ فیصلہ لکھا ہے کہ اُن مقامات کو انسانوں کی دسترس اور پہنچ سے دور اور محفوظ کر دیا جائے، تاکہ آئندہ مشینی دور کی نسلوں کو ماضی کی خوب صورت یادوں کے نمونے کے طور پر دکھایا جاسکے۔ پاکستان کے علاوہ سری لنکا، نیپال، بنگلہ دیش، بھارت، تھائی لینڈ، ملائشیا، یونان، اٹلی، امریکہ، برطانیہ اور دوسرے ممالک میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں سیاحوں کے قدم راستوں سے پہلے پہنچے۔ سیاحوں کے تخلیق کردہ اِن راستوں پر اُن کے شاگرد اور مقلد بھی پہنچے۔ مگر کچھ مقامات پر اِنہی راہوں سے ہوتے ہوئے غلیظ جسموں اور مکروہ سوچوں والے سبز قدم پہنچے تو وہاں کی عفت اور حرمت ایسے پامال

ہوئی جیسے کوئی شریف زادی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر بے حال ہوئی۔

سیاحت کسی بھی ملک میں دولت، علم اور رواج لے کر داخل ہوتی ہے اور وہاں کے علاقوں اور لوگوں کے حسن اور حسنِ سلوک کے قصے لے کر واپسی کا رُخ کرتی ہے۔ سیاح کے لیے پیشے، مقام، قبیلے، ذات، تعلیم، مذہب، عہدے کی کوئی قید نہیں۔ ہاں یہ تمام چیزیں سیاحت کے انداز پر ضرور اثر انداز ہوتی ہیں۔ سیاح دنیا کا وہ شخص ہوتا ہے جو خوار ہونے کی بھی قیمت ادا کرتا ہے، اور اُسے ایڈونچر کا نام دے کر اپنے پیسے پورے کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تقریباً ہر سیاح اپنے تازہ ترین سفر کو سب سے بُرا اور بے آرام گردانتے ہوئے آئندہ سیاحت سے توبہ کر لیتا ہے۔ مگر کچھ روز بعد اِسے یہ آرام و آسائش کاٹنا شروع کر دیتے ہیں تو وہ اپنا بوریا بستر گول کر کے پھر سے خواریوں کا سفر اختیار کر لیتا ہے۔

کہتے ہیں کہ پہلے سیاح اپنے سفر کی کارگزاری زبانی یاد رکھتے تھے اور زبانی ہی دوسروں کو سُنا کر لطف اندوز ہو لیا کرتے تھے۔ پھر کسی ایک سیاح نے اپنے چیدہ چیدہ واقعات کی تفصیل کو کاغذی یادداشت کے طور پر محفوظ کرنا شروع کر دیا اور پھر یاروں دوستوں کے اُکسانے پر اُس نے وہ رُوداد کتابی صورت میں چھاپ دی، ایسے سفرنامے کا آغاز ہوا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سفرناموں کا فیشن سامنے آیا۔ فی زمانہ اصلی سفرنامے خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سفرنامے کو دوام بخشنے میں ادیب قسم کے سیاحوں نے اہم کردار ادا کیا، انھی کی کوششوں سے سفرنامے کو ادب کا حصہ تسلیم کر لیا گیا۔ سفرنامہ لکھنے کے دو طریقے ہیں، پہلا کہ آپ سیر و سیاحت کریں، نگر نگر گھومیں اور پیش آنے والے تمام واقعات کو اپنے احساسات کے ہمراہ کاغذ پر منتقل کر دیں۔ دوسرا کچھ مختلف ہے اور اِسے فکشن یا کہانی نگاری کے علاوہ کوئی اور نام دینا سفرنامے کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ دنیا کا نقشہ کھولا، ایک دو مقامات چنے، اپنے شہر سے وہاں تک کے فاصلے ناپے، راہ میں پڑنے والے علاقوں اور لوگوں کے بارے میں ذرا سی تفصیل

۱

۲

۳

۴

شوہر کے سوا

کلکتہ کی مشہور مغنیہ گوہر جان ایک مرتبہ الہ آباد گئی اور جانکی بائی کے مکان پر ٹھہری۔ جب گوہر جان رخصت ہونے لگی تو اپنی میزبان سے کہا کہ میرا دل خان بہادر سید اکبر حسین سے ملنے کو بہت چاہتا ہے۔
جانکی بائی نے کہا ”آج میں وقت مقرر کرلوں گی کل چلیں گے۔“
چنانچہ دونوں دوسرے دن اکبر الہ آبادی کے ہاں پہنچیں۔ جانکی بائی نے تعارف کرایا اور کہا کہ یہ کلکتہ کی نہایت مشہور و معروف مغنیہ گوہر جان ہیں۔ آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا لہٰذا ان کو آپ سے ملانے لائی ہوں۔
اکبر نے کہا ”زہے نصیب، ورنہ نہ میں نبی ہوں، نہ امام، نہ غوث، نہ قطب اور نہ کوئی ولی جو قابلِ زیارت خیال کیا جاؤں۔ پہلے جج تھا اب ریٹائر ہو کر صرف اکبر رہ گیا ہوں، حیران ہوں کہ آپ کی خدمت میں کیا تحفہ پیش کروں“
گوہر نے کہا ”یادگار کے طور پر ایک شعر ہی لکھ دیجئے۔“
اکبر الہ آبادی نے کاغذ پر یہ لکھ کے حوالے کیا:

خوش نصیب آج بھلا کون ہے گوہر کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا

کسی کتاب یا انٹرنیٹ سے حاصل کی۔ کہیں اور سے رسوم و رواج کا حال معلوم کیا، پھر اِسے ایک خود ساختہ افسانے کے مکس کیا، تھوڑا سا مزاح کا تڑکا لگایا، چھ سات دوستوں کے نام ڈالے، کچھ فرضی کردار و واقعات ترتیب دیے اور یوں ایک معرکتہ الآراء سفر نامہ تخلیق کر کے ادب کے حوالے کر دیا۔ کچھ روپے پیسے یا پی آر والے تو اِس سفر نامے کی تقریبِ اجراء یا رونمائی کر کے اِسے ادب پر ایک احسانِ عظیم ثابت کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔
سیاحت کچھ ممالک میں باقاعدہ صنعت کا درجہ رکھتی ہے اور اِسے مِن حیث القوم اِسے پروان چڑھایا جاتا ہے۔ فروغِ سیاحت کے لیے کئی باقاعدہ محکمے کام کرتے ہیں۔ سیاحوں کو سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بہت سے لوگ بڑی تن دہی سے مصروفِ عمل دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ ممالک میں تو یہ تندہی سیاحوں کو لُوٹنے کے لیے برتی جاتی ہے۔ سادہ لوح سیاحوں کو سو (۱۰۰) روپے کی چیز پانچ سو (۵۰۰) کی بتا کر تین سو (۳۰۰) میں فروخت کر دی جاتی ہے، اِس لیے طرح طرح کے حربے اور حیلے بہانے کیے جاتے ہیں۔
سیاحت کو کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ اِسی وجہ سے کچھ اقوام سیاحت کے نام سے بھی چڑتی ہیں۔ سیاحوں کو مختلف مقامات کی تاریخ وغیرہ سے رُوشناس کرانے کے لیے گائیڈ ہر ملک میں مل جاتے ہیں۔ یہ مسٹر گائیڈ عموماً چرب زبان، شاطر اور کایاں ہوتے ہیں، بلکہ اس شعبے میں آتے ہی ایسے لوگ ہیں۔ یہ لوگ کسی بھی گھٹیا سے مقام کو گھی میں تلی دال کے مصداق کسی بڑے آدمی سے ملا کر پیش کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ سیاحوں کے روپ میں کئی طرح کے لوگ کسی بھی ملک میں داخل ہوتے ہیں جن میں جاسوس اور طلباء سرِفہرست ہیں۔ مزدور طبقہ کسی بھی ملک میں داخلے کے لیے وزٹ ویزہ استعمال کرتا ہے۔ سیاح دورانِ سفر اپنی یا کسی کی قسمت بھی بدل دیتے ہیں، ایسا عموماً عاشق مزاج قسم کے سیاح کرتے ہیں۔
ہر سیاح مسافر ہوتا ہے جب کہ ہر مسافر سیاح نہیں ہوتا۔ سیاح کے بنیادی مقاصد میں سفر شامل ہوتا ہے جب کہ مسافر کے مقاصد میں سیاحت کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ سیاحت پہلے پہل ایک چسکہ ہوتی ہے، بعد میں عادت اور پھر ضرورت یا مجبوری بن جاتی ہے۔ سیاحت میں آرام و آسائش کی تلاش میں نکلنے والوں کو سکون تو کیا سیاحت بھی نصیب نہیں ہوتی۔ جب کہ خالصتاً سیاحت کی کھوج میں نکلنے والے کو خواری بھی آسائش لگتی ہے اور وہ بخوشی اِس خواری سے استفادہ کر کے اگلے سفر کے لیے زادِ راہ کر لیتا ہے۔ سیاحت کے لیے کئی عادات کی ضرورت پڑتی ہے جن میں سے ایک پاگل ہونا بھی ہے۔ سیدھی سی بات ہے آسانیاں چھوڑ کر مشکلات کی تلاش میں نکلنا، خانماں خراب ہونا پاگل پن ہی تو ہے۔

محمد اشفاق ایاز

پہیئے اور گدھے

کہتے ہیں کہ جدید سائنس کی بنیاد پہیے کی ایجاد تھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ پہیہ گول ہوتا ہے اور روٹی بھی گول ہوتی ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ انڈے اور مرغی کی بحث کی طرح روٹی پہلے ایجاد ہوئی تھی یا پہیہ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس وقت کے کسی شغلی سائنسدان نے پتھر کو روٹی کی شکل دی ہو۔ جب پتھر کی اس روٹی نے لڑھکنا شروع کیا تو یار لوگوں نے اسے اپنے تفریحی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ پتھر کے دور کا یہ کھیل ذرا مختلف شکل میں اب بھی باقی ہے۔ گلی محلے کے بچے سائیکل یا موٹر سائیکل کا ٹائر لے کر اسے ڈنڈے کی مدد سے بھگاتے چلے جاتے ہیں۔ قدم دو چار قدم پر جب اس کی رفتار سست ہونے لگتی ہے تو چھڑی یا ڈنڈا رسید کر کے اسے اس کی اوقات یاد دلا دیتے ہیں۔

پتھر کی روٹی کا لڑھکنا تھا کہ کھیل ہی کھیل میں لوگوں نے اس کے سفری استعمال کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ لیکن پتھر تو پتھر ہی ہوتا ہے۔ اور پتھر بھاری ہوتا ہے۔ اس کے لڑھکنے کی راہ میں کئی دشواریاں پیش تھیں۔ بعد کی تحقیق میں لکڑی کے استعمال پر غور کیا گیا۔ یوں لکڑی کے پہیے بننا شروع ہو گئے۔ ان کا وزن ہلکا اور استعمال بھی آسان ہو گیا۔ جب پہیہ ایجاد ہو گیا تو ہتھ گاڑیاں اور چھکڑے وجود میں آنے لگے۔ پہلے تو ان گاڑیوں کو انسان کھینچتے تھے۔ پھر یہ بھی ایک مشکل کام نظر آنے لگا۔ تو جن جانوروں کو سامان ڈھونے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ انہیں ان جدید گاڑیوں میں جوت کر کام چلایا گیا۔ ان میں زیادہ تر گھریلو جانور استعمال ہونے لگے۔ کیوں کہ ان میں انسان کی خدمت کا جذبہ کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا۔ گائے، بھینس، گھوڑے کے خاندان کے جانور اس خدمت کے لئے سرفہرست ٹھہرے۔

گائے اور بھینس خاندان کے جانوروں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ جب تک چاہا انہیں گاڑی میں بطور بغیر پٹرول چلنے والے انجن کی طرح استعمال کیا۔ جب دیکھا کہ ان میں مزید کام کی سکت نہیں رہی، تو اس سے لذت کام و دہن

ایک دفعہ ڈاکٹر دین محمد تاثیر نے ہری چند اختر سے پوچھا ”یار پنڈت، سُنا ہے تُو حفیظ کا شاگرد ہے۔“

اختر صاحب نے کہا ”ہاں یار، ٹھیک سُنا ہے تُو نے، اُن سے اکثر تصیحِ شعری کے لئے ملاقات رہی ہے۔“

تاثیر نے برجستہ کہا ”دھت تیرے کی۔۔۔ میں تو تیری بڑی عزت کرتا تھا۔“

کا کام لے لیا۔ دوسری طرف گھوڑے کا خاندان بھی عوامی خدمت میں کسی سے کم نہ تھا۔ جب چاہا اسے گاڑی کے آگے جوتا اور جب چاہا اس پر سوا ہو کے سیر کو نکل پڑے۔ اب گھوڑا مانے یا نہ مانے، گدھا اس کا قریبی رشتہ دار ہے۔ بلکہ گدھا ہونے کے باوجود اس کا استعمال گھوڑے سے زیادہ چلا آ رہا ہے۔ تاہم ستم ظریفی یہ تھی کہ خواہ گھوڑا ہو یا گدھا یہ اسی وقت تک انسان کو پیارا لگتا تھا جب تک یہ اس کے کام آتا تھا۔ ذرا بیمار ہوا، یا بڑھاپے میں قدم رکھا، اسے دیس نکالا دے کر کسی کھیت میں یا سڑک کنارے مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس ناروا سلوک پر یہ احتجاج بھی نہ کر سکتے تھے۔ جہاں کسی کھیت میں، سڑک کنارے یا گلی کی نکڑ پر دو چار ”بزرگ“ گدھے مل بیٹھتے تو نظروں ہی نظروں میں یہی سوال کرتے ”ہمارا کیا بنے گا“۔ یوں بیچارا گھوڑا یا گدھا ہزاروں خواہشیں دل میں لئے آہستہ آہستہ موت کی وادی میں اتر کر کووں، چیلوں اور گدھوں کے پیٹ میں چلا جاتا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ شیر بھی جانور ہے اور گدھا بھی۔ شیر درندگی اور خوف کی علامت ہے جبکہ گدھا معصومیت اور مظلومیت کی۔ شیر کا تصور آتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جبکہ گدھا سامنے سامنے ہو تو اس کی پیٹھ پر دو چار ڈنڈے برسانے کو جی چاہتا ہے۔ دوسری طرف ستم ظریفی یہ ہے کہ شیر کی ہیبت ناکی کے باوجود لوگ بڑے شوق سے اپنا نام ”شیر خان“، ”شیر محمد“ اور ”شیر بچہ“ رکھنا پسند کرتے ہیں۔ آج تک کسی نے اپنا نام ”گدھا“ نہیں رکھا۔ سوائے سکولوں میں ”ماسٹر جی“ کے عطا کردہ نام کے۔ سبق نہ آنے پر جب ماسٹر جی ایک ہاتھ سے کان پکڑتے، دوسرے سے مولا بخش لہراتے اور زبان مبارک سے ”اوئے کھوتے دیا پترا“ کہتے تو کتنا بھلا معلوم ہوتا۔ بعض شاگرد کچھ ضرورت سے زیادہ ہی ذہین ہوتے ہیں۔ ایک استاد نے ایک ایسے ہی ذہین شاگرد سے کہا ”تم گدھے کی اولاد ہو“ شاگرد بغیر جواب دئے اپنے پاؤں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اور بولا ”سر جی مگر میرے پاؤں تو انسانوں کی طرح ہیں“۔

گدھا ایک ایسا جانور ہے جو سارا دن گالیاں اور ڈنڈے کھا کر بھی بے مزہ نہیں ہوتا۔ وہ اتنا سادہ ہے کہ صبح سے شام تک مالک کے ڈنڈے کھاتا ہے۔ اور شام کو اس کی کھرلی سے چند خشک دانے کھا کر ساری مار بھول جاتا ہے۔ اور دوسری صبح پھر سر جھکائے اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں تک کھڑا ہوتا ہے۔ گدھا ایک ایسا جانور ہے جو پیدائش سے وفات تک گدھا ہی رہتا ہے۔ بلکہ انسانوں میں بھی ”کچھ“ گدھے بنا دیتا ہے۔

پھر جوں جوں زمانے نے ترقی کی ہے۔ چھکڑوں کی جگہ گاڑیاں آ گئیں، لکڑی کے پہیوں کی جگہ ربڑ کے ٹائر گھومنے لگے، ان گاڑیوں کو سڑکوں پر رواں دواں رکھنے کے لئے گائے، بھینس، گھوڑے اور گدھے کی جگہ انجن کھینچنے لگے۔ ایک بات قابل ذکر رہی کہ اس افراتفری اور زوال پذیری کے دور میں بھی گائے اور بھینس کی قدر و منزلت کم نہ ہوئی۔ کیونکہ ان کا دودھ ”انسانی ماؤں“ کے دودھ سے کہیں زیادہ قیمتی اور درجہء فضیلت پر تھا۔ ایسے میں گھوڑوں اور گدھوں کو خوشی سے ہنہنانے اور دولتیاں جھاڑ کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرتے دن قصہء ماضی بنتے محسوس ہونے لگے۔ ان کا استعمال کم سے کم ہونے لگا تھا۔

کہتے ہیں بارہ سال بعد روڑی کی بھی سنی جاتی ہے۔

لیکن گدھے کی دعا کی قبولیت میں کئی صدیاں بیت گئیں۔
جدید دور کے پھیلتے کاروبار، شہر شہر قریہ قریہ قائم ہوٹلوں، شادی ہالوں اور فوڈ سٹریٹس میں گوشت کے پکوانوں کی مانگ میں بھی اضافہ ہوا۔ طلب اور رسد کی اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے غور شروع ہوا۔ اسی غور وفکر میں غلطاں ایک ''ہوٹلی ماہر غذائیات'' کی نظر دور کھیتوں میں آخری سانسیں لیتے ایک گدھے پر پڑی۔ ایک خیال اس کے دماغ میں کوندا۔ اور بس وہ اپنے تجربے کو آخری شکل دینے کے لئے رات کا انتظار کرنے لگا۔ اسے گویا انسانیت کی بقا کا پتہ چل گیا تھا۔ رات ہوئی، وہ کھلا میدان لیبارٹری بن گیا۔ اور اس نامعلوم سائنسدان کے خدمت انسانی کے جذبے سے وہ گدھا بے موت مرنے سے بچ گیا اور دوسرے بڑے شہر کے بڑے ہوٹل میں آنے والوں کے پیٹ میں اتر گیا۔ تجربہ کامیاب رہا۔ ''ماہر غذائیات'' کی کوششوں سے راندہ ءدرگاہ بنتے گدھے، دن کی روشنی میں نہ سہی، راتوں رات درجہ ءقبولیت کو پہنچ گئے۔ جدید دور میں گدھے کے گوشت کا ہوٹلوں اور فوڈ سٹریٹس میں استعمال ایسی دریافت تھی ۔ جو پتھر کے زمانے سے لے کر اب تک کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ یا شائد کم انسانی آبادی اور گائے بھینس کی وافر موجودگی کی وجہ سے لوگوں نے اس طرف دھیان نہیں دیا ہوگا۔

بات آگے بڑھی تو گدھے کی افادیت پر کئی اور حلقے بھی غور وفکر کرنے لگے۔ امریکہ میں ایک پارٹی کا مستقل انتخابی نشان گدھا ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان کا لیڈر گدھوں کا لیڈر ہے۔ حالیہ دنوں میں گدھوں کو خودکش حملوں میں بھی کامیابی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے وقت کے ساتھ ساتھ گدھوں کی افادیت اور استعمال پر مزید تحقیق جاری رہے گی۔

نوید ظفر کیانی / بی سی لیز

اِس طرح تو ہوتا ہے

دوسرا ایکٹ

منظر: وہی منظر جو پہلے ایکٹ میں تھا، پیکٹ میز پر سلیقے سے رکھے جا چکے ہیں، ہیرس گرد جھاڑتا ہوا نظر آتا ہے۔

ہیرس (اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے) میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا، مالک نے پہلے کبھی اِس طرح کا رویہ اختیار نہیں کیا، کم از کم جب سے میں اُنہیں جانتا ہوں، پتہ نہیں اُن کے ذہن میں کیا پک رہا ہے؟ بہر حال جو کچھ بھی ہے، اُن کے ذہن کا ہی کیا دھرا ہے۔ (سر کھجاتا ہے) آج کل تو موصوف کچھ زیادہ ہی انہونیاں بکھیرتے جا رہے ہیں۔ اب اسی کو لے لیجئے، ہر بات کا ملبہ میرے سر ڈال دینا، اُن کاموں کا بھی جو میں نے نہیں کئے، اور طوطوں کے متعلق موشگافیاں کرنا اور مجھ سے تقاضہ کرنا کہ میں اُنہیں پکڑ کر بھی لاؤں اور یہ کہ جب تک میں اُسے پکڑ نہ لوں، اُنہیں شکل بھی نہ دکھاؤں، یہ تو بندے کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگانے کے مترادف ہوا۔ میں تو کبھی دوبارہ اُنہیں اپنی شکل نہیں دکھاتا اگر مادام کا معاملہ نہ ہوتا، اور ان پیکٹوں کو یہاں نہ پہنچانا ہوتا (میز پر رکھے ہوئے پیکٹوں کو دیکھتا ہے) ذرا دیکھئے تو سہی، میں یہ سبھی پیکٹ باہر سے اٹھا کر لایا ہوں اور یقین مانئے اِنہیں لانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا، لیکن ان میں ہے کیا؟ (جائزہ لیتا ہے)

(اسٹیج کے دروازہ نمبر دو سے کمفرٹ داخل ہوتا ہے)

کمفرٹ (تیز آواز میں) ہیرس (ہیرس چونک کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے) اِن پیکٹوں کو ہاتھ مت لگانا!

ہیرس نہیں جناب، میں تو صرف۔۔۔ آپ کب آئے؟

کمفرٹ تمھیں ہر قسم کی حماقت پر پرہیز کرنا چاہئیے (میز کی طرف جاتا ہے)

ہیرس حماقت؟ کیسی حماقت جناب؟

کمفرٹ (غصے سے) نکل جاؤ کمرے سے!!

ہیرس نہیں جناب، میں کوئی حماقت نہیں کر رہا تھا!

کمفرٹ میں کیا کہہ رہا ہوں، کمرے سے نکل جاؤ!!

ہیرس (آہستگی سے) جی جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) میرا خیال ہے کہ مالک کے اوپر والے خانے میں کچھ گڑ بڑ ہو گئی ہے! (باہر کی جانب جانے لگتا ہے)

کمفرٹ (پکارتا ہے) ہیرس!

ہیرس (رُکتے ہوئے) جی جناب؟

کمفرٹ (کرسی پر دراز ہوتے ہوئے) تم غالباً یہ سوچ

رہے ہو کہ میں کچھ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ آج میرا طرزِ عمل کچھ مناسب نہیں ہے؟

ہیرس: لگ تو کچھ ایسا ہی رہا ہے، لیکن یقین مانئے جناب! میں ایسا سوچ نہیں رہا ہوں۔

کمفرٹ: (دھاڑتے ہوئے) کیا؟

ہیرس: مم میرے کہنے کا مطلب ہے جناب کہ میں سوچنے والا کون ہوتا ہوں، آپ مالک ہیں جیسا چاہیں، کریں!

کمفرٹ: اچھا؟ تو جو چاہوں کرسکتا ہوں؟؟

ہیرس: جی جناب!

کمفرٹ: (خشک لہجے میں) اطلاع کا شکریہ!

ہیرس: (حیرانی سے) جی جناب؟

کمفرٹ: میں نے کہا، تمھارا شکریہ!

ہیرس: جی، جی، جی جناب! (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) قسم لے لیں جو مجھے پتہ ہو کہ مالک شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہیں۔

کمفرٹ: شائد دو تین ایسی باتوں پر بھی میں نے تمھاری سرزنش کر ڈالی ہے جو تم سے سرزد ہی نہیں ہوئی تھیں۔

ہیرس: جی جناب، اب آپ نے یہ تذکرہ چھیڑ ہی دیا ہے تو مجھے یہ کہنے کی اجازت بھی دیجئے کہ آپ نے دو تین ایسی باتوں کا بھی مجھ سے کہا ہے جس کے بارے میں میں ابھی تک کنفیوز ہوں کہ آپ کا مطلب کیا تھا؟

کمفرٹ: (پُر تفکر انداز میں) ہاں کچھ باتیں ایسی تھیں تو، لیکن ان سے اغماز بھی تو برتا نہیں جاسکتا تھا۔

ہیرس: جی جناب (ہچکچاتے ہوئے) مم۔۔۔ میں کیا پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون سا طوطا تھا جس کو میں نے پروں سے پکڑ کر آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھا؟

کمفرٹ: اُس طوطے کا تذکرہ تو اب جانے ہی دو، وہ طوطا ایک نہایت اوپری پچوئیشن کا حصہ تھا (پیسے دیتے ہوئے) یہ کچھ پیسے ہیں، رکھ لو!

ہیرس: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مالک تو واقعی سٹھیا گئے ہیں۔

کمفرٹ: اور یاد رکھنا کہ کسی سے بھی اس گفتگو کا تذکرہ نہیں کرنا ہے، کسی سے بھی، سمجھ گئے ناں، دوسرے کسی ملازم سے بھی، اب تم کمرے سے جاسکتے ہو۔

ہیرس: شکریہ جناب (کمرے سے نکل جاتا ہے)

کمفرٹ: خدا کی پناہ، کتنا کوڑھ مغز ہے یہ شخص بھی۔۔۔ یہ رہا میرا ڈرامہ، میں تو اِسے تقریباً بھول ہی بیٹھا تھا، ظاہر ہے دوسری ڈرامہ بازیوں سے فرصت ملتی تو اِس پر نظر جاتی، لیکن دوسرے ڈراموں نے تو میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔ جب سے میں نے اپنے ڈپلومیٹک کیرئر کا آغاز کیا ہے۔۔۔ میں اِس سلسلہ ہائے خرافات کو شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈپلومیسی کا نام دئے دیتا ہوں، ویسے بھی ڈپلومیٹ لوگوں کا کام جھوٹ بولنا ہی تو ہے، کبھی دوسروں کے سامنے اور کبھی خود اپنے لوگوں سے۔۔۔ خیر، تو میں نے آج اِس قدر جھوٹ بولے ہیں کہ اب وہ کسی سبیل کی صورت خود ہی جاری ہو گئے ہیں، بغیر میری مدد کے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُن جھوٹوں نے خود ہی مجھ سے خود کو کہلوایا تھا اور اس کثرت سے کہلوایا تھا کہ اب اُنھیں گِننا دشوار ہو گیا ہے۔۔۔ جھوٹ بولنا نہایت کمینگی کا کام ہے لیکن ان کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ویسے بھی جھوٹ بولنے میں کون سے میرے پیسے لگتے ہیں۔ اور اگر کسی دن مجھے ان کی قیمت ادا کرنی پڑی تو غضب ہو جائے گا کیونکہ اُس وقت تک ان کی مقدار اس قدر ہو جائے گی کہ الامان الحفیظ کیونکہ اس کا کھاتا مسلسل جاری و

ساری ہے، کسی بڑے بیوپاری کے کاروباری کھاتے کی طرح۔ اب جب کہ ایڈتھ واپس لوٹ آئی ہے تو میرا پول بھی کھلنے کو ہے، کم از کم اُس کے ذہن میں تو بہت سے سوالات ہوں گے، لیکن یہ واپس اِتنی جلدی آ کیسے گئی؟ ظاہر ہے کہ اُس نے گاؤں سے اسٹشنری بھی خریدی ہوگی۔ لگتا ہے کہ اسٹشنری کی دکان والا کچھ ضرورت سے زیادہ ہی چست ہے۔۔۔ میں تو اس کی واپسی کے بعد اس سے کسی بارے میں کوئی بات نہیں کر سکا ہوں، موقع ہی نہیں مل سکا ہے مجھے اس کا، اور سچ پوچھیں تو مجھے ہمت بھی نہیں ہے اس کا سامنا کرنے کی (مسز کمفرٹ اسٹیج کے دروازہ نمبر ایک سے داخل ہوتی ہے اور داخلی دروازے کی جانب بڑھتی ہے)

کمفرٹ (اُٹھتے ہوئے) لو بھئی، وہ وقت بھی آن پہنچا، یا شیطان تیرا ہی سہارا (اس کے راستے میں آتے ہوئے) او ایڈتھ!

مسز کمفرٹ (بے نیازی سے) جی!

کمفرٹ (اس کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے) میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ کہ تم نے کیا ان کاغذ کے رموں کی ادائیگی کر دی تھی؟

مسز کمفرٹ مجھے آپ سے بات نہیں کرنی۔

(باہر نکل جاتی ہے)

کمفرٹ لو جی، اس عزت کی کسر تھی۔۔۔ (میز پر بیٹھ جاتا ہے) (ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) ہاہاہا، میرے ٹھینگے سے، ویسے مذاق اچھا کر لیتی ہے میری بیوی (پھیکے انداز میں دوبارہ ہنستا ہے) ہاہاہا (قلم اٹھاتا ہے) اب مجھے کچھ لکھنا وکھنا بھی چاہئے (لکھنے لگتا ہے)

(میریکیل دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوتا ہے، ابھی تک اُسی جوکروں والے لباس میں ہے)

کمفرٹ (قلم کو دور پھینکتے ہوئے) آخر لکھوں تو کیا لکھوں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا!

میریکیل چھوڑو یار! مجھے پتہ ہے کتنے شیکسپئر ہو تم، اور ہاں، اِتنا شور شرابا مت کرو، تم اُنہیں جگا دو گے!

کمفرٹ جگا دوں گا؟ کسے جگا دوں گا؟؟

میریکیل اپنے چچا میڈر کو اور کسے، میں ابھی ابھی اُنہیں سٹنگ روم میں چھوڑ آیا ہوں، ایسے سوئے پڑے ہیں گویا قیامت کو ہی اُٹھیں گے، اور اُن کے خراٹے، توبہ ہے بھئی! میں تو اُنہیں اپنا قصہ سُنا رہا تھا اور وہ سنتے سنتے سو گئے، حد ہو گئی!!

کمفرٹ اپنا قصہ۔۔۔ اوہ تو پھر چچا جان کا یہ ردِعمل فطری ہے، میں ہوتا تو میں بھی۔۔۔۔

میریکیل ہاہاہا، بہت اچھا مذاق ہے یہ۔۔۔ یقین مانو میں اپنی زندگی کا انتہائی دلچسپ قصہ سنا رہا تھا۔ میں تو اُنہیں۔۔۔

کمفرٹ (بات کاٹتے ہوئے) معذرت خواہ ہوں جارج لیکن اس وقت میں بہت مصروف ہوں، تمھارے ان دلچسپ قصے کہانیوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں، پھر کبھی سہی۔

میریکیل میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔۔

کمفرٹ کوئی طوطا کہانی نہیں جارج (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کہانیاں گھڑنے کی اجارہ داری تو صرف میرے پاس ہے اِن دنوں!

میریکیل ٹھیک ہے یار، پھر کبھی سہی، لیکن میں تمھاری ملازمہ کے بارے میں ضرور پوچھنا چاہوں گا، تمھاری ملازمہ۔۔۔

کمفرٹ (غصے سے) گولی مارو ملازمہ کو!

میریکیل گولی ماردوں، توبہ، میں تو یہ کہنا۔۔۔

کمفرٹ تو پھر پھانسی پر چڑھا دو اُسے۔

میریکیل کیوں یار، اِتنے تپ کیوں ہو جاتے ہو تم اس کے

ڈکر پر؟

کمفرٹ کوئی بات نہیں یار (قدرے توقف سے) اگر تم اُس کے بارے میں جاننا ہی چاہ رہے ہو تو تمھیں بتانا ہی پڑے گا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لو جی ایک اور جھوٹ سننے کی تیاری پکڑ لیں! (میریکیل سے) وہ میری رشتہ دار ہے۔

میریکیل افوہ، تو یہ وجہ ہے تمھاری اُس میں دلچسپیوں کی!

کمفرٹ میری دلچسپیاں، میرے خیال میں تو مجھ سے زیادہ تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو۔

میریکیل لیکن اگر وہ تمھاری رشتہ دار ہے تو تم نے اُسے ملازمہ کیوں بنا رکھا ہے؟

کمفرٹ (ہچکچاتے ہوئے) وہ میری ملازمہ نہیں ہے وہ تو میری۔۔۔

میریکیل گھر کی نگران ہے؟ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟؟

کمفرٹ (جلدی سے) بالکل بالکل، وہ میری ہاؤس کیپر ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) مجھے پہلے کیوں نہ سوجھی یہ بات؟ (میریکیل سے) بات دراصل یہ ہے کہ وہ غریب دنیا میں یک و تنہا رہ گئی تھی بس مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نہ نظر آیا کہ اُسے سر چھپانے کے لئے اپنے گھر لے آؤں، دراصل میں تمھیں اس لئے بھی بتا رہا ہوں کہ اگر تم کو اُس کی گفتگو میں میرے حوالے سے کوئی ایسی بات دیکھو تو کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو جاؤ۔

میریکیل بالکل کیوں نہیں، میں پہلے ہی جانتا تھا کہ وہ کوئی معمولی ملازمہ نہیں ہے، اور برسبیلِ تذکرہ، تم بھی نرے چغد ہو اس معاملے میں، نہ جانے کتنے ہی عرصے سے اُس کے جذبات کو مجروح کرتے رہے ہو اُسے ملازمہ قرار دے کر، اس قسم کے رشتہ دار خاصے حساس ہوتے ہیں ان معاملات میں!

کمفرٹ تم ٹھیک کہتے ہو یار، مجھ سے واقعی غلطی ہوتی رہی ہے (داخلی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ارے باپ رے، محترمہ بھی آن ٹپکیں، اب مجھے ان دونوں کو باہمی ٹاکرے سے دور رکھنا پڑے گا (میریکیل سے) جارج، جلدی سے کہیں اوٹ میں ہو جاؤ (اُسے بازؤں سے پکڑ کر کھینچتا ہے) اِدھر آ جاؤ، اس سکرین کے پیچھے!!

میریکیل کیوں؟ کیا ہوا؟؟

کمفرٹ میری ہاؤس کیپر آ رہی ہے۔

میریکیل تو پھر کیا ہوا، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے اُس سے ملاقات پر۔۔۔

کمفرٹ وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں اُس سے اپنے رویے کی معافی مانگوں اور میں یہ کام کسی دوسرے کی موجودگی میں نہیں کرنا چاہتا، جلدی کرو۔

(میریکیل کو اسٹیج کی سکرین کے پچھلی طرف دھکیل دیتا ہے، داخلی دروازے سے مسز کمفرٹ داخل ہوتی ہے، کمفرٹ میز پر جھک سا جاتا ہے اور دوسری سمت دیکھنے لگتا ہے)

مسز کمفرٹ (کچھ توقف کے بعد آہستگی سے) ڈک!

کمفرٹ مجھے ڈک نہ کہو! تمھیں پتہ ہے کہ میں دوسروں کے سامنے ڈک کہلوائے جانا پسند نہیں کرتا۔۔۔ مم ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ جب کوئی دوسرا بھی موجود ہو۔

مسز کمفرٹ لیکن کیوں ڈک؟

کمفرٹ پھر تم نے مجھے ڈک کہا!

مسز کمفرٹ تم جانتے ہو کہ میں دوسروں کے سمنے تمھیں ہمیشہ مسٹر کمفرٹ کہتی ہوں لیکن (چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے) اس وقت تو یہاں کوئی دوسرا موجود نہیں!

کمفرٹ (تیزی سے) بالکل یہاں اور کوئی بھی نہیں (بوکھلا کر) کس نے کہا ہے کہ کوئی اور بھی یہاں موجود ہے؟

مسز کمفرٹ پلیز مجھے بتاؤ کہ کیا بات ہے؟ مجھ سے ایسی کیا خطا سرزد ہوگئی کہ کہ تم ایسا رویہ اختیار کئے ہوئے ہو، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟

کمفرٹ بالکل! میں ٹھیک ٹھاک ہوں!! کوئی شک؟

مسز کمفرٹ تو پھر تم مجھ سے ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو؟ تم نے مجھے ملازمہ کیوں کہا تھا؟

کمفرٹ افوہ، وہ؟ وہ تو میری زبان سے غلطی سے نکل گیا تھا، زبان لڑکھڑا گئی تھی! میں معافی چاہتا ہوں۔

مسز کمفرٹ کیا تم غلطی کے ازالہ کے طور پر مجھے کِس کر کے نہیں کہو گے کہ تمھیں اپنے گزشتہ رویے پر افسوس ہے اور یہ کہ تم مجھ سے از حد محبت کرتے ہو؟

کمفرٹ (بُری طرح کھانستے ہوئے) کیا؟ ارے نہیں؟؟ ہرگز نہیں، میں ایسا نہیں کر سکتا!

مسز کمفرٹ (روہانسی ہوئی آواز میں) کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ڈک؟

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) جارج کیا سوچے گا (مسز کمفرٹ سے) تمھیں اس قسم کے رویے کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے۔ ہم اس موضوع پر بارہا بات کر چکے ہیں اور تمھیں میرے احساسات کا اچھی طرح اندازہ ہے کہ میرے خیالات تمھارے بارے میں کتنے مثبت ہیں، اب اس وقت اس بات پر اصرار کرنا کہ میں تم سے از سرِ نو محبت کا اظہار کروں تو یہ نہ صرف یہ کہ بے معنی ہے بلکہ بڑی حد تک خاصا احمقانہ بھی ہے۔

مسز کمفرٹ (روتے ہوئے) مجھے نظر آرہا ہے کہ تم مجھ سے بالکل بھی محبت نہیں کرتے۔ تم نے مجھے اسی لئے گھر سے دور بھیج دیا تھا تاکہ تم کسی دوسری عورت کے ساتھ وقت گزار سکو۔ کون ہے وہ؟ (مزید پُر جوش انداز میں) تم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ مجھے بتا سکو؟

کمفرٹ تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری محبت کون ہے۔

مسز کمفرٹ تم اُس لڑکی کو بھول چکے ہو جس سے تم محبت کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔۔۔ تم اُسے فراموش کر چکے ہو جس سے تم نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔۔

کمفرٹ میں نے اور کسی سے کوئی وعدہ شاعدہ نہیں کیا ہے، تم فضول باتیں کر رہی ہو۔

مسز کمفرٹ تم نے بالکل وعدہ کیا تھا۔۔۔ تم نے کہا تھا کہ تم۔۔

کمفرٹ وہی تو میں تمھیں بتانا چاہ رہا ہوں کہ وہ کون خاتون ہیں۔

مسز کمفرٹ لیکن مجھے نہیں سننا۔

کمفرٹ لیکن میں تمھیں بتانا چاہ۔۔۔

مسز کمفرٹ میں تمھاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ (دائیں طرف کے دروازہ نمبر ایک کی جانب جاتی ہے)

کمفرٹ تمھیں سننا پڑے گا۔

مسز کمفرٹ میں نہیں سننا چاہتی۔ (اُس دروازے سے باہر نکل جاتی ہے، جہاں سے آئی تھی اور اندر سے کنڈی لگا لیتی ہے)

میریکیل (سکرین کے عقب سے نکلتے ہوئے) چلی گئی، تم نے مجھے اوٹ میں کر کے بہت اچھا کیا تھا۔۔۔

کمفرٹ (خشک لہجے میں) ٹھیک ہے۔۔۔

میریکیل خاتون کچھ غصے میں تھیں، تم نے اُنھیں ایسا کیا کہہ دیا تھا کہ وہ ناراض ہوگئیں؟

کمفرٹ کوئی خاص بات نہیں، بس وہ بھی دوسری عورتوں کی طرح اپنی آئی پر آئی ہوئی ہے۔

میریکیل ہا۔۔۔ یہی بات ہے کہ میں عورت ذات کو کبھی نہیں سمجھ سکا۔ ان کے جذبات کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا ہی نہیں، لیکن یار۔۔۔ میرا تو خیال ہے کہ تم نے

اُن خاتون سے خاصی بے اعتنائی برتی ہے، لگتا ہے کہ اُس نے تم سے خاصی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔

کمفرٹ (بے اعتنائی سے) یہ تمھارا خیال ہے۔

میریکیل بالکل، لگتا تو کچھ ایسا ہی تھا۔

کمفرٹ یہی تو مسئلہ ہے، مجھے اس بات پر قطعی کوئی اعتراض نہیں اگر اُس کے دل میں میرے بارے میں اچھے خیالات ہیں، بلکہ اُس کے یہ خیالات میرے نزدیک اُس کے اعلیٰ جمالیاتی ذوق کا مظاہرہ ہیں لیکن میں نہیں چاہتا ہوں کہ وہ اس امر کا اس قدر واشگاف انداز میں اظہار بھی کرے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کم از کم اس وقت تو بالکل نہیں۔

میریکیل لیکن تم آخر اُس محترمہ کو اتنی سپیس کیوں نہیں دیتے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کر سکے۔ ممکن ہے کہ وہ بھی دوسری خواتین کی طرح شکی مزاج کی حامل ہو جب کہ دوسری طرف تمھارے بارے میں کچھ جذبات رکھتی ہو اسی اِسی زعم میں وہ تم پر کچھ توقعات وابستہ کر بیٹھی ہو۔ ایسے میں دوسری خواتین میں تمھاری دلچسپیوں پر اُس کا شعلہ پا ہو جانا بنتا ہے۔

کمفرٹ لیکن میں کسی کا پابند نہیں اور نہ ہی دوسری عورتوں کے چکر میں لگا رہتا ہوں۔ میں اس فطرت کا انسان نہیں۔

میریکیل شائد تم سمجھتے ہو کہ تم ایسے نہیں ہو لیکن دوسرے کسی اور نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ممکن ہے کہ اُنھیں ایسا ہی نظر آتا ہو، یوں بھی تم پہلے بڑے ''وہ'' رہے ہو، مجھ سے چھپے ہوئے تو نہیں ہو تم۔

کمفرٹ (قدرے طیش میں) چھوڑو یار، میں اپنے معاملات تم سے بہتر جانتا ہوں۔

میریکیل ممکن ہے، تمھیں جاننے بھی چاہئیں، ویسے بھی۔۔۔

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کاش ایسا ہو سکتا (میریکیل سے) اور تم بے سبب میرے ابا جی بننے کی کوشش بھی مت کرو۔

میریکیل دیکھو دیکھو، یوں سیخ پا ہونے کی ضرورت نہیں، میرا کوئی غلط مطلب نہیں تھا۔

کمفرٹ بہتر یہی ہے کہ ہم اس موضوع کو فی الفور موقوف کر دیں۔

میریکیل ٹھیک ہے یار، اگر تم یہی چاہتے ہو تو یونہی ہی سہی۔

(ہیرس سامنے والے دروازے سے نمودار ہوتا ہے)

ہیرس جناب، وہ آدمی کہہ رہا ہے کہ اُسے کب تک انتظار کرنے پڑے گا، آپ اُسے کب تک ادائیگی کر کے فارغ کریں گے؟

کمفرٹ کون آدمی؟

ہیرس وہی آدمی جو کاغذوں کے رِم لے کر آیا تھا، وہ اُس وقت سے منتظر بیٹھا ہے۔

کمفرٹ میں نے تو اُسے انتظار کرنے کا نہیں کہا تھا۔

ہیرس میں نے بھی نہیں کہا تھا جناب۔

کمفرٹ پہلے کیوں نہیں بتایا مجھے، اُسے یہیں بھیج دو، لیکن نہیں، ذرا ٹھہرو، میں خود ہی جا کر اُس سے مل لیتا ہوں (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کہیں وہ نامعقول میریکیل کے سامنے میری بیوی کے بارے میں کچھ اُگل ہی نہ دے۔

(سامنے والے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے)

میریکیل ہیرس، مسز میڈر کہاں ہیں؟

ہیرس پتہ نہیں جناب، اپنے شوہر سے لڑ شڑ رہی ہوں گی کہیں۔

میریکیل کس سے لڑ رہی ہوں گی؟

ہیرس: اپنے شوہر سے جناب، شائد آپ سمجھ رہے ہیں کہ مسز میڈر صاحبہ کا کوئی خاوند نہیں ہے، نہیں جناب ایسا نہیں ہے، اُن کے بھی ایک شوہر ہیں۔

میریکیل: میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔

ہیرس: اس میں نہ سمجھنے والی کیا بات ہے جناب؟

میریکیل: کون ہیں اُن کے شوہر، ڈک تو نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ڈک کے چچا ہوں گے۔

ہیرس: ظاہر ہے جناب، وہ اُن کی چچی جان ہیں۔

میریکیل: تو پھر اُنہوں نے اپنا نام کیوں تبدیل کرلیا ہے؟

ہیرس: (کھلکھلاہٹ کے ساتھ) جی جناب، اس بات پر تو بسا اوقات خود اُن کو بھی حیرت ہوتی ہے۔

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ہوں تو یہ بات ہے، اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ انہوں نے کمفرٹ کے بجائے منڈر کا نام اپنے نام کے ساتھ کیوں لگا رکھا ہے، اب تو اُس خوبرو خادمہ سے ملنا اور بھی ضروری ہوگیا ہے، وہی اس پر روشنی ڈالنے کی پوزیشن میں ہے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے (ہیرس سے) میں اس گھر کی ہاؤس کیپر سے ملنا چاہتا ہوں۔

ہیرس: ہاؤس کیپر؟ یہاں کوئی ہاؤس کیپر نہیں ہے جناب۔ گھر کی نگرانی کا کام صرف اور صرف مسز کمفرٹ کا استحقاق ہے اور وہی یہ کام کرتی ہیں۔

میریکیل: مسز کمفرٹ؟ تمھارا مطلب اُن بوڑھی خاتون سے ہے؟

ہیرس: اب میں تو ایسا نہیں کہہ سکتا جناب، ہاں البتہ مسٹر کمفرٹ اُنہیں ازراہِ مذاق بوڑھی خاتون کہہ لیا کرتے ہیں (ہنستا ہے)

میریکیل: لیکن وہ تو مستقل یہاں نہیں رہتی ہوں گی۔

ہیرس: مستقل کی بھی آپ نے خوب کہی جناب، اُن کا تو زیادہ تر وقت یہیں گزرتا ہے، ہاں البتہ کبھی کبھار اُنہیں کہیں جانا پڑ جاتا ہے، قصبے میں بھی جا کر رہتی ہیں۔

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) اب معاملہ کچھ سمجھ میں آتا جا رہا ہے، دو چکیوں کا پیا ہمیشہ مصیبت میں رہتا ہے، اب کمفرٹ کا میٹر گھوما گھوما نہ رہے تو اور کیا ہو۔ دونوں خواتین میں گھمسان کا رن پڑتا ہوگا اور دونوں کا غصہ کمفرٹ پر اُترتا ہوگا (ہیرس سے) وہ ملازمہ کہاں ہیں؟ میں اُن سے ملنا چاہتا ہوں۔

ہیرس: جی کیا کہا؟ ملازمہ جناب؟؟

میریکیل: (غصے سے) ہاں، ملازمہ، اور یہ تم میری ہر بات پر منہ کیوں کھول لیتے ہو؟ میں سیلی کا تذکرہ کر رہا ہوں، یہی نام ہے غالباً اُس کا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) عجیب ہے یہ ملازم طبقہ بھی، ہر وقت ایک دوسرے سے جلتے رہتے ہیں۔

ہیرس: جب سے میں یہاں ہوں، سیلی یہاں پر ملازمہ نہیں ہے جناب۔

میریکیل: وہ ملازمہ ہے یا نہیں ہے، میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں، اس سے کہو کہ میں اُسے یاد کر رہا ہوں۔

ہیرس: جی جناب (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) حیرت ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ صاحب سیلی سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔

(ہیرس دروازہ نمبر ایک سے باہر نکل جاتا ہے)

میریکیل: بہت پُراسرار، بہت ہی۔۔۔

(میڈر چچا داہنی طرف والے دروازے سے داخل ہوتے ہیں)

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لو جی ڈھلو شاہ چلے آرہے ہیں منہ اُٹھائے ہوئے، لگتا تو یہ ہے کہ ابھی ابھی جاگے ہیں خوابِ غفلت سے (چچا میڈر سے) تو جناب، آخر آپ کامیاب ہو ہی

گئے۔

میڈرچچا (تیزی سے) کامیاب ہو گیا؟ کس کام میں کامیاب ہوگیا؟؟

میریکیل چھت پھاڑنے کے کام میں، میں آپ کو اِسی مشقت پر لگا کر آیا تھا، آپ یقیناً کامیاب لوٹے ہوں گے۔

میڈرچچا پتہ نہیں تم کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔تم تو مجھے کمرے میں برانگیختہ چھوڑ آئے تھے، میری بات کو انتہائی بیہودہ انداز میں کاٹ کر۔

میریکیل (ہنستا ہے) ہاہاہاہا، آپ نے بھی کیا خوب بات کہی ہے، میں آپ کی بات کاٹنے کا مرتکب ہوا تھا یا آپ نے میری گفتگو میں مداخلت کی تھی۔آپ نے اِتنی زورزور سے خراٹے لینے شروع کر دیئے تھے کہ مجھے اپنا قصہ روک دینا پڑا، اِتنا دلچسپ قصہ سُنا رہا تھا میں آپ کو۔

میڈرچچا کیا کہا؟ خراٹے لے رہا تھا؟؟ میں خراٹے نہیں لیتا ہوں، اس سے غلط بات تو کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

میریکیل (طنزیہ انداز میں) بجا کہا آپ نے جناب، آپ تو شائد سوئے بھی نہیں ہیں، اور آپ اس وقت سٹنگ روم سے بھی نہیں آ رہے ہیں، کیوں جناب، میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں؟

میڈرچچا نہیں، بالکل نہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ تم خود ہی پڑ کر سو رہے تھے۔

میریکیل جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔۔۔چہ خوب، گویا وہ جو خراٹے لے رہا تھا وہ ذات شریف میں بقلم خود تھا، یہ بھی لطیفہ ہو گیا، اگر وہ واقعی میں تھا تو میں تو اپنی شکل بھی دیکھنا پسند نہ کروں گا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کیونکہ ایسی بھیانک آواز سے تو ہر کوئی دہل کر رہ جائے (چچا میڈر سے) اب مجھے پتہ چلا کہ آپ کی بیوی آپ سے کیوں لڑتی رہتی ہیں۔

میڈرچچا (غصے سے) تمھیں میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کی جرأت کیسے ہوئی؟ مجھے تو لگتا ہے کہ تمھیں ان باتوں کا رتی بھی تجربہ نہیں۔

میریکیل آپ نے درست کہا، میں ابھی کنوارہ ہوں۔

میڈرچچا اوہ، تو یہ بات ہے تمھاری کج فہمی کی، کیا خوب کہا ہے کسی نے ’’ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا‘‘ (دانت نکالتے ہوئے) تو تم کنوارے ہو، کتنا بھلا لگتا ہے یہ لفظ، لیکن میاں، شادی شدہ لوگوں کی زندگی کے بارے میں رائے زنی نہیں کرنی چاہیے، اس سلسلے میں میں تمھیں ایک کہانی سُناتا ہوں۔ (بیٹھ جاتا ہے)

میریکیل آپ نے تو میری کہانی نہیں سُنی تھی۔

میڈرچچا تمھاری کہانی میں بے معنی مذاق اور ہنسی کے علاوہ کچھ نہ تھا جبکہ میں تمھیں گُر کی باتیں بتانے والا ہوں۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یقیناً اب سنجیدہ خان کے پوتے بھی شرما جائیں گے۔ (بیٹھ جاتا ہے)

میڈرچچا یہ کہانی ایک نہایت رنجیدہ اور سنجیدہ شخص کی ہے جس کی زندگی دکھوں سے عبارت تھی۔

میریکیل (منہ پر رکھے ہوئے رومال پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کسی دردوں کی ماری ذی روح کی کہانی سنانے چلے ہیں بزرگوار۔

میڈرچچا عرصہ گزرا (سوچتے ہوئے) بھلا کتنا عرصہ گزرا ہوگا۔

میریکیل فرمایا ہے آپ نے کتنا عرصہ گزرا؟

میڈرچچا عرصے ورصے کو دفع کرو، بس یوں سمجھ لو کہ بہت عرصہ گزرا کہیں کوئی نوجوان ہوا کرتا تھا، یہی کوئی پینتیس چھتیس برس کا۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے، طنزاً) گویا کل کا بچہ ہوا۔

میڈرچا اُس کی ملاقات ایک نوجوان اور خوبصورت بیوہ سے ہوئی۔۔۔

میریکیل (بات کاٹتے ہوئے) دونوں میں محبت ہوگئی ہوگی جس کا انجام شادی خانہ آبادی پر ہوا ہوگا اور اس کے بعد اُن دونوں نے اپنی بقیہ زندگی ہنسی خوشی گزاردی ہوگی اور ہمارے لئے سبق یہ ہوا کہ ہمیشہ بیواؤں کو خوش رکھو، تم خود بھی خوش رہو گے اور اللہ بھی تم سے خوش ہوگا، سب کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

میڈرچا (پُروقارانداز میں) براہِ مہربانی کہانی کے بیچ میں مداخلت مت کرو۔ ویسے تمھارا یہ اندازہ دُرست ہے کہ وہ نوجوان اُس بیوہ خاتون کے عشق میں بُری طرح مبتلا ہوگیا تھا۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) وہ رہ بھی کیسے سکتا تھا محبت میں مبتلا ہوئے بغیر۔

میڈرچا اُس نوجوان بیوہ نے بھی اُس کی محبت کا جواب محبت سے دیا۔

میریکیل کہانی کے پلاٹ کی وجہ سے مجبور ہوگی بیچاری۔

میڈرچا (غصے سے) تمھاری بے وقت مذاق کرنے کی بیہودہ عادت میرے صبر کا امتحان لے رہی ہے، پلیز مجھے کہانی کو اپنے انداز میں بیان کرنے کی اجازت دو گے تم؟

میریکیل کیوں نہیں جناب، بے شک یہ آپ کی کہانی ہے، آپ ہی سنائیں۔

میڈرچا تو میں کیا کہہ رہا تھا، ہاں یاد آیا، نوجوان کو اُس کی محبت کا جواب محبت سے ملا۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) بڑی جمہوریت پسند تھی، بیوہ یقیناً ریپبلک پارٹی کی رُکن ہوگی۔

میڈرچا اُن دونوں کی شادی ہوگئی لیکن توقعات کے بالکل برعکس، اُن کی ازدواجی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔

میریکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ غیر معمولی بات ہے اس قصے میں۔

میڈرچا اُس کی بیوی ہر وقت اپنے خاوند کو غصہ دلانے میں مشغول رہتی تھی۔

میریکیل ایسا تو ہونا ہی تھا، ہمیشہ خاتونِ خانہ کو ہی فساد کی جڑ ٹھہرایا جاتا ہے اس قسم کے معاملات میں۔

میڈرچا جی جناب اور یہ محض الزام تراشی نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی۔

میریکیل (طنزیہ انداز میں) ایسا تو ہونا ہی تھا۔

میڈرچا دراصل اُس بیوہ کو جیسی توقعات اپنے مرحوم شوہر سے تھی وہی توقعات وہ اپنے شوہر نمبر دو سے بھی وابستہ کر بیٹھی تھی۔

میریکیل جبکہ اُس کا شوہر نمبر دو کے خیالات اس کے برعکس ہوں گے۔

میڈرچا بالکل ٹھیک کہا تم نے، وہ ایک مختلف مزاج کا شخص تھا، وہ اُس خاتون کی ہر جائز و ناجائز بات پر آنکھ بند کر کے صاد کہنے کا عادی نہیں ہوسکا تھا۔

میریکیل واقعی بہت دردیلی کہانی ہے۔

میڈرچا (پُرجوش انداز میں) برخوردار، یہ محض ایک کہانی نہیں ہے، اس ناکام زندگی کی کہانی کا جیتا جاگتا کردار میری صورت تمھارے سامنے موجود ہے (آہستگی اور متانت سے) میں ہی تھا جس نے اُس بیوہ سے شادی کی تھی۔

میریکیل آپ کی ظاہری وضع قطع کو دیکھتے ہوئے بآسانی کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کوئی اِتنی خوشگوار نہیں ہے۔

میڈرچا بدترین کہو برخوردار لیکن اس کے باوجود میری

زندگی کی زنبیل میں کچھ نہ کچھ خوشگوار لمحے موجود ہیں۔

میریکیل: ناممکن!

میڈر چچا: ہماری ازدواجی معرکے عارضی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ پھر جب جنگ کا خوفناک عقاب اپنے پر سمیٹ لیتا ہے اور امن کی سفید فاختہ ہماری زندگیوں پر پرافشاں ہو جاتی ہے تو ہماری زندگی کے خوشگوار لمحے لوٹ آتے ہیں اور میں بھی اِتنا ہی خوش ہو جاتا ہوں جتنے تم یا کوئی اور شخص ہو سکتا ہے۔

میریکیل: جناب، اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو میں اُس جنگ کے عقاب کا ٹینٹوا دبا دیتا اور امن کی فاختہ کو پنجرے میں ڈال دیتا، یوں وہ میری زندگی سے کبھی دور نہ ہو پاتی، عارضی طور پر بھی نہیں۔

میڈر چچا: امن کی فاختہ کو پنجرے میں ڈال دیتے، یہ تو کچھ اچھی بات نہ ہوتی۔

میریکیل: ہوسکتا ہے کہ میں نے مثال غلط دے دی ہو، میں ان مثالوں وثالوں کے معاملے میں اِتنا اچھا نہیں۔

(داہنی طرف کے دروازہ نمبر ۲ سے مسز میڈر اندر داخل ہوتی ہے)

میڈر چچا: یہ پچھتاوا ساری زندگی میرا تعاقب کرتا رہا کہ میں نے وہ شادی کی ہی کیوں تھی، شائد اُس وقت میں نہایت احمق تھا۔

مسز میڈر: اب بھی کچھ کم نہیں ہو۔

(میڈر چچا اور میریکیل چونک جاتے ہیں)

میریکیل: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لو جی پھر کسی عالمی جنگ کا احتمال ہونے چلا ہے، میں کوشش کرتا ہوں ٹالنے کی (مسز میڈر سے) مادام، ابھی آپ کے شوہر آپ ہی کا تذکرہ کر رہے تھے۔

مسز میڈر: (خشک لہجے میں) جی ہاں، میں سُن چکی ہوں۔

میریکیل: لیکن آپ کے انداز سے لگتا ہے کہ آپ کو کوئی غلط فہمی سی ہوگئی ہے، وہ آپ کا تذکرہ نہایت مثبت انداز میں کر رہے تھے۔

مسز میڈر: مجھے اس کا اثبات ابھی تک ڈنگ مار رہا ہے۔

میریکیل: یہ کہہ رہے تھے کہ اُسے اُس وقت کتنا افسوس ہوتا ہے جب میاں بیوی میں مسلسل لڑائی ہو رہی ہو۔

میڈر چچا: میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔

میریکیل: جج جی آ۔۔۔آپ نے اِن الفاظ میں تو نہیں کہا تھا لیکن آپ کا مطلب کچھ ایسا ہی تھا۔

مسز میڈر: نوجوان، تم بلاوجہ ان صاحب کی ترجمانی کرنے کی کوشش مت کرو، یہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ میں سُن چکی ہوں، میری سماعت ابھی اِتنی بھی کمزور نہیں ہوئی ہے اور مجھے کہہ لینے دو کہ حماقت کا اگر کوئی پیکر ہوتا تو وہ اِنہیں ذات شریف کی شکل میں ہوتا، اور یہ کہ اگر یہ اپنے آپ کو احمق کہہ رہے ہیں تو بالکل درست کہہ رہے ہیں، کم از کم اس حد تک اِن کا تجزیہ بالکل صحیح ہے۔

میڈر چچا: بات یہ ہے برخوردار کہ یہ جو خاتون ہیں یہ احمق شناسی میں ایکسپرٹ ہیں۔

مسز میڈر: جی بالکل، لیکن مجھے ایسا ہونا پڑا ہے، میرا پالا ہی جب آپ جیسوں سے پڑتا ہو تو کیا کیا جا سکتا ہے۔

میڈر چچا: بالکل، ان کا کام ہی اسی سے چلتا ہے۔

میریکیل: بزرگوار، میں استدعا کروں گا کہ اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کریں۔

میڈر چچا: میں ایک بار پھر یہ بات اعلانیہ کہہ رہا ہوں کہ میں اُس وقت دنیا کا احمق ترین شخص تھا جب میں نے شادی کا ارتکاب کیا تھا۔

مسز میڈر: اور تا ہنوز افاقہ نہیں ہوا ہے۔

میڈر چچا: ہاہاہا، گویا آپ ابھی تک۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ یہ خاتون ابھی تک اس کا حظ لے رہی ہیں۔

مسز میڈر: میرا تو خیال ہے کہ یہ صاحب بھی اس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، ظاہر ہے کہ جب ایک تماشہ ہو رہا ہو تو تماشائی تو آئیں گے چاہے وہ خود اپنا ہی تماشہ کیوں نہ ہو، دلچسپ ہونا شرط ہے۔ ایسا تو کوئی نہیں ہے جو کسی ایسی بات پر ہنسے جو ہو ہی نہیں۔

میڈر چچا: اب یہ خاتون خود کو "کوئی نہیں" کہہ رہی ہیں، مجھے تو اس بات پر بھی ہنسی آ رہی ہے۔

مسز میڈر: ان صاحب کو کوئی اور نقطہ بھائی نہیں دے رہا، یونہی ہواؤں میں تکے لہرا رہے ہیں۔

میڈر چچا: ہنسی والا تو یہی موضوع ہے فی الحال۔

(داخلی دروازے سے کمفرٹ داخل ہوتا ہے)

میریکیل: محترم، محترم، شانت ہو جایئے، عمل اور ردِعمل کے اس معرکے میں خرابیاں ہی پیدا ہوں گی۔ (کمفرٹ کو دیکھ کر) یار ڈک، تمھیں کوشش کر کے اپنے چچا، چچی کو شانت کرو، اِن دونوں میں اس وقت خاصی ۔۔۔ خاصی غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ہیں۔

مسز میڈر: تمھیں کس نے کہا تھا کہ ہمارے معاملات میں مداخلت کرو؟

میڈر چچا: اور تمھارا ہمارے معاملات سے کیا لینا دینا ہے؟

میریکیل: اکالاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ دونوں کسی ایک بات پر تو متفق ہوئے ہیں (کمفرٹ سے سرگوشی کرتے ہوئے) یار ڈک، کسی طرح یہاں امن و امان قائم کرو۔

کمفرٹ: (میریکیل سے سرگوشی کرتے ہوئے) ٹھیک ہے، تم اب کھسکو، میں یہاں امن کا پیغامبر بننے کی کوشش کرتا ہوں۔

میریکیل: (کمفرٹ سے سرگوشی کرتے ہوئے) ٹھیک ہے ڈک، گڈ لک، میں اس دوران اپنے کپڑے تبدیل کئے لیتا ہوں، میرے اپنے کپڑے اب تک دُھل کر آ گئے ہوں گے، اس لباس نے تو مجھے جکو بنا کر رکھ دیا ہے۔

(میریکیل داہنی طرف کے دروازہ نمبر ۲ سے نکل جاتا ہے)

کمفرٹ: چچا جان، کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ سٹنگ روم چلے جائیں اور سگار سے لطف اندوز۔۔۔

میڈر چچا: نہیں، میں نے وہاں نہیں جانا، میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مجھے تمبا کو نوشی کا کوئی شوق نہیں، اور ویسے بھی میں اپنا بہت سا قیمتی وقت پہلے ہی اس کمرے میں برباد کر چکا ہوں۔

کمفرٹ: تو پھر کسی دوسری جگہ تشریف لے چلئے، کسی بھی کمرے میں (پشت پر موجود دروازوں کی طرف اشارہ کرتا ہے)

میڈر چچا: نہیں، میں نے کہیں نہیں جانا، اور یہ تو سراسر علاقۂ غیر ہے۔

مسز میڈر: رچرڈ، انہیں کہیں بھی بھیجنے کی ضرورت نہیں، میں خود اپنا قیمتی وقت یہاں ضائع کرنے کی قائل نہیں۔

کمفرٹ: اوہ چچی جان، میں آپ کو تکلیف دینا نہیں چاہتا تھا، مم۔۔۔ میں۔۔۔

مسز میڈر: میں بخوشی جانے کو تیار ہوں رچرڈ، جہاں کی سکونت ناخوشگوار یادوں کا باعث بن جائے، وہاں سے کوچ ہی بہتر۔

(مسز میڈر تن فن کر داہنی دروازہ نمبر ۲ سے باہر نکل جاتی ہے)

میڈر چچا: یہ ڈائیلاگ میرے لئے بولا گیا تھا (پھیکے سے انداز میں ہنستا ہے)

کمفرٹ: (کچھ توقف کے بعد) چچا جان، کیا آپ کو خیال نہیں آتا کہ آپ دونوں میں یہ بے وجہ کی مسلسل لڑائیاں ضرورت سے زیادہ طوالت پکڑ جاتی ہیں۔

میڈر چچا: میں بھلا ایسا کیوں نہیں سوچ رہا ہوں بھتیجے، یہ بات واقعی قابلِ افسوس ہے لیکن کیا کیا جائے، ہاں تمھارا یہ خیال کہ ہم میں تسلسل سے جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، درست نہیں ہے۔ ہم میں جھڑپیں ہوتی ضرور ہیں لیکن کبھی کبھار، ہاں البتہ اس بار کی لڑائی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی طویل ہوگئی ہے، پھر بھی، مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہورہا ہے، لیکن کیا کیا جاسکتا ہے؟

کمفرٹ: اگر آپ کو بعد میں افسوس ہوتا ہے تو پھر آپ لڑتے ہی کیوں ہیں؟

میڈر چچا: مجھے لڑنے وڑنے کا شوق نہیں، میرا قطعاً کوئی قصور نہیں ہوتا۔

کمفرٹ: اوہ، تو ایسا ہمیشہ ہی ہوتا ہے؟

میڈر چچا: ہاں، ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

کمفرٹ: دراصل ہمارے اور آپ کے باوا آدم نے اماں حوا کا کوسنے کا فیشن نکالا تھا، بس تبھی سے عورتوں کو الزام دینے کا سلسلہ جاری ہے، مرد حضرات یہ سوچنا ہی گناہ سمجھتے ہیں کہ وہ غلطی پر ہوسکتے ہیں۔

میڈر چچا: تب پھر یہ باوا آدم کی غلطی ہے، میرا کیا قصور؟

کمفرٹ: آپ دونوں میاں بیوی یوں ایک دوسرے کو ملزم قرار دیتے ہیں جیسے یہ بھی کوئی کھیل ہو۔

میڈر چچا: کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن مجھے بھی اپنی ہی بیوی کا دشمن بننے کا کوئی خاص شوق نہیں مگر۔۔۔

کمفرٹ: مگر یہ کہ آپ کو سمجھ میں نہیں آتا کہ معاملات کو درست کیسے کیا جائے؟ یہی ناں۔۔۔ میں آپ کو بتاتا ہوں، نہایت آسان نسخہ ہے، سیدھے چچی جان کے پاس جایئے اور اُن سے کہیئے کہ جو کچھ ہوا اس پر آپکو افسوس ہے، اب آپ۔۔۔

میڈر چچا: ارے! بھلا میں یہ کیسے کرسکتا ہوں۔

کمفرٹ: لیکن یہ بھی سچ ہے کہ یہی وہ واحد رستہ ہے جس سے آپ کا یہ بلاوجہ کا بنایا ہوا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔

میڈر چچا: تم تو اپنی چچی کے دشمن بن گئے ہو۔۔۔ ذرا تصور تو کرو کہ اگر میں نے اُس سے افسوس کا اظہار کردیا تو وہ تحیر کے اس جھٹکے کو برداشت ہی نہ کرسکے گی اور لڑھک جائے گی۔

کمفرٹ: ارے نہیں چچا جان، اب ایسا بھی نہیں ہے، ہاں یہ کہا جس سکتا ہے کہ اُنھیں حیرانی ضرور ہوگی۔

میڈر چچا: لیکن مجھے تو کچھ ایسا ہی خدشہ ہے۔

کمفرٹ: اُنھیں حیرت ضرور ہوگی لیکن یہ خوشگوار حیرت ہو گی۔۔۔ اب چھوڑیں بھی چچا جان، اُنھیں اس انبساط سے محروم نہ کریں، اُنھیں بتادیں کہ اس جلتے ہوئے سورج کے نیچے کچھ بھی ہوسکتا ہے، کچھ بھی۔

میڈر چچا: رچرڈ، میرے عزیز ترین بھتیجے، تم صحیح کہہ رہے ہو۔ واقعی ''سوری'' ایک ایسا لفظ ہے جس میں پہاڑوں کا مردہ بھی دفن کیا جاسکتا ہے (اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے) ٹھیک ہے بھتیجے، میں یہ بھی کر گزروں گا۔ اِن معاملات میں تمھاری معاملہ فہمی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب تمھیں بھی شادی کرلینی چاہیئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک کامیاب ازدواجی زندگی گزارنے کی جملہ صلاحیت رکھتے ہو۔

کمفرٹ: (کچھ خوشی سے) اچھا، آپ ایسا سوچتے ہیں۔

میڈر چچا: لیکن تم ابھی شادی شدہ نہیں ہو۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ تم اِن معاملات میں دوسرے رخ سے بھی سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔ ہماری تو مت ہی ماری گئی ہے۔

(صدر دروازے سے سیلی داخل ہوتی ہے)

سیلی: جونہی میرا کام ختم ہوا، میں یہاں چلی آئی ہوں جناب۔

میڈر چچا: (غصیلے انداز میں) آپ کو کہا کس نے ہے کہ یہاں تشریف لانے کی زحمت بھی گوارا کیجئے۔ بہتر ہے کہ آپ جلد از جلد اپنا کام ختم کریں اور تشریف لے جائیں۔

سیلی: مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے، آپ کے مشورے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں (کمفرٹ سے) مجھ سے کہا گیا تھا کہ وہ جو سرکس کے جوکر صاحب ہیں، اُنہوں نے مجھے بلایا ہے اور میرے منتظر ہیں۔

کمفرٹ: جی اُنہوں نے بلایا ہوگا اور یہ ماضی بعید کا کلمہ ہے، فی الحال وہ یہاں تشریف نہیں رکھتے اس لئے آنسہ سیلی صاحبہ، آپ بھی تشریف لے جائیں۔

سیلی: میرا نام سیلی نہیں ہے جناب، فرانسیسی میں یہ لفظ ''ساریئ'' ہے، یہی میرا نام بھی ہے۔

کمفرٹ: مجھے مطلق جاننے کا شوق نہیں ہے کہ آپ کا نام فرانسیسی میں کیا ہے یا اسے چینی، جاپانی یا کسی اور زبان میں کیا کہتے ہیں۔ مجھے بس یہ پتہ ہے کہ میری اپنی زبان میں یہ ''سیلی'' ہے۔

(مسز میڈر داہنی طرف والے دروازہ نمبر۲ سے داخل ہوتی ہیں)

مسز میڈر: سارہ، فٹافٹ جاؤ اور میرا بیگ پیک کرنا شروع کر دو!

سیلی: کیوں مادام، میرا تو خیال تھا کہ۔۔۔

مسز میڈر: اپنے خیالات کو اپنے پاس رہنے دو، اور جو میں نے کہا ہے وہ کرو، فٹافٹ، سُن رہی ہوناں۔

سیلی: جی مادام! (داہنی طرف والے دروازہ نمبر۲ سے چلی جاتی ہے)

میڈر چچا: ارے بھئی کلیمنٹینا، کدھر کا ارادہ ہے، میرا تو خیال ---

مسز میڈر: (کاٹ کھانے والے انداز میں) آپ ذرا زبان سنبھال کر بات کریں محترم، آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اس قدر بے تکلفی کے ساتھ، مجھے میرے نام سے مخاطب کریں۔

میڈر چچا: (منہ پر ہاتھ رکھ کر کمفرٹ سے) اب کہو برخوردار، کون قصوروار ہے؟

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر چچا میڈر سے) کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا کہ اس وقت چچی جان کا پارہ چڑھا ہوا ہے۔

میڈر چچا: (منہ پر ہاتھ رکھ کر کمفرٹ سے) یہ کوئی خلافِ معمول وقوعہ نہیں ہے۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر چچا میڈر سے) آپ چچی جان سے اُس وقت بات کیجئے گا جب وہ غصے میں نہ ہوں اور اطمینان سے آپ کی بات سُن سکیں۔

میڈر چچا: (منہ پر ہاتھ رکھ کر کمفرٹ سے) ایسا منظر تو چشمِ فلک نے شائد ہی کبھی دیکھا ہو۔

کمفرٹ: لیکن ابھی آپ اُن سے کچھ نہ فرمایئے ابھی وہ غصے میں ہیں (مسز میڈر سے) کیوں چچی جان، آپ اپنا سامان پیک کیوں کروانا چاہ رہی ہیں؟ کہیں آپ کا جانے کا ارادہ تو نہیں بن رہا؟

مسز میڈر: (طنزیہ انداز میں) ارے نہیں میاں، میں تو یہاں ساری زندگی گزارنے آئی ہوں۔

کمفرٹ: (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) خدا نہ کرے (منہ پر ہاتھ رکھ کر چچا میڈر سے) چچا جان، میرا خیال ہے کہ آپ کو فی الحال یہاں سے ٹل ہی جانا چاہیئے تا آنکہ طوفان کی شدت میں کمی آ جائے۔ چلیں میرے ساتھ، ہم پائیں باغ کو چلتے ہیں (مسز میڈر سے) چچی جان، میں ابھی چچا جان

کو پائیں باغ دکھا کر لاتا ہوں۔

میڈر چچا جیسا تم کہو بھتیجے، لیکن ذرا ٹھہرو، میں اپنا ہیٹ لے کر ابھی آیا۔ (داہنی طرف والے دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

مسز میڈر میرا خیال ہے کہ تمھارے چچا کے دماغ کو تھوڑی سی ٹھنڈی ہوا لگے گی تو اسے سکون ملے گا۔

کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) راستے کا سائن بورڈ بننا اور ناراض جوڑوں کو امن کی راہ دکھانا آسان ہے لیکن یہ الگ بات ہے کہ اس معاملے میں سائن پوسٹ اپنی جگہ پر دھرے کے دھرے رہ گئے ہیں۔ امن کا راستہ سجھائی ہی نہیں دے رہا ہے۔ کاش کوئی خضرِ راہ مجھے بھی امن کا راستہ دکھا پائے تاکہ میری اپنی ازدواجی زندگی کو بھی امن کی منزل حاصل ہو سکے (چچا میڈر داخل ہوتے ہیں) (چچا میڈر سے) تو پھر چلیں چچا جان؟

(چچا میڈر اور کمفرٹ داخلی دروازے سے باہر نکل جاتے ہیں)

مسز میڈر نہیں، اب مجھ سے مزید برداشت نہیں ہوتا، اور ہونا بھی نہیں چاہیے، میں کب تک یہاں ٹھہر کر اپنی بے عزتی کرواتی رہوں۔ ان کا سلوک تو اب مجھ سے شرمناک حد تک بدترین ہو چکا ہے۔ ہائے۔۔۔ اب مجھے بارن مرحوم کی قدر ہو رہی ہے، اُنہوں نے تو شائد زندگی میں مجھ سے اس قسم کا سلوک کرنے کا سوچا بھی نہ ہوگا۔۔۔ اِنہیں دیکھو، ہر بات کا الزام مجھ ہی پر دھرے جاتے ہیں اور خود تو جیسے دودھ کے دُھلے ہوئے ہیں۔ اپنی غلطی ہو بھی تو تسلیم کرنے کی اخلاقی جرأت نہیں رکھتے۔۔۔ ایک بار، صرف ایک بار مان جائیں کہ وہ غلطی پر ہیں تو میں اگلی پچھلی تمام باتیں بھول کر اُنہیں معاف کر دوں۔۔۔ اور اگر اُنہوں نے ایسا نہیں کیا تو میں تو زندگی بھر اُنہیں معاف نہیں کروں گی۔

(مسز کمفرٹ بائیں طرف والے دروازے نمبر ۲ سے نمودار ہوتی ہیں)

مسز کمفرٹ (مسز میڈر کی موجودگی کے احساس سے لاعلم ہیں) مجھے اس سے بات کرنی ہی پڑے گی۔

مسز میڈر (تیز لہجے میں) کس سے بات کرنا پڑے گی تمھیں؟

مسز کمفرٹ (چونک کر رہ جاتی ہے، منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) تو وہ والی عورت یہاں پر ہے۔

مسز میڈر (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) سارہ اب تک میرا سامان پیک کر چکی ہو گی۔ (مسز کمفرٹ سے) بھاگ کر اوپر جاؤ اور میری ملازمہ سے کہو کہ میں اُس سے ملنا چاہتی ہوں، جلدی سے!

مسز کمفرٹ (پُر وقار انداز میں) میں ہر ایرے غیرے کی اس قسم کی تحکمانہ باتوں کی عادی نہیں۔

مسز میڈر (طنزیہ انداز میں) اچھا؟ ماشااللہ!! (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ٹھہرو! ذرا اسے مزا چکھاتی ہوں (مسز کمفرٹ سے) اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تم مجھے جانتی ہو یا نہیں جانتی، جب تک میں یہاں کمفرٹ کے گھر میں ہوں تو۔۔۔

مسز کمفرٹ اور آپ بتا سکتی ہیں کہ آپ یہاں اس گھر میں کس استحقاق کے تحت ہیں؟

مسز میڈر استحقاق۔۔۔ خوب گویا اب تم میری انکوائری بھی کرو گی؟ میں ہر قسم کا استحقاق رکھتی ہوں، تم کون ہوتی ہو جواب طلبی کرنے والی؟

مسز کمفرٹ (آہستگی سے) میرا خیال ہے کہ مسٹر کمفرٹ نے مجھے یہ فریضہ سونپا ہے۔

مسز میڈر کیا کہا، کمفرٹ نے تمھیں یہ فریضہ سونپا ہے، غلط،

بالکل غلط۔۔۔فٹافٹ نیچے جاؤ اور تم سے جو کہا گیا ہے فوراً کرو، سُنتی ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں؟

مسز کمفرٹ اور یہ آپ کس خوشی میں مجھ پر حُکم چلا رہی ہیں؟

مسز میڈر ظاہر ہے کمفرٹ نے مجھے اس کا کلی حق دیا ہے، میرا اُن سے قریبی تعلق ہے (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) انتہائی قریبی بھی کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔

مسز کمفرٹ یہ آپ کا محض خیال ہے، آپ یہاں صرف اور صرف مسائل پیدا کرنے کے لئے آئی ہیں۔۔۔ اور یہ بات آپ خود بھی جانتی ہیں۔آپ کمفرٹ کو مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔وہ صرف اور صرف مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

مسز میڈر کیا کہا؟ محبت؟؟ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ لڑکی تو بالکل ہی کھسکی ہوئی ہے (مسز کمفرٹ سے) بس! بہت ہو چکا!! میں کمفرٹ سے تمھاری شکایت کروں گی اور اُسے بتاؤں گی کہ تم اُس کے بارے میں کیا کہہ رہی تھی۔۔۔غضب خدا کا،تم تو ساری حدیں پھلانگنے پر تلی ہوئی ہو۔

مسز کمفرٹ (پُر جوش انداز میں) تم اب اس گھر میں ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہر سکتی، نکل جاؤ یہاں سے،فوراً۔۔۔(پکارتی ہے) ہیرس!

مسز میڈر مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔۔۔ تمھاری ہمت کہ تم مجھ سے اس لہجے میں بات کرو۔۔۔تم،ایک معمولی ملازمہ،ایک انتہائی کم حیثیت عورت،۔۔۔میں ابھی تمھاری شکایت کرتی ہوں۔۔۔میں دیکھتی ہوں کہ اس گھر سے کون جاتا ہے،تم یا میں۔۔۔ابھی پتہ چل جائے گا۔(داہنی طرف والے دروازہ نمبر۲ سے نکل جاتی ہے)

مسز کمفرٹ اس عورت کو فوری طور پر یہاں سے چلے جانا چاہئے (پکارتی ہے) ہیرس!

(ہیرس صدر دروازے سے اندر داخل ہوتا ہے)

ہیرس جی جناب۔۔۔میرا مطلب ہے مادام!!

مسز کمفرٹ مسٹر کمفرٹ کہاں ہیں؟

ہیرس پائیں باغ میں ہیں وہ۔۔۔گلاب کے تختے کے پاس،جی مادام،آخری وقت وہیں تھے وہ۔

مسز کمفرٹ اُن سے جا کر کہو کہ میں اُن سے ابھی ملنا چاہتی ہوں۔

ہیرس مالک بزرگوار کو پائیں باغ کی سیر کروا رہے ہیں اور ہر خوبصورت جگہ کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ وہ بلاتفریق ہر جگہ کو خوبصورت قرار دے رہے ہیں، میں نے تو کچھ ایسا ہی سُنا تھا۔

مسز کمفرٹ تم سُن رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں، میں اُن سے فوری طور پر ملنا چاہتی ہوں۔

ہیرس جی جناب۔۔۔میرا مطلب ہے مادام!!(منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) لگتا ہے کہ آج پھر میاں بیوی میں کوئی جھڑپ ہونے والی ہے ،اللہ خیر کرے۔(صدر دروازے سے نکل جاتا ہے)

مسز کمفرٹ ڈِک کو اُس عورت کو نکال باہر کرنا پڑے گا ورنہ میں خود چلی جاؤں گی۔۔۔تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اب اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی؟ اُسے میرے بجائے اُس دوسری عورت کی پرواہ ہے۔مجھ وہ عورت زہر لگتی ہے۔میں اپنی ساری زندگی میں کبھی اِتنی آزردہ خاطر نہیں ہوئی ہوں اور اگر واقعی واقعی وہ اُس چھنال میں دلچسپی رکھتا ہے تو میں اُس سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو جاؤں گی۔۔۔چاہے کچھ بھی ہو جائے۔(بے دم سی ہو کر صوفے پر گر جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

(سیلی داہنی طرف والے دروازہ نمبر۲ سے داخل ہوتی ہے،ہاتھ میں بیگ ہے)

سیلی (بیگ کو فرش پر پھینکتے ہوئے) چلو خلاصی ہوئی، بیگ میں ہر شے ٹھونس دی ہے میں نے، میں تو، لگتا ہے پیدا ہی، محترمہ کی خدمت کے لئے ہوئی ہوں، لحد سے محد تک۔۔۔ ہوں!! (مسز کمفرٹ پر نظر پڑتی ہے) اور اس مریل مخلوق کو دیکھو، کرسی پر پڑی اینٹھ رہی ہے، کام کی نہ کاج کی دشمن اناج کی۔۔۔ یہ مسٹر کمفرٹ کہاں ہیں؟؟ (مسز کمفرٹ کا رونا دھونا رک جاتا ہے) اور یہ تم ٹسوے کس بات پر بہا رہی ہو؟ اتنی مسٹنڈی کا کی میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہے۔۔۔ یہ مسٹر کمفرٹ کہاں ہیں۔۔۔ ہیلو، میں تم سے پوچھ رہی ہوں۔

مسز کمفرٹ (آنکھیں پونچھتے ہوئے) تمھیں مجھ سے اس انداز میں بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔

سیلی جرأت کیسے ہوئی، ہاہاہاہا، کیا بات ہے تمھاری بھی، تم نواب زادی سے تو جیسے کوئی عالی جناب کہے بغیر بات کرتا ہی نہ ہوگا، مجھے جرأت کیسے ہوئی، ابھی کچھ دیر میں تمھیں پتہ چلے گا کہ کتنے نو کا سو ہوتا ہے۔۔۔ بس کچھ دیر اور انتظار کرو۔

مسز کمفرٹ (اُٹھتے ہوئے) نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔ فوراً۔۔۔

سیلی ہاں ہاں جا رہی ہوں میں۔۔۔ لیکن تمھارے کہنے پر نہیں، میں بڑی خوشی سے یہاں سے چلی جاؤں گی کیونکہ مجھے تمھارا چہرہ دیکھنے کا کوئی خاص شوق نہیں۔

مسز کمفرٹ میں کہتی ہوں دور ہو جاؤ۔

سیلی مادام بخوبی جانتی ہیں کہ تمھاری اس گھر میں کیا حیثیت ہے۔ تم اس طرح کے میڈموں جیسے کپڑے منڈھ کر کوئی میڈم نہیں بن جاؤ گی۔ میں پوچھتی ہوں کہ تم ایسے کپڑے کیوں نہیں پہنتی جیسے دوسری ملازمائیں پہنتی ہیں۔ اب جو مادام نے کرنا ہے وہ کر گزریں گی۔

(داہنی طرف والے دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

مسز کمفرٹ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟

سیلی (باہر سے آواز آتی ہے) میرے راستے سے ہٹ جائیں جناب مسخرے صاحب۔۔۔

(میریکیل اندر داخل ہوتا ہے، مسخروں کے بجائے اپنے مناسب والے لباس میں ہے)

میریکیل (دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے) انتہائی اجڈ اور گنوار قسم کی خاتون ہے یہ سیلی نام کی بلا بھی، کاش یہ فرانسیسی ہونے کے بجائے آئرش ہی ہوتی، کم از کم نصف تہذیب سے تو بہرہ مند ہوتی۔۔۔ اور کچھ اسمارٹ بھی۔۔۔ (مسز کمفرٹ پر نظر پڑتی ہے، بوکھلا جاتا ہے) معذرت خواہ ہوں میں خاتون، مجھے نہیں پتہ تھا کہ آپ یہاں ہوں گی، ورنہ اس طرح نہ چلا آتا، میں ایک مرتبہ پھر معذرت چاہتا ہوں، میں مخل تو نہیں ہوا؟ مم میں ڈک کو ڈھونڈھ رہا تھا، مم میرا مطلب ہے مسٹر کمفرٹ کو (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کس قدر نفیس خاتون لگ رہی ہیں یہ محترمہ بھی۔

مسز کمفرٹ مسٹر کمفرٹ یہاں آنے ہی والے ہیں، میں آپ کا نام دریافت کر سکتی ہوں؟

میریکیل اوہ کیوں نہیں مادام (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) کس قدر نفیس اندازِ گفتگو ہے ان کا، یہ ڈک تو نرا گاؤدی ہے، کچھ سمجھتا ہی نہیں (ایک لمحے کو خاموشی چھا جاتی ہے)
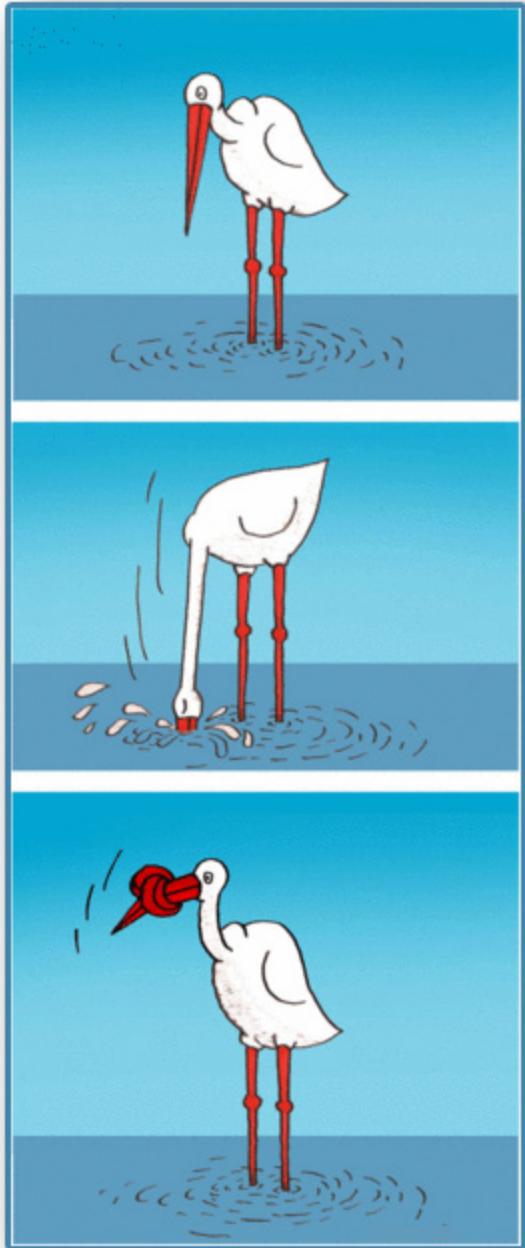
مسز کمفرٹ جی جناب، آپ کی تعریف؟

میریکیل میریکیل مادام، مم میرا مطلب ہے جارج میریکیل۔۔۔

مسز کمفرٹ اوہ مسٹر میر یکیل، میں نے آپ کا نام اکثر مسٹر کمفرٹ کی زبانی سُنا ہے، وہ اکثر آپ کا تذکرہ فرمایا کرتے ہیں۔آپ اُن کے بہت پرانے دوست ہیں، یہی بات ہے ناں؟

میر یکیل جج جی محترمہ، یہ امر میرے لئے باعث فخر ہے کہ آپ بھی مجھے جانتی ہیں۔

مسز کمفرٹ (قدرے ہچکچاتے ہوئے) تو محترم، اُن کے ایک دوست کی حیثیت سے کیا آپ نے یہ بات نوٹ نہیں کی کہ اُن کے طرزِ عمل میں کچھ تبدیلی آگئی ہے، میرا مطلب ہے پہلے کے مقابلے میں، مم میرا مطلب ہے کہ کیا ضرورت سے زیادہ کام نے اُنہیں خاصا مضمحل نہیں کردیا ہے؟

میر یکیل جی بالکل، اس میں کوئی شک نہیں، آپ کا مشاہدہ بالکل ٹھیک ہے، وہ واقعی آج کل بہت مصروف ہو کر رہ گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہم دوستوں میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔کم از کم میں تو اِتنی محنت کا متحمل نہیں ہو سکتا (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) ڈک اگر میرے منہ سے ایسے الفاظ سنے تو خودکش بمبار کی طرح پھٹ پڑے لیکن خیر ہے، ایسی خوبصورت خاتون کے لئے تو میں اپنا قتل بھی معاف کرسکتا ہوں۔

مسز کمفرٹ میرے بارے میں اُن کا رویہ عجیب سا ہوگیا ہے اِن دنوں، خصوصاً آج صبح سے تو خاصے عجیب انداز میں پیش آرہے ہیں۔ پہلے کبھی ایسا سلوک نہیں کیا تھا اُنہوں نے مجھ سے، مم مجھے تو لگ رہا ہے کہ اُن کا میلان کسی دوسری۔۔۔ دوسرے مسئلے کی جانب ہوگیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا، قطعاً نہیں ہوسکتا، وہ ایسا نہیں کرسکتے، وہ ایسے نہیں ہیں، اُن کے اعصاب پر بوجھ ہوگا زیادہ کام کا۔

میر یکیل جی مادام، آپ نے بالکل درست فرمایا ہے، وہ ہمیشہ سے محنتی رہے ہیں۔

مسز کمفرٹ کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا، مم میرا مطلب ہے کہ کیا آپ نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ۔۔۔ کہ وہ کسی دوسری خاتون کی زیادہ پرواہ کرنے لگا ہے، مم میرا مطلب کہ اُن کی توجہ کسی دوسری خاتون کی طرف ہوگئی ہے، آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں ناں؟

میر یکیل نہیں ابھی تو ایسا کچھ نہیں ہے، ہاں البتہ آپ کو شائد علم نہیں ہے کہ مسٹر کمفرٹ بہت پہلے کسی سے بہت زیادہ محبت۔۔۔

مسز کمفرٹ کسی سے محبت کرتے تھے؟ کس سے محبت کرتے تھے؟؟

میر یکیل (جلدی سے) اوہ، یہ بہت پرانی بات ہے لیکن اب وہ بظاہر اُس حماقت کے حصار سے آزاد ہو چکے ہیں۔ابھی آج ہی اُنہوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب کسی خاتون کی پرواہ نہیں کرتے، لیکن سچ پوچھیں تو مجھے یہ بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی ہے۔درحقیقت، میں اس معاملے کو خاصی اچھی طرح جانتا ہوں اور میں کسی بھی دوسرے فرد کی نسبت زیادہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ابھی تک اُن خاتون کے عشق میں گرفتار ہیں، پتہ نہیں کیوں، لیکن مجھے لگتا کچھ ایسا ہی ہے۔

مسز کمفرٹ (تیزی سے) یہ صحیح نہیں ہے جناب، مجھے اس پر رتی بھر بھی یقین نہیں، یہ سارا جھوٹ کا پلندہ ہے۔

میر یکیل (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) خدا کی پناہ، میں بھی کیسا گدھا ہوں، کس سے کیسی بات کہہ رہا ہوں (مسز کمفرٹ سے) جی بالکل آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، واقعی اس بات میں کوئی سچائی نہیں، ساری کہانی ہی بےبنیاد مفروضوں پر گھڑی گئی

ہے۔

(مسز میڈر داہنی طرف والے دروازہ نمبر ۲ سے اندر داخل ہوتی ہیں)

مسز میڈر تو تم نے میری ملازمہ کو بتانے سے انکار کر دیا ہے کہ مسٹر کمفرٹ کہاں ہیں، کیوں؟ تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں خود انہیں تلاش کر لوں گی اور جب وہ مل جائیں گے تو تم دیکھنا، تمھیں اس گھر سے چلتا کر دیا جائے گا۔

(سامنے والے دروازے سے باہر نکل جاتی ہیں)

مسز کمفرٹ (منہ پر ہاتھ رکھ کر حاضرین سے) یہ عورت تو پیر تسمہ پا بن کر رہ گئی ہے، جان ہی نہیں چھوڑتی (میر یکیل سے) ایک بات تو بتائیں جناب، یہ کون خاتون ہیں؟

میریکیل ارے آپ کو پتہ نہیں ہے، یہ مسز کمفرٹ ہیں۔

مسز کمفرٹ کیا کہا، مسز کمفرٹ؟ محترم کیا آپ مجھے دھوکے میں رکھنا چاہ رہے ہیں؟

میریکیل نہیں محترمہ، مجھے پتہ ہے کہ یہ خاتون مسز کمفرٹ ہیں۔

مسز کمفرٹ لیکن یہ کیسے ممکن ہے، مسز کمفرٹ تو میں ہوں۔

میریکیل (ہکا بکا ہو کر) آ آ آپ؟ آپ مسز کمفرٹ ہیں؟؟ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ آپ بھی شادی شدہ ہیں!

(مسز کمفرٹ، مسٹر اور مسز میڈر صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں)

مسز کمفرٹ میں اپنی بات دوہراتی ہوں جناب کہ میں ہی مسز کمفرٹ ہوں، مسٹر کمفرٹ کی منکوحہ۔

میریکیل ڈک کی بیوی؟

مسز میڈر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

مسز کمفرٹ (اُن سب کی طرف پلٹتے ہوئے) یہ سامنے مسٹر کمفرٹ کھڑے ہوئے ہیں اور میں، مسٹر کمفرٹ کی قانونی بیوی ہونے کی حیثیت سے مطالبہ کرتی ہوں کہ اس عورت کو (مسز میڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فوری طور پر میرے گھر سے نکال باہر کیا جائے۔

(پردہ گرتا ہے)

ہنوز بلّی دُور است

نادر خان سرگروہ

چوہوں کا انسانی زندگی میں اہم رول ہے۔ یہ چوہوں کا اِنکسار ہے کہ وہ جنگلوں میں آزادی سے گھومنے کی بجائے ہمارے گھروں میں گھسنے اور بلوں میں گھسنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض جانور دل میں گھر کر جاتے ہیں اور چوہے گھر میں بل کر جاتے ہیں۔ انسان پر دواؤں اور جراحی کے تجربے کرنے سے پہلے اِن ”ہر بل عزیز“ چوہوں کی ہی چیر پھاڑ کی جاتی ہے۔ گویا دونوں ایک سی صفات کے حامل ہیں۔ انسان تو انسان، بلّی بھی مَرے ہوئے چوہے کو نہیں بخشتی۔ اُسے اُچھال اُچھال کر اپنے بچوں کو جھپٹنے پلٹنے، پلٹ کر جھپٹنے کی مشق کراتی ہے۔ لیکن وہ بڑے ہو کر سب سبق بھول جاتے ہیں اور تمام عمر خواب میں چھیچھڑے ہی دیکھتے رہتے ہیں اور ہر اُس اِنسان کا راستہ کاٹتے ہیں جو جلدی میں ہوتا ہے۔ کہاں گئیں وہ شیر کی خالائیں، چوہے کو دیکھ کر جن کی ’رگِ ہلاکت‘ پھڑکتی تھی؟ دوسری طرف چوہے بھی اپنے بچوں کو بلّی سے بچنے اور اُسے چکما دینے کے گُر سکھاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی بڑے ہو کر بلّی کو چکما دینے کی بجائے اُس کی چمکتی آنکھوں میں اپنی بجھتی آنکھیں ڈال کر چیلنج کرتے نظر آتے ہیں۔ گویا پہلے ہی دن بلّی مارنا چاہتے ہوں۔

چوہوں کی ایک عادت ہمیں پسند نہیں کہ اُن کے ہاں ڈسپلن نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ جتنا کھاتے ہیں اُس سے کہیں زیادہ خانہ خرابی کرتے ہیں۔ اور جب اِن ’کھانا خرابوں‘ کی چوری پکڑی جاتی ہے تو بوکھلاہٹ میں آگے پیچھے نہیں دیکھتے۔ بندوق کی گولی کی طرح سَٹ سَٹ چھوٹتے ہیں۔ بندوق کی گولی تو کم اَز کم لحاظ رکھتے ہوئے نشانے کے آس پاس سے گزر جاتی ہے، لیکن یہ جس سے بچنا چاہتے ہیں اُسی کی ٹانگوں میں آجاتے ہیں۔ ڈسپلن تو چیونٹیوں کے ہاں ہوتا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے، وہ اپنی ترتیب بگڑنے نہیں دیتیں۔ اِس ڈسپلن کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے، جس کی توقع چوہوں سے نہیں کی جاسکتی۔ اِن سے تو بلّی کے گلے میں ایک گھنٹی تک باندھی نہ گئی۔ یہ نانجار اَب تک اِس خوش فہمی میں ہیں کہ ہنوز بلّی دُور اَست!

چوہوں اور ہماری آنکھ مچولی کا کھیل بچپن سے چلا آرہا ہے۔ زندگی میں دو ہی چُوہے ہمارے دل کو بھائے۔ اُن میں سب سے پہلے ہے، چالاک، بہادر ’جیری‘۔ جس کی شرارتیں ہم نے ہنستے ہنستے برداشت کیں اور ’ٹام‘ کے خلاف قدم قدم پر اُس کی حمایت کی۔ اور

دوسرے نمبر پر ہے وہ چُوہا، جس کی دُم کمپیوٹر سے جُڑی ہوتی ہے، جب کہ بقیہ چوہوں نے تو ہماری ناک میں دَم کر رکھا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ہماری ناک میں دُم کر رکھی ہے۔ ہم اِن کے بل بھرتے رہتے ہیں اور یہ پڑوسی کے گھر سے ہمارے گھر تک ایک نیا بل پاس کرتے ہیں۔ کاش! اِن کا بھی یہ شیوہ ہوتا کہ:

گھروں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

بات گھروں تک ہی موقوف نہیں، اِن کے حوصلے اِتنے بلند ہیں کہ یہ ہمارے پیٹ میں بھی دوڑتے ہیں۔ کاش! ہم چوہوں کا شکار رائج کر سکتے، تو گھر بیٹھے شکار کا شوق پورا کرتے۔

لیکن چوہوں کو مارنے میں ایک قباحت یہ ہے کہ ہم ہاتھ میں رائفل پکڑے، ایک پَیر مَرے ہُوئے، بلکہ مارے ہُوئے چوہے پر رکھ کر اَپنی تصویر نہیں کھنچوا سکتے۔ جب چوہا نظر ہی نہیں آئے گا تو چوہا مارنے اور تصویر اُتروانے کا فائدہ؟ چوہا مارنے میں ایک قباحت اور بھی ہے کہ اِس کارنامے پر ہم فخر بھی نہیں کر سکتے۔ لوگ کہیں گے، ''گھر میں چوہا مارا! کس نے دیکھا''...... یا پھر یہ کہ 'دیکھو! مارا تو کیا مارا!۔۔۔ چوہا؟۔۔۔ ہا۔۔۔ بڑا آیا ماؤس مار خاں!''

آئیوڈین ملا نمک

میں نے رات ہی سن لیا تھا کہ چاچے صدیق کا سب سے چھوٹا لڑکا رشید عرف شیدا تیسری بار بھی میٹرک کے امتحان میں فیل ہوگیا ہے، اس لیے چاچے صدیق کو صبح سویرے اپنے دروازے پر دیکھ کر میں وہی گھسے پٹے فقرات سننے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا کہ آج کل کوئی پڑھائی نہیں ہو رہی، نہ استاد توجہ دیتے ہیں نہ ہی بچے۔ لیکن جب چاچے صدیق نے یہ پوچھا کہ "ماسٹر جی تیس کو چالیس پر تقسیم کرنے سے کیا جواب آتا ہے" تو میرا ماتھا ٹھنکا، میں نے سوچا چاچا صدیق بے چارہ آخر کار شیدے کے تعلیمی اخراجات سے زچ ہوگیا ہے۔ مجھے ترس آیا میں نے موبائل پر حساب لگا کر جواب ایک اعشاریہ تیس نکال کر بتایا کہ سوا روپیہ روزانہ بنتا ہے۔

یہ سن کر چاچے نے ایک گہری سانس لے کر کہا ''چلو یہ تو میں برداشت کر لوں گا''۔

میں نے کہا ''آپ فکر نہ کریں اس سال شیدا ضرور پاس ہو جائے گا''۔

وہ کہنے لگا ''پتر! سارا قصور شیدے کی ماں کا ہے۔ میں سمجھا سمجھا کر تنگ آ گیا ہوں کہ روز روز گوشت نہ پکایا کر پر وہ مانتی ہی نہیں''۔

میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا ''چاچا جی! شیدے کے فیل ہونے سے گوشت پکانے کا کیا تعلق بنتا ہے؟ میں کچھ سمجھا نہیں''۔

چاچے نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''پتر! آ میرے ساتھ ذرا شہر کے چوک تک چل، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔''
میں بادلِ ناخواستہ اُن کیساتھ چل پڑا۔ چوک پر پہنچ کر چاچے صدیق نے ایک خالی بینچ پر بیٹھتے ہوئے کہا ''ماسٹر جی! گن کے بتاؤ کہ اس وقت چوک میں کتنی ''گدھا گاڑیاں'' کھڑی ہیں؟''
''میں نے ان کی بات مان کر گن کر بتایا ''چار''
وہ کہنے لگے ''اچھا اب لوڈنگ رکشے گن کے بتا۔''
میں نے کہا ''آٹھ۔''
چاچا صدیق ہنس کر کہنے لگا ''ماسٹر جی، موٹا موٹا حساب بھی لگائیں تو لوڈنگ رکشے آنے سے پہلے یہاں بارہ گدھا گاڑیاں ہوں گی، اب آٹھ گدھا گاڑیاں کم ہوگئیں ہیں تو بتاؤ کہ اُن گاڑیوں کے گدھے اب کس کام آتے ہوں گے؟''
میں کافی دیر سوچتا رہا پھر کھسیانا ہو کر بولا ''چاچا جی گدھے گدھے ہوتے ہیں کہیں بھی چلے گئے ہوں گے۔''
وہ پھر ہنسا اور کہنے لگا ''تم بابو لوگ ہو، نہ کبھی گدھا خریدا نہ بیچا۔۔۔او پتر! آج کل سیکنڈ ہینڈ گدھا بھی چالیس، پچاس ہزار سے کم میں نہیں ملتا، تو تیرا کیا خیال ہے، غریب ریڑھی بانوں نے گدھے ایسے ہی بھگا دیے ہوں گے؟''
میں نے کہا ''یہ بھی تو ہوسکتا ہے آگے بیچ دیے ہوں گے۔''
چاچے صدیق پر ہنسی کا ایک اور دورہ پڑا اور بولا ''اب تو نے ٹھیک بات کی ہے پتر! اب ذرا غور سے میری بات سن کہ شیدے کے فیل ہونے میں گوشت پکانے کا کیا تعلق بنتا ہے، پتر جب ہر کوئی لوڈنگ رکشے بنا رہا ہو تو گدھے کون لے گا؟ او ماسٹر جی اب بازار میں گدھوں کا گوشت بکتا ہے۔ گدھے اب فائیو سٹار ہوٹلوں میں پکائے جاتے ہیں۔''
میں نے کہا ''اخ تھو! ایسا حرام کام کرتے ہیں لوگ۔''
وہ کہنے لگا ''حرام حلال کی تو خیر ہے، پر اصل مسئلہ تو یہ ہے کہ شیدے کی ماں نے شیدے کو گدھوں کا گوشت کھلا کھلا کر اس کا ذہن بھی گدھوں جیسا کر دیا ہے، وہ میٹرک پاس کیسے کرے گا؟ میرے پاس لے دے کر اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ جو گدھے اس وقت شہر میں زندہ چل پھر رہے ہیں انہیں آئیوڈین ملا نمک ہی کھلا دوں، سنا ہے اس سے عقل تیز ہوتی ہے، تاکہ میرا شیدا جس گدھے کا گوشت کھائے وہ تو کسی کام کا ہو۔ تم نے جو سوا روپے روزانہ کا حساب لگا کر دیا ہے، اتنے پیسوں سے میں شیدے کے اگلے امتحان تک میں اپنا یہ مشن مکمل کرلوں گا اور تمام گدھوں کو آئیوڈین ملا نمک کھلا دوں گا۔ اچھا اب آخری بات یہ بتا پتر! یہ آئیوڈین ملے نمک کی تھیلی کتنے کی آتی ہے؟''
میں نے کہا '' بیکری سے اچھے والا پچاس روپے میں اور عام دکان سے دو نمبر آٹھ روپے میں مل جاتا ہے، پر اس میں آئیوڈین کی مقدار مقررہ حد سے زیادہ ہوتی ہے۔''
چاچے کی آنکھوں میں چمک آ گئی، کہنے لگا ''واہ! پہلی دفعہ ملاوٹ کا فائدہ ہم غریبوں کو ہونے لگا ہے۔ آٹھ روپے والا نمک تو بنایا ہی گدھوں کے لیے ہوگا تو بتا پتر اس کارِ خیر میں کتنے پیسے دے سکتا ہے؟''
میں نے چاچے کی ''بات'' کو سمجھتے ہوئے بیس روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ سوا روپے روزانہ میں مجھے یہ سودا اتنا برا نہیں لگا۔

محمد خلیل الرحمٰن

ایک اتوار کی صبح

اتوار کی خوبصورت صبح جوں ہی ہمارے چہرے پر طلوع ہوئی، یعنی ہماری نصف بہتر نے ہمارے چہرے پر سے چادر ہٹاتے ہوئے ہمیں یہ روح فرسا خبر سنائی کہ ہمارا پیارا اخبار پانی سے بھری ہوئی بالٹی کی نذر ہو چکا ہے، ہم بے چین ہوگئے۔ اتوار کی خوبصورت صبح گئی بھاڑ میں، اور تمام تر سُکھ چین اس بے کلی کی نذر ہوئے۔

اتوار کی صبح ایک مہذب انسان کے لیے سب سے خوش گوار وہ لمحات ہوتے ہیں جب آنکھ کھلتے ہی بیگم کی سُریلی آواز کانوں میں رس گھولتی ہے: ''لیجیے یہ آپ کا نگوڑا اخبار آ گیا ہے۔''

اب ہم اخبار کو بائیں ہاتھ سے تھامتے ہیں، آنکھیں بند کیے ہی اسے کھولنے کی تگ و دو کرتے ہیں، داہنے ہاتھ سے اپنی عینک سنبھالتے ہوئے اسے اپنی ناک پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے آپ سے یوں گویا ہوتے ہیں: ''بیٹا! لو اب آنکھیں کھولو''۔ اخبار میں خبروں کا سیکشن، مقامی سیکشن اور کتب کی دنیا کے علاوہ ایک اور اہم حصہ ہمارا منتظر ہوتا ہے جہاں حسینانِ جہاں کی رنگین اور خوبصورت تصویریں سجی ہوتی ہیں۔ ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر اس حسین دنیا میں کھوسے جاتے ہیں۔ ہالی وڈ، بالی وڈ اور لالی وڈ کی چٹ پٹی خبریں اور حسینانِ ختن کی شوخ و چنچل، اداؤں بھری رنگ برنگی تصویریں۔

لیکن آج ہی کیا غضب ہو گیا۔ آن کی آن میں یہ کیا ماجرا ہو گیا کہ اخبار کا اخبار پانی میں شرابور ہو گیا۔ ہائے حسینانِ ختن! کے پانی میں بھیگے ہوئے چہرے۔۔۔ اُف وہ توبہ شکن حسنِ نمکین۔۔۔ ہمارا مطلب ہے، ارے کوئی ہے جو اس اخبار کو خشک کر دے تاکہ ہم گزرے ہوئے کل کی وہ خبریں پڑھ سکیں جنھیں ٹی وی اسکرین پر نہیں دیکھ سکے تھے۔ اور اس طرح اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ مطالعہ علم حاصل کرنے کا ایک بڑا اہم ذریعہ ہے۔

اپنی اس دُہائی کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ پا کر ہم نے صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے کی ٹھانی اور مائل بہ عمل ہو گئے۔۔

پس منظر

ہمارا اخبار والا روز کا اخبار تو کچن کی بالکونی سے اوپر پھینکتا ہے، البتہ اتوار کا اخبار ضخیم ہونے کی وجہ سے اوپر آ کر دروازے کی نچلی درز سے اندر سرکا دیتا ہے۔ یہ اس کا معمول ہے۔

پیش منظر

آج چونکہ ہمارا معمول کا اخبار والا چھٹی پر تھا لہٰذا اس کی جگہ لینے والے نے اتوار کا ضخیم اخبار بھی بنڈل بنا کر بالکونی سے اوپر کی جانب اچھال دیا۔ حسنِ اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق، کل رات پانی کی فراہمی میں تعطل کے پیشِ نظر ہماری نصف بہتر نے (حفظِ ما تقدم کے طور پر) کچن کی بالکونی میں ایک عدد بالٹی پانی سے بھری رکھ چھوڑی تھی تاکہ سحری میں برتن دھونے کے کام آئے۔ وہ بالٹی اس طرح داشتہ آید بکار کے مصداق کام آئی کہ اخبار نے فوراً اس کے اندر گھر کیا اور مآل کار ہمارے چہرے پر چھینٹے اُڑاتے ہوئے ہمارے ہاتھوں میں آیا۔

اشیائے ضرورت

ہمارے اِس تجربے کے لیے مندرجہ ذیل نکات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے

۱۔ برقی رو کی فراہمی میں تعطل نہ ہو۔

۲۔ اخبار اتوار ہی کا ہو

۳۔ گھر میں موجود بجلی کی استری قابلِ استعمال ہو اور اِس

میں کوئی بنیادی نقص نہ ہو۔

ہمارا کامیاب تجربہ

ہم نے سب سے پہلے احتیاط کے جملہ تقاضوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے خبروں کا حصہ اُٹھایا اور اس کے صفحات پر نہایت احتیاط سے استری پھیرتے چلے گئے۔ جب وہ کافی حد تک خشک ہوگیا تو اسے اپنے بستر پر ہلکے پنکھے میں سوکھنے کے لیے پھیلا دیا۔ پھر مقامی سیکشن پر ہاتھ صاف کیا اور سب سے آخر میں کتب دنیا پر اچھی طرح تجربہ کرنے کے بعد ہم تیار تھے کہ اپنے پسندیدہ اتوار میگزین کو خشک کریں جہاں پر چند حسینوں کے پانی میں بھیگے ہوئے نمکین چہرے ہمارے منتظر تھے۔ لیکن!!! نصف بہتر کی قہر آلود نظروں نے ہمیں اس منصوبے پر عمل درآمد سے باز رکھا اور ہم ان خوب صورت چہروں کو بستر پر پھیلا کر باقی ماندہ خشک اخبار کی بے مقصد ورق گردانی اور وقت گزاری کرنے لگے۔

ہمارا ناکام انجام

انتظار، انتظار، انتظار۔۔۔اے نسیمِ صبح! جلد اس پانی کو خشک کردیتا کہ ہم ان حسیناؤں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے سہانے دِن کا آغاز کرسکیں۔

سبق

اس تجربے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اخبار پڑھتے وقت، خاص طور پر حسینوں کے گداز چہروں پر نظر ڈالتے وقت، خیال رکھیے کہ بیگم صاحبہ کچن میں مصروف ہیں۔ ان کے قریب آتے ہی خبروں والے حصے کا بغور مطالعہ شروع کردیجیے کہ سیاست، صحافت، مذہب، دِگرگوں سماجی و معاشرتی حالات ہی آپ کے مطالعۂ اخبار کا مطمحِ نظر ہیں۔ خبردار۔۔۔

''سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری''

کا راز کہیں بیگم پر افشاء نہ ہوجائے۔

راشد حمزہ

بی بی شیریں، بلی اور کمینہ

بی بی شیریں نے ایک بلی پالی تھی جو کمینے کیلئے ایک عذاب سے کم نہیں تھی، ہر گزرتے لمحے کیساتھ بلی سے اسکے تعلقات خراب اور جلن بڑھتی جا رہی تھی، کمینے کو شکایت تھی کہ ایک تو بلی ''بی بی شیریں'' کو خاصا مصروف رکھتی ہے تو دوسری طرف موصوفہ بلی سے بے انتہاء پیار بھی کرتی ہیں، کمینہ اکثر اپنی بدقسمتی پر روتے ہوئے کہتے تھے کہ میری بدقسمتی کی انتہاء تو یہ ہے کہ عرصے بعد جب بڑی مشکلوں سے اپنی لڑکی سے ملاقات کا کوئی موقع نکل آتا ہے تو آدھی سے زیادہ ملاقات بلی کی نذر ہوجاتی ہے، کمینہ کہتا ہے کہ اکثر ملاقاتوں میں بلی کی گستاخیاں اس حد تک بڑھ جاتی تھیں کہ بے اختیار جی میں آتا ہے کہ یا تو خودکشی کرلوں یا بلی بن جانے کی دعا مانگوں، میں نے خودکشی کے مقام اور دعا کے مقام کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے ''خودکشی کا مقام وہ ہوتا ہے جب بی بی شیریں کی بلی میری چمی لینا شروع کردے جبکہ بلی بن جانے کی خواہش تب امڈاتی ہے جب وہ بی بی شیریں کے ہونٹ اور سرخ آنار ایسے رخساروں سے کھیلنا شروع کردے۔۔۔کمینہ کہتا ہے میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ ایک یہ بھی ہے کہ بی بی شیریں کو خوامخواہ یقین ہوچکا ہے کہ اسکی کمینی بلی اسے بے حد و بے حساب پیار کرتی ہیں۔''

جب وہ حد سے زیادہ بلی سے جلنے لگا تو اس نے بی بی شیریں کو جلانے کیلئے ایک کتا پالنے کا فیصلہ کر دیا، کتا کہیں سے ڈھونڈ لیا اور نہایت شوق سے پالنے لگا، لیکن کمینے کا کتا کمینے کی طرح کمینہ نکلا، نہ تو اس نے کمینے کی چمیاں لینے میں اپنی دلچسپیاں ظاہر کی نہ بی بی شیریں کو جلنے کا موقع فراہم کیا بلکہ کتا پالنے کے بعد کمینے کی لڑکی ان سے کترانے لگی۔ جب ملاقات کا کوئی موقع نکل آتا تو بی بی شیریں اس وجہ سے لڑنے لگتی کہ تمہارا کتا میری بلی پر لائن مارتا اور لائن ہی کیا کتے اور بلی میں اب تو ایک طرح سے دوستانہ مراسم شروع ہو چکے ہیں۔ ایک دن بی بی شیریں نے کمینے کے کتے کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا مگر اس کو اپنی بلے کے ہاتھ رنگے نظر نہیں آئے۔ بی بی شیریں نے کمینے کے ہاں شکایت لگا دی کہ تمہارا کتا میری بلی میں بہت زیادہ دلچسپی لینے لگا ہے جو مجھے بالکل قابل قبول نہیں۔

بی بی شیریں نے کمینے کو واضح پیغام دیا کہ اپنے کتے کو میری بلی سے دور رکھا کرے بصورت دیگر مجھ سے دستبردار ہو جاؤ، کمینے نے کتے کو راہ راست پر لانے کی محنت شروع کر دی، ایک دن ملاقات کا موقع نکل آیا تو کتا بھی کہیں سے آ نکلا اور ملاقات میں شامل ہو گیا۔ اس دن کمینہ بہت خوش تھا خوشی کی وجہ بی بی شیریں کیساتھ بلی کا نہ آنا تھا مگر اس دفعہ مسئلہ کتے نے پیدا کر دیا۔ شاید بی بی شیریں پورا دن بلی سے کھیل کر آئی تھی، کتے کو ان سے بلی کی خوشبو آتے ہوئی محسوس ہوئی تو اس نے اس کے ہاتھ بھی چاٹے اور رخسار بھی۔ بی بی شیریں کو کتے کی یہ گستاخی اتنی بری لگی کہ کمینے سے ملاقاتوں کا سلسلہ دو سال کیلئے برطرف کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔

ایک طرف کمینہ بی بی شیریں کے فیصلے سے تپ رہا تھا دوسری طرف اپنے ہی کتے کا رقیب بننے پر جلال میں آ گیا تھا یوں اس نے کتے سے قطعِ تعلق کا فیصلہ کر کے کتے کو گاؤں سے پچاس کلومیٹر دور ایک دوست کے ہاں چھوڑ دیا.. اس سانحے کے بعد سے کمینہ کتے اور بلیاں پالنے کا سخت ناقد رہا ہے، اتنا کہ جہاں کہیں کتا دیکھے تو بھونکنے کے سے انداز میں بک بک کرنا شروع کرنے لگتے ہیں۔

نیرنگِ خیال

دوست کے نام

ریاض میں مقیم عمرے پر جانے والے اک دوست کے نام

السلام وعلیکم!

میاں کیسے ہو؟ آخری اطلاعات تک تو بالکل ٹھیک تھے۔ مگر آخری خط سے ذہنی طبیعت رواں نہیں لگتی۔ یہ چوکور ڈبہ بھی بھئی کمال کی چیز ہے۔ کہاں ہم گھنٹوں خطابت میں سر کھپاتے۔ ورق کے انتخاب پر دماغ و دل مناظرے کرتے۔ پھر قاصد کے نخرے الگ۔ مگر میاں یہ موٹا بھائی نے تو اس سے روشناس کرا کر کمال کر دیا ہے۔ ایک جھاڑو سا پکڑ کر ساری لائنوں پر پھیر دو تو بس خطاطی اور۔ ایسا دل آسا خطاط تو کبھی نہ دیکھا تھا نہ سنا۔ اور قاصد کی برق رفتاری تو دیکھنے لائق۔ ادھر مراسلہ لکھا ادھر ویسے چوکور ڈبے میں پہنچا۔ اور مزا یہ کہ رازداری شرط۔ بھئی بہت خوب۔ اللہ بھلا کرے ہمارے موٹے بھائی کا۔ اس چیز کا استعمال سکھا کر سیدھا جنت والے پلاٹ سے ۱۰ مرلہ زمین کے حقدار ٹھہرے۔

میاں وہ مکہ کا کیا چکر ہے؟ ہم نے تو یہاں صوفیاء کی شاعری میں ہمیشہ یہی پڑھا کہ

مکے دے وال اوہی جاندے کم جنہاں دے ٹوٹی

اب اس مصرعہ کی روشنی میں دیکھیں تو تمہیں اچھا بھلا شریف پاتے ہیں۔ پھر ادھر جانا چہ معنی دارد؟ اور اوپر سے تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ کوے سے تو کوئی ۴ سال چھوٹے ہی رہے ہو گے تم۔ اس بھری جوانی میں دیدار کعبہ! نہ میاں نہ۔۔۔۔ دیکھو ایسا نہ کرنا۔ یہ نہ ہو وہاں جا کر کوئی نیک ہونے کی کوئی دعا مانگ بیٹھو اور وہ ذات بے نیاز تمہیں خالی ہاتھ نہ لوٹائے۔ جب یہ جوانی ڈھلے گی تو توبہ بھی کر لینا۔ غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی۔ سنا ہے زیارات کا بھی ارادہ کر رکھا ہے۔ تمہیں وہاں مال ٹڈی جمع کرنے بھیجا ہے کہ سیر و

سیاحت کرنے۔ زیارات کا اتنا ہی شوق تھا۔ تو یہاں بتاتے۔ صرف ملتان اور اُچ شریف میں ہی تمہیں اتنی زیارات دکھا دیتے کہ سوچ ہے تمہاری۔ ابلیس بھی تمہاری اس حرکت سے سخت پریشان ہے۔ اور یہی شعر پڑھتا پھرتا ہے

یہ عمرے پر جانے کا کیا تذکرہ ہے
تمہارے سوا کوئی اپنا نہیں ہے

اچھا اب جا ہی رہے ہو تو دل کو درد سے نہ بھر لینا۔ جیسے گئے ہو ویسے ہی واپس آنا۔ میں نے سنا ہے کہ وہاں جا کر طبیعت بڑی نیکی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ بڑے بڑے ہل جاتے ہیں۔ اور کچھ ظالم تو خوفِ خدا سے رو دھو بھی لیتے ہیں۔ اپنے محلے کے حاجی صاحب کو دیکھتا ہوں تو اور بھی رونا آتا ہے۔ کیسے آزاد مرد تھے۔ کبھی تو دخترِ رز کے عشق میں مجذوب ہو کر صرف زیر جامہ میں ہی سڑکوں پر نکل آتے تھے اور فرماتے تھے کہ میاں پردہ دیکھنے والے کی آنکھ کا ہوتا ہے، مگر اب دیکھو تو انگور سے بھی شرماتے ہیں۔ ہر وقت چہرے پر اک رقت طاری رہتی ہے۔ ظلم یہ کہ لوگ اسکو نیکی پر محمول کرتے ہیں۔ لو بھئی یہ کون سی نیکی ہے کہ اچھا بھلا ہنستا کھیلتا آدمی روتا پھرے اور لوگ اسے حاجی صاحب حاجی صاحب کہیں۔ بس یار دل کانپتا ہے آشیاں کو آشیاں کہتے۔ تم ننھی جان، خدانخواستہ اس طرح الجھ گئے تو ہم۔۔۔۔ شش شش میرے منہ میں خاک۔۔۔ ویسے بھی تمہارے چہرے پر نورانیت بڑی عجیب سی لگے گی۔

اچھا سنو! میرے لئے تبرکات میں کھجور لے آنا۔ تمہیں پتا یہی وہ تبرک ہے جس پر مجھے سب سے زیادہ خوشی ہوتی۔ یہ اپنے محلے کے ہی باؤ جی جب گئے تھے۔ تو میرے لئے جائے نماز اٹھا لائے۔ کہنے لگے میاں میں اسے ادھر بچھا کر نماز پڑھا کرتا تھا۔ میں نے کہا قبلہ آپ نے پڑھی۔ پر مجھے کیا فائدہ۔ مجھے تو کھجور لا دیتے۔ ڈر کے مارے اس پر نماز نہیں پڑھتا کہ کہیں اثر انداز نہ ہو جائے۔ آخر کو احتیاط بہتر ہے۔

اب آخر میں نصیحت بھی سنتے جاؤ۔ اگر کوئی دلگداز واقعات سنانے شروع کرے تو فوراً دل کو ادھر ادھر مائل کرنے کی کوشش کرنا۔ ان لوگوں میں عیب ڈھونڈنا تاکہ اندر کی نیکی کو حاوی ہونے کا موقع نہ ملے۔ اور کبھی کبھی تو ٹھیک ہے مگر کثرت سے ایسی جگہوں پر نہ جانا۔ آگے ہی کل کے خط میں تم نے یہ بات لکھ کر ڈرا دیا ہے کہ نمازوں میں باقاعدگی آ گئی ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

بیگم صاحبہ معمول کے مطابق اپنے کمرے میں ناک پر عینک رکھے ڈاکٹروں کی طرح میں اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور کچھ ہی دیر میں میری زوجۂ محترمہ نمودار ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح ان کے استقبال میں کھڑا ہوا لیکن بیگم صاحبہ کا رویہ آج ہمیشہ سے کچھ الگ تھا۔ محترمہ کا منہ لٹکا ہوا تھا۔
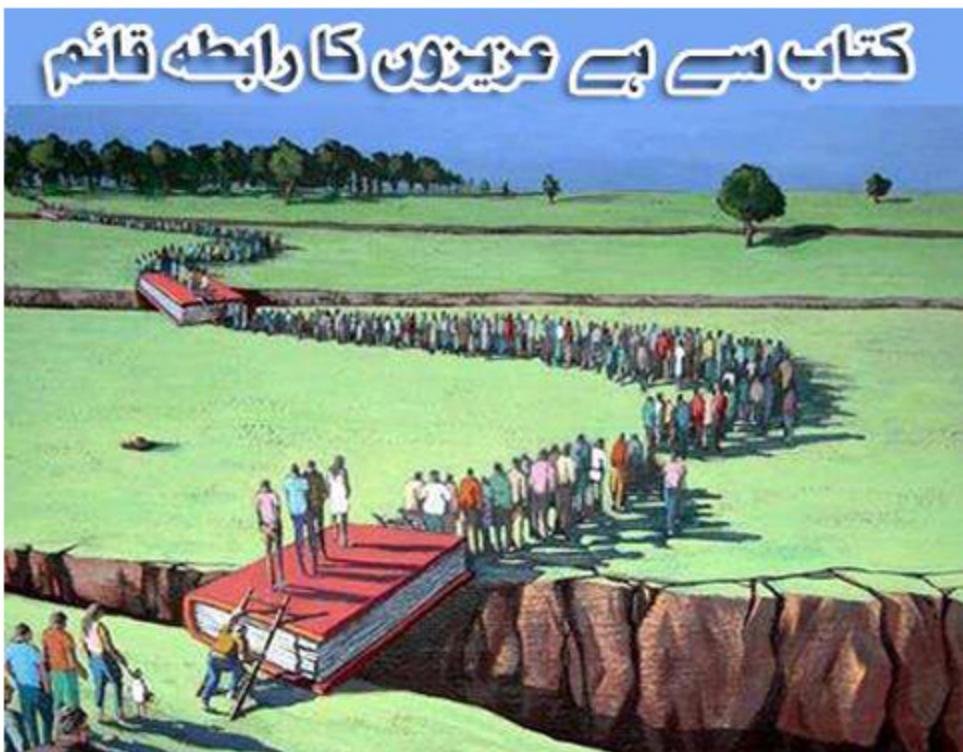
میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ''بیگم اگر جان کی امان پاؤں تو اس لٹکے ہوئے منہ کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

ایک ٹھنڈی آہ بھری محترمہ نے، میں نے جلدی سے حفاظتی تدابیر کی اور سوچا کہ آج پھر غصہ مجھ پہ ہی نکلے گا لیکن آج کچھ

نصیب اچھے تھے، کہنے لگی ''پانی تو پی لینے دو پھر بتاتی ہوں۔''

میں نے بہت ادب اور احترام کے ساتھ محترمہ کو پانی پیش کیا اور ان کی پہنچ سے تھوڑا دور ہو کے بیٹھ گیا۔

منہ کو تھوڑا اور لٹکا کے کہنے لگیں ''آج تو میرا دن ہی خراب ہے۔ فلاں کی فوتگی پہ گئی تھی بالکل مزہ نہیں آیا، جیسے ہی پہنچی تو پتا چلا کہ خالہ گلشن اور چاچی سیمو کی لڑائی ہوئی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہو۔

میں نے بیگم صاحبہ کی ہاں میں ہاں ملائی مجبوری جو تھی اور کہا کہ جی بالکل لڑائی جھگڑا بری بات ہے۔''

کہنے لگیں ''ارے لڑائی کا افسوس نہیں، افسوس تو اس بات کا ہے میں دیر سے پہنچی۔ کبھی کبھی تو ایسا موقع ملتا ہے، وہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ ابھی اس بات کا دکھ کم نہیں ہوا تھا کہ میں ماسی مسرت کے گلے لگ کے رو رہی تھی فوتگی کے افسوس میں تو اچانک میری نظر ان کے ریشمی دوپٹے پر پڑی۔ بالکل وہی دوپٹہ تھا جو پچھلے ہفتے میں جمشید کی دکان سے ۴۰۰ میں لائی تھی۔ میں روتے روتے پوچھا ماسی یہ دوپٹہ کہاں سے لیا ہے، انہوں نے بھی روتے روتے جواب دیا کے جمشید کی دکان سے ۳۵۰ کا لائی ہوں۔ یہ سُن کے تو میرا رونا ہی بند ہو گیا۔ اُس کمبخت مارے نے مجھے ہی کیوں مہنگا دیا۔ مجھ سے اِس انتہائی دکھ کے عالم میں اور رویا نہیں گیا اور نکل پڑی سیدھی جمشید کی دکان کی طرف لیکن اُس کمبخت کی دکان بند تھی ورنہ آج وہ میرے ہاتھ سے نہ بچتا۔ پھر گھر آنے کے لیے رکشہ پر سوار ہوئی۔ راستے میں رکشہ والے نے کہا ''اماں جی کرایہ دے دیں۔'' میرا تو دماغ ہی آؤٹ ہو گیا۔ خوب سنائیں کمبخت مارے کو۔ میں نے کہا ''میں تمہیں اماں دِکھتی ہوں کیا بڈھا کھوسٹ کہیں کا اتنے میں گھر آ گیا۔۔۔ آپ یہاں بیٹھے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ ہر وقت اخبار میں گھسے رہتے ہیں، لگتا ہے، مجھ سے نہیں اخبار سے نکاح ہُوا ہے آپ کا۔۔۔ جائیں بچوں کو سکول سے لے کے آئیں اور آتے ہوئے کچھ لے آنا ہوٹل سے، میری طبیعت نہیں ٹھیک''

اس سے پہلے کہ کوئی چمچ کفگیر وغیرہ چلتا، میں نے منہ کو اٹھایا اور بچوں کو لینے چل پڑا۔

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اردو طنز و مزاح پر مبنی سہ ماہی برقی مجلہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی ۲۰۱۶ء تا ستمبر ۲۰۱۶ء